سہ ماہی

اردو ادب

ڈاکٹر خلیق انجم

ولادت: 22 جنوری 1933 — وفات: 18 اکتوبر 2016

سیرتِ فریدیہ

سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں
اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات

مصنف: سرسیّد احمد خاں —— مرتّب: خلیق انجم

'سیرتِ فریدیہ' سرسیّد احمد خاں کی ان تصانیف میں ہے جن کی طرف لوگوں کی توجّہ بہت کم ہوئی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ کتاب عام طور سے دستیاب نہیں اور دوسرے یہ کہ سرسیّد کی حیات، کارناموں اور خیالات کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کو اپنے نقطۂ نظر سے اس میں اپنے کام کا مواد زیادہ نہیں ملا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کے جس مطبوعہ نسخے کو تلاش کیا اس کا متن انھیں غیر اطمینان بخش لگا اور انھیں یہ بھی خیال ہوا کہ اس طرح کی کتاب پر مناسب اور تفصیلی حواشی کا ہونا لازمی تھا، جس کی طرف پہلے توجّہ نہیں دی گئی، چناں چہ خلیق صاحب نے 'سیرتِ فریدیہ' کا یہ اڈیشن بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ متن کے ساتھ جو ضروری حواشی خاطر خواہ دیے گئے ہیں ان کی بنا پر متن کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ 'سیرتِ فریدیہ' مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر سے بھی گزری تھی اور انھوں نے اسی نسخے پر خود حواشی بھی لکھے تھے، خلیق انجم صاحب نے ضمیمے کے طور پر مولانا آزاد کے ان حواشی کو بھی اس اڈیشن میں شامل کرلیا ہے۔ خلیق انجم صاحب کی مرتّب کی ہوئی کتاب 'سیرتِ فریدیہ' بلاشبہ ہمارے علمی ذخیرے میں ایک اہم اضافہ ہے —— (پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی)

ضخامت: 176 صفحات —— قیمت: 150 روپے

سہ ماہی

اردو ادب

مدیرِ اعلا

صدیق الرحمٰن قدوائی

مدیر

اطہر فاروقی

معاون مدیر

سرور الہدیٰ

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

مجلسِ مشاورت

• اسلم پرویز (صدر) • کیدار ناتھ سنگھ • شمیم حنفی • محمد ذاکر

مشترکہ شمارہ:41-240، جلد:61-60 (اکتوبر تا دسمبر 2016، جنوری تا مارچ 2017)

قیمت: فی شمارہ:75 روپے، سالانہ 300 روپے (انفرادی) اور اداروں کے لیے یہ زرِتعاون فی شمارہ 150 روپے اور سالانہ 600 روپے ہوگا

(Subscription Annual: Rs 300, Per issue: Rs 75)

غیر ممالک کے انفرادی خریداروں کے لیے یہ رقم 40 امریکن ڈالر فی شمارہ اور سالانہ 150 امریکی ڈالر ہوگی جب کہ اداروں کے لیے زرِتعاون کی رقم 50 ڈالر فی شمارہ اور 200 امریکی ڈالر سالانہ ہوگی

(غیر ممالک کے لیے ایک شمارے کی پوسٹیج اور پیکیجنگ پر تقریباً 500 روپے خرچ آتا ہے)

• 'اردو ادب' منگوانے کے لیے رقم ڈرافٹ یا منی آرڈر سے 'انجمن ترقی اردو (ہند)' کے نام ارسال کیجیے۔ یہ رقم بینک ٹرانسفر سے بھی روانہ کی جاسکتی ہے مگر اس کے بعد رقم بھیجنے والے حضرات کو خط یا ای میل کے ذریعے بینک ٹرانسفر اور رقم بھیجنے کے مقصد کی تفصیلات سے سرکولیشن انچارج کو ان کی ای میل آئی ڈی rahmaniamirulhasan@gmail.com پر مطلع کرنے کی زحمت کرنا ہوگی۔ بینک ٹرانسفر کے لیے متعلقہ تفصیلات یہ ہیں:

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), A/c No 0158201000018
IFSC: CNRB0000158, Canara Bank, D.D.U. Marg, New Delhi - 110002

تخلیقات روانہ کرنے یا ان کی اشاعت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے جناب اختر زماں صاحب سے ان کے سیل فون نمبر 0091-9212-439448 اور ای میل akhtarzaman.1967@gmail.com پر بھی رابطہ کیا جاسکتا ہے

مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

پرنٹر پبلشر : عبدالباری کمپوزنگ : عبدالرشید

سرکولیشن انچارج: امیر الحسن رحمانی (Cell Phone: 0091-9560-432993)

مطبوعہ : اصیلا آفسٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی-110002

پاکستان اور کینیڈا میں سہ ماہی 'اردو ادب' حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے:

• جنابِ صبا اکرام (پاکستان)
General Manager (Admn & HR) Conrpak Ltd.
Plot No. 11/26, Sector 20, Korangi Industrial Area,
Karachi, Pakistan, E-mail: sabaekram@hotmail.com
Cell Phone: 0092-3002-164282

• جنابِ بیدار بخت (کینیڈا)
21, Whiteleaf Crescent, Scarborough, Ontario,
Canada MIV 3G1, E-mail: bbakht@rogers.com

Printed and published by Abdul Bari on behalf of the Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002 and printed at the Asila Offset Printers, 1307-08, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-110002,
Editor: Dr Ather Farouqui, E-mail: farouqui@yahoo.com
E-mail:urduadabquarterly@gmail.com, Ph: 0091-11-23237722, 23237733

فہرست

اداریہ	صدیق الرحمٰن قدوائی	5
پہلا ورق	اطہر فاروقی	8
گوشۂ خلیق انجم		
میرے ابّا: ڈاکٹر خلیق انجم — چند یادیں	سیما انجم	16
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا	شمیم حنفی	18
میں اور شیطان	اسلم پرویز	20
خلیق انجم: انجمن کا آدمی	مجتبیٰ حسین	36
خلیق انجم: ایک فرد، ایک انجمن، ایک تحریک	عتیق اللہ	40
خلیق انجم: علم کی دولت چھوڑ کر گئے	رضا علی عابدی	47
ڈاکٹر خلیق انجم: کچھ یادیں کچھ باتیں	فاروق بخشی	51
ڈاکٹر خلیق انجم: چند ملاقاتیں	ٹی.آر.رینا	56
خلیق انجم: اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے	سرورالہدیٰ	64
خلیق انجم ایک معتبر محقق	چودھری شرف الدین	71
مطالعۂ سوداؔ اور خلیق انجم	محضر رضا	75
'غالب کے خطوط' اور خلیق انجم	ساجد ذکی فاطمی	79
خلیق انجم: خاکہ نگار اور محقق کی جنگ	ضیاء اللہ انور	85
خلیق انجمن	نثار احمد فاروقی	91
غالب کی تحریر کے بارے میں ایک نیا گوشہ	کمال احمد صدیقی	98
متنی تنقید اور خلیق انجم	عبدالمغنی	101
مرزا محمد رفیع سوداؔ اور خلیق انجم	جاوید رحمانی	107
خود نوشت سوانح		
نوشتہ بماند سیہ برسفید (قسطِ دوم)	ٹوم اولٹر	113
اردو زبان کے امتیازات	ظفر احمد صدیقی	122
ھندی ادب سے		
اورنگ زیب کی آخری رات (رام کمار ورما)	ترجمہ: شَیو یا ترپاٹھی	143
زندہ ادیبوں پر زندہ ادیبوں کی تحریریں		
قافلہ ساتھ اور سفر تنہا (سیّد محمد اشرف کے تازہ شاہکار 'آخری سواریاں' کا ایک جائزہ)	چودھری لیاقت علی	161
خصوصی گوشہ		
میرا عشقِ دراز–3 (خواجہ احمد عباس)	ڈاکٹر نریش	169
کتاب اور صاحبِ کتاب		
امیر اللّغات (مولّف: امیر احمد مینائی، مدوّن: ڈاکٹر رؤف پاریکھ)	مبصّر: جاوید احمد خورشید	190
کلکتہ میں اردو کے نادر ذخائر (معین الدین عقیل)	مبصّر: جاوید احمد خورشید	198
جنت جہنم اور دوسرے افسانے (اے.خیام)	مبصّر: صبا اکرام	205
بیانِ میر (احمد محفوظ)	مبصّر: احمد علی جوہر	208

گزارش

قلم کار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اور مضامین
سہ ماہی 'اردو ادب' کی ای میل آئی ڈی:
urduadabquarterly@gmail.com
پر ارسال کریں اور مضامین کی اشاعت سے متعلق معلومات کے لیے
جناب اختر زماں سے ان کے موبائل نمبر:0091-9868659985 اور
ای میل: akhtarzaman.1967@gmail.com پر رابطہ کریں
'اردو ادب' کے سرکولیشن سے متعلق معلومات کے لیے جناب امیر الحسن
(سرکولیشن انچارج) سے اُن کے موبائل نمبر:0091-9560432993
اور ای میل:rahmaniamirulhasan@gmail.com
پر رابطہ کریں
مندرجۂ بالا دونوں ہی حضرات سے موبائل پر رابطہ صرف دفتر
کے اوقات میں کریں تا کہ آپ کے حکم کی فوراً تعمیل ہو سکے
(ادارہ)

اداریہ

خلیق انجم بھی چلے گئے، جس دنیا میں ہم رہے، جن لوگوں کے ساتھ زندگی کے بہترین دن گزارے، ان میں سے ایک دن کسی کا اچانک نظروں سے اوجھل ہو جانا کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ برسوں ہم نے جو کچھ دیکھا اور سچ سمجھا اس کا ایک آن میں بے حقیقت ہو جانا اور ایک لمحے میں گزرنے والے حادثے کا ہمیشہ کے لیے ایک نہ بھولنے والی حقیقت بن جانا، یہ سب ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ خود پر اور اپنے اِردگرد کی ہر چیز پر یقین کر لینا مشکل نہ تھا۔ ہم اس مشکل سے گزرے بھی نہیں مگر اس یقین کا گمان میں جانا وہ تجربہ ہے جس سے ہوش وحواس آگاہ کر سکتے ہیں۔ بس اسے قبول کرنا اور اس کے ساتھ زندہ رہنا ہی اپنے اختیار میں ہے۔ اپنے سامنے کتنے دوستوں اور عزیزوں کو اُٹھتے دیکھا جن کے وجود کو ہم اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ وہ سب کچھ جو ہم نے ان سے پایا، ان کے ساتھ جھیلا وہی ہماری دنیا تھی۔ دنیا اچھی ہو یا بُری، جیسی بھی ہو وہ ہماری تھی۔ وقت کا تقاضا مگر یہ تھا کہ ہم اس سے دست بردار ہو جائیں۔

خلیق ہمارے لڑکپن کے ساتھی تھے۔ دلّی کی گلی کوچوں میں ساتھ ساتھ بڑے ہوئے، پڑھا لکھا، نوکری کی۔ بیوی بچوں کی خوشیاں دیکھیں اور سوچا کہ یہی سب کچھ ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اور ہم اسی میں مست و مگن رہے۔

دن گزرتے گئے اور خلیق انجم چلے گئے۔ جانتے تھے کہ یہ وقت سب پر آتا ہے۔ چناں چہ وہ آیا اور اب ہر بات گزرے ہوئے کل کی بات ہوگئی۔ اب کچھ یقین سا نہیں آتا کہ ہم بھی اس گزرے ہوئے لمحے کا حصہ ہیں اور معلوم نہیں کہ کب تک ہیں؟

خلیق اور ہم، ہم مشرب و ہم راز تھے۔ ہمارے دوستوں کا پورا حلقہ بھی ایسا ہی تھا مگر

سب ایک ہونے کے باوجود اپنی خصلتوں میں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ بھی تھے۔ سوچتا ہوں کہ خلیق میں اور مجھ میں کیا بات مشترک تھی جو ہم کو قریب لائی تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ بس ایک خلوص تھا جو مشترک تھا۔ اس کے علاوہ سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف۔ خلیق انجم باعمل اور مشقت پسند تھے۔ بچپن ہی سے انھوں نے زندہ رہنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو آزادیِ ہند کے وقت اور اس کے بعد بڑے ہونے والے نوجوانوں کو کرنا پڑا تھا۔ اور دہلی پر جو بپتا پڑی وہ یہاں کے رہنے والوں کے لیے عذاب سے کم نہ تھی۔ ملک تقسیم ہوا۔ خاندان بٹ گئے۔ جائدادیں ختم ہوئیں۔ سر پر ہاتھ رکھنے والے بزرگ نہ رہے۔ تعلیمی ادارے برباد ہوئے۔ پیٹ پالنے کے سہارے ختم ہو گئے۔ ایسے میں ایک ذہین اور محنتی لڑکا جس کے خاندان میں ماں بہنیں اور کچھ بزرگ تھے، کیا کرتا۔ خلیق میں ہمت تھی، لگن تھی۔ جامع مسجد کے پاس گلیوں میں کہیں بیٹھ کر بجلی کے پنکھوں کے پرزوں کی مرمت کرنا، کبھی ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر ضرورت مندوں کے خطوط اُن کی طرف سے لکھنا اور اسی طرح کے نہ جانے کیا کیا کام کرنا انھوں نے سیکھا۔ اس سے روزی روٹی کا سہارا ہوا۔ پھر اسی کے درمیان اسکول میں داخلہ لیا۔ اور دھیرے دھیرے زمانے کی ضرورت کے مطابق بغیر کسی سرپرست کے بی.اے، ایم.اے، پی.ایچ.ڈی، سب ہی کچھ کر ڈالا۔ یونی ورسٹی اور حکومت کے محکموں میں ملازمتیں کیں اور اس کے ساتھ ادب کی دنیا سے دلچسپی ہوئی تو تحقیق و تنقید میں دن رات لگا دیے۔ برسوں پر پھیلا ہوا جینے کا یہ ڈھب جس شخص کے لیے ایک کھیل رہا وہ تھا خلیق احمد خاں جو خود ہی کسی دن خلیق انجم بن گیا۔ میں تو اُن کے ساتھ زیادہ تر مٹر گشتی کرنے والوں میں تھا۔ خلیق ہی کی طرح ہمارے ساتھ اسلم پرویز تھے۔ پورا پورا دن ساتھ گزرتا۔ اپنے اپنے کاموں میں بھی ہم سب مگن رہتے۔ زندگی خوش گوار تھی۔ ادبی اور علمی مجلسوں میں وقت گزارتے، چائے خانوں میں فرصت کے وقت خوش گپیاں کرتے مگر اسی بے فکری کے زمانے میں رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، شمیم حنفی جیسے دوست ملے اور قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد، محی الدین قادری زور، آل احمد سرور، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، سید سجاد ظہیر اور اس عہد کے تمام مشاہیر عالموں اور دانش وروں کے قدموں میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور پھر اپنے بس بھر لکھنے پڑھنے کی بدولت اپنے زمانے میں جانے پہچانے گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گہری وابستگی اور ہندستان کے دوسری علمی اور

ادبی اداروں سے تعلق رہا۔

خلیق انجم بے حد سرگرم، بہت جلد دوست بنا لینے والے لوگوں میں تھے۔ فقرے باز، ہنسی مذاق کے عادی، بے تکلف محفلوں میں اپنی حسِ مزاح کی بدولت چھا جانے والے بڑوں چھوٹوں میں مقبول تھے۔ ان کے دم سے دہلی کی محفلوں میں رونق تھی۔ اس کے ساتھ علمی مشقت اور تعلیمی صلاحیتوں کی بدولت انجمن ترقی اردو (ہند) کو دہلی میں مستقل حیثیت دی۔ اردو گھر جیسی شاندار عمارت کو تعمیر کرنا اور سارے ملک اور بیرونِ ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے ایک رابطہ قائم رکھنا یہ سب کچھ محدود وسائل کے ساتھ صرف خلیق انجم ہی کر سکتے تھے۔ لڑائیاں بھی لڑے، مگر دنیا میں سر جھکا کر کبھی نہیں چلے۔ اُن کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کی بنا پر ہندو پاکستان اور یورپ کے اردو جاننے والوں میں ان کی بڑی قدر ہے۔ دہلی کی تاریخی عمارتوں پر، غالب کی زندگی اور فن پر خصوصاً ان کے سفرِ کلکتہ پر خلیق کی یادگار تحقیقی کتابیں ہیں۔

خلیق انجم کو دور سے دیکھیے یا قریب سے یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ہی شخص تھا۔ بہر حال اب وہ ہم میں نہیں اور یہ یقین کرنا آسان نہیں کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں مگر ہمیں تو یہ فخر حاصل رہا اور اب ہماری زندگی سے بھی بہت کچھ کم ہو گیا۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

پہلا ورق

کسی دانش ور کا مشہور قول ہے کہ بڑے لوگ اقدار کے بارے میں سوچتے ہیں، دانشوری میں ان سے کم فہم کے حامل لوگ مسائل کے بارے میں اور جن کی دانشورانہ فہم بہت معمولی ہوتی ہے ان کی فکر اشخاص تک محدود رہتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم مرحوم نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جن لوگوں کے ساتھ گزارا ان میں مندرجۂ بالا تینوں ہی زمروں کے لوگ شامل تھے۔ اس نہایت بھاری پتھر کو کامیابی سے اٹھانے میں مگر خلیق انجم صاحب کی وہ ظرافت بے حد معاون ثابت ہوئی جس کا خمیر دہلوی تہذیب کے طویل اور نشیب و فراز سے بھرے سفر کا مرہونِ احسان تھا۔ خلیق صاحب دلّی والے تھے، ٹھیٹھ دلّی والے۔ اردو زبان و ادب کی حد تک ان کے ذہن کی تربیت میں دلّی کے ان اساتذہ کی صحبتوں کا فیصلہ کن رول تھا جو دلّی کے زوال آمادہ ادبی منظرنامے کو اپنے ہاتھوں پر ارض و سما ٹکائے رکھنے کی مثل کے مصداق اس کی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے مگر ادبی دلّی ایک بار پھر اجڑی اور ایسی اجڑی کہ اب اس کے مہتم بالشان ماضی کی جلوہ گری مستقبل قریب میں ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ دنیا بہرحال ممکنات کی ہے۔

خلیق صاحب کی پیدائش دلّی 6 میں ہوئی۔ وہ پانچ بہنوں کے اکیلے بھائی (ایک بہن کو ان کی والدہ نے گود لیا تھا) تھے۔ خلیق انجم کے سر سے والد کا سایہ جلد ہی اٹھ گیا یوں اپنی والدہ کے ساتھ مل کر انھوں نے گھر کی ذمے داری بہت ہی چھوٹی عمر میں سنبھالی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی اور بہنوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کا مشکل کام بھی کیا اور بی اے میں داخلہ لینے علی گڑھ پہنچ گئے جو اُس وقت نہایت مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ اپنے متنازعہ ماضی کو خیرباد کہنے کا مشکل ترین عمل اُس وقت علی گڑھ کی ترجیحِ اوّل تھا۔ یہ ان تمام نوجوانوں کی پناہ گاہ بھی تھی جن کے خانوادوں نے پاکستان نہ جانے کا شعوری فیصلہ کیا تھا، اس لیے، بالکل بے وسائل طلبہ و طالبات کے لیے

علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آتی تھی۔ اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں کا بھی خاصا بڑا حصہ ان طالبِ علموں کی مدد پر صرف کر دیتے تھے جن کے لیے علی گڑھ ان کے وجود کی بقا کا واحد سہارا تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی سوانح ''ورودِ مسعود'' میں لکھا ہے کہ تقسیم سے پہلے علی گڑھ مسلم لیگ کا سب سے مضبوط قلعہ تھا، اس لیے، بانیِ پاکستان اس دیار میں بار بار آتے اور اسے اپنے محفوظ اسلحہ خانے سے تعبیر کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد علی گڑھ میں ایسے لوگ خاصی بڑی تعداد میں تھے جو کسی مجبوری کے سبب پاکستان تو نہ جا سکے تھے مگر ان حضرات کا مسلم لیگی خون دیر تک کھولتا رہا۔ نظریۂ پاکستان اور جناح صاحب کے تاعمر غیر مشروط وفادار لوگوں میں ایک اہم نام یونیورسٹی میں برسرِ کار انگریزی کے استاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا تھا جن کا حال ہی میں 90 برس سے زیادہ کی عمر میں انتقال ہوا ہے۔ ایک پاکستان نواز طبقے کی موجودگی کے باوجود علی گڑھ کو اگر ہندستان میں زندہ رہنا تھا تو متوازن رویہ اختیار کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ ان نہایت حساس سیاسی حالات میں خلیق صاحب علی گڑھ میں بہ حیثیت طالبِ علم رہے مگر ان کا دلّی والا نہ صرف ان کی اپنی زندگی بلکہ یونیورسٹی کی زندگی کے اس تناؤ بھرے ماحول کو بھی اکثر قہقہوں سے بھر دیتا۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اپنے محدود وسائل کے سبب اپنی ایک بیٹی کی شادی کے موقعے پر تمام طلبہ کو مدعو نہ کر سکتے تھے، اس لیے، صرف مخصوص احباب کو ہی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ خلیق صاحب نے کسی طرح اس دعوت نامے کو حاصل کر کے بالکل ویسا ہی دعوت نامہ شائع کرا کر پوری یونیورسٹی میں اس طرح تقسیم کیا کہ طلبہ نے اسے شیخ الجامعہ کی طرف سے اعزاز تصور کر کے اپنی شیروانیاں استری کرنا شروع کر دیں۔ انتظامیہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کا طریقہ کیا ہو؟ ذاکر صاحب کو مگر تضادات اور طوفانوں سے خوش گوار انداز میں نبرد آزما ہونے کا ہنر آتا تھا یوں بات بگڑی تو نہیں مگر ظاہر ہے طلبہ کو ضیافت میں شریک ہونے کا شرف بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ تصدیق ہو جانے کے باوجود کہ یہ دعوت نامے کس نے شائع اور تقسیم کرائے ہیں، خلیق انجم صاحب کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

اسی طرح ایک بار خواجہ غلام السیدین صاحب کی علی گڑھ آمد کے موقعے پر ان کے میزبان کے گھر سے ان کی کار میں دیر رات شروع کی گئی سواری علی الصبح تک جاری رہی اور اختتامِ سفر پر کار کو یونیورسٹی کے کسی حصے میں چھوڑ کر خلیق صاحب نے خشوع و خضوع کے ساتھ فجر کی نماز کار میں

اپنے ہم سفر احباب کے ساتھ پڑھی اور اپنے رب سے معافی کے طلب گار ہو کر اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئے۔ اس واقعے کے بعد بھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ کاش علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شیخ الجامعہ کو چارج لینے سے پہلے ان بزرگوں کی زندگیوں سے واقف کرایا جائے جو انتظامی امور میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور تقسیم کے بعد جیسے نہایت سخت حالات میں بھی چھوٹوں سے ہمدردی اور شفقت ہی ان کی انتظامی کامیابی کے اسمِ اعظم کے عناصر میں جزوِ لازم کی حیثیت کے حامل تھے۔

دہلی آنے کے بعد خواجہ احمد فاروقی کو خلیق انجم صاحب نے پیر و مرشد کی حیثیت دی جن سے ان کی عقیدت ماضی کی بہت سی تلخیوں کے باوجود فاروقی صاحب کے انتقال تک قائم رہی۔ فاروقی صاحب مرحوم اُس وقت دہلی کی اس ادبی دنیا— جس کا تعلق دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور ملحقہ کالجوں میں اردو کی تدریس سے تھا— کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بہ وجوہ فاروقی صاحب مرحوم کی اہلیہ کو خلیق صاحب سے کد ہو گئی یوں دہلی یونیورسٹی میں ان کا تقرر ناممکن معلوم ہونے لگا مگر خلیق انجم تو خلیق انجم تھے۔ انھوں نے کروڑی مل کالج کے اُس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ کو ایسا شیشے میں اتارا کہ سنگھ صاحب نے فاروقی صاحب کو خلیق صاحب ہی کے ذریعے یہ پیغام بھجوایا کہ فاروقی صاحب بساط بھر کوشش کر لیں مگر تقرر خلیق انجم ہی کا ہوگا۔ اس پیغام کو فاروقی صاحب کے سامنے دہرانے کے لیے جس جرأت اور ڈرامائیت کی ضرورت تھی، وہ بھی صرف خلیق صاحب ہی کے بوتے کی بات تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ خلیق انجم صاحب کے مقابلے میں لیکچرر شپ کی امیدوار رضیہ سجاد ظہیر تھیں جن کے پیچھے کمیونسٹ پارٹی اور نہرو خاندان کی حمایت تھی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ دراصل چودھری چرن سنگھ کے ہم زلف تھے جو شمالی ہند کے نہایت طاقت ور لیڈر تھے اور بعد میں ملک کے وزیرِ اعظم بھی بنے۔ خود سروپ سنگھ بھی بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور اُن کے دور میں ہی حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ فاروقی صاحب نے ہمیشہ کے لیے شعبۂ اردو آنا بند کر دیا!

خلیق انجم صاحب کا اگلا پڑاؤ گجرال کمیٹی تھی جس کی ایجوکیشن سب کمیٹی کے وہ جوائنٹ کنوینر (Joint Convener) کے طور پر وابستہ ہوئے— نہ کہ ڈائرکٹر جیسا کہ عام خیال ہے— اور ان عمائدین کے رابطے میں آئے جو نہایت اعلا مناصب پر فائز رہ چکے تھے اور جن کی رسائی براہِ راست وزیرِ اعظم اندرا گاندھی تک تھی۔ ایک ایسے طالبِ علم کے طور پر جس نے آزادی کے بعد ہندستان میں اردو زبان اور تعلیم کی صورتِ حال کا ممکن حد تک جائزہ لیا ہے اور اسی موضوع پر

جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا، میری ذاتی رائے گجرال کمیٹی اور اردو کے نام پر اردو داں طبقے کو کئی دہائیوں تک بے وقوف بنانے والے اندر کمار گجرال کے بارے میں نہایت ہی خراب ہے، اس لیے، یہاں گجرال کمیٹی پر بحث سے اجتناب کرتے ہوئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ جب گجرال صاحب ہندستان کے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے خود اپنی ہی ترتیب دی ہوئی ان سفارشات کو بھی— جن میں سے اکثر بے معنی تھیں— کے نفاذ کی خانہ پُری کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

گجرال کمیٹی سے جو اکابرین وابستہ تھے، ان میں سے کچھ انجمن ترقی اردو (ہند) کے مستقبل کے لیے بھی فکر مند تھے جو آزادی کے بعد علی گڑھ میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ذیلی شعبے کی سی حیثیت سے پناہ گزیں تھی اور شعبۂ اردو کا سربراہ جو اُس زمانے میں نوکری کے اختتام تک صدرِ شعبۂ اردو کے منصب پر فائز رہتا تھا، انجمن کو بھی اپنی ریاست کے ایک گانو سے تعبیر کرتا تھا، اس لیے، انجمن اس زمین پر اپنی عمارت نہ بنا سکی جو نئی دہلی میں اسے اولاً الاٹ ہوئی تھی اور جس پر اب سپرو ہاؤس کی عمارت منڈی ہاؤس میں موجود ہے۔ تقسیم سے پہلے انجمن نے زمین کا ایک بڑا قطعہ کرزن روڈ (موجودہ کستور با گاندھی مارگ، کناٹ پلیس) پر بھی خریدا تھا، اس کے کاغذات بھی علی گڑھ میں خورد برد ہو گئے تھے۔ بازار کی موجودہ قیمتوں کے مطابق آج یہ زمین سینکڑوں کروڑ کی مالیت کی ہوگی۔ راؤز ایونیو کی زمین سپرو ہاؤس ہی کی زمین کے بدلے میں انجمن کو الاٹ ہوئی تھی اور برسوں سے اپنی عمارت کی منتظر تھی۔ شنبہ 23 مارچ 1968 کو اندرا گاندھی کے ہاتھوں اردو گھر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد بنیادی ڈھانچہ تو تیار ہو گیا تھا مگر تعمیر کے کام میں تقریباً 8 برسوں تک کوئی پیش رفت نہ ہو سکنے کے سبب یہ آثارِ قدیمہ کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ ایسے میں لوگوں کو خلیق انجم صاحب کا خیال آیا اور انھوں نے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد دہلی کے عمائدین خصوصاً کرنل بشیر حسین زیدی کی مدد سے اردو گھر کی تعمیر چند ہی برس میں مکمل کرا دی جس کا افتتاح اُس وقت کے وزیرِ اعظم مرار جی ڈیسائی نے یکم نومبر 1977 کو کیا۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے قریب تھے۔ اردو گھر کے قیام کے لیے انھوں نے اولاً مسلم صنعت کاروں سے تعاون کی امیدیں وابستہ کی تھیں مگر ان سے بری طرح مایوس ہونے کے بعد انھوں نے اندرا گاندھی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا اور ایک ہی ملاقات میں اندرا گاندھی نے مسئلے کو اس طرح حل کر دیا کہ انھوں نے اپنے سکریٹری کو کرنل زیدی کے سامنے ہی حکم دیا کہ وہ کینرا بینک کے چیئرمین— جو اسی روز اندرا گاندھی سے ملے تھے— سے کہے کہ بینک اردو گھر

کی عمارت کی تعمیر کے لیے فنڈ فراہم کرادے جس کے بدلے میں اردو گھر کا ایک فلورا سے کرایے پر مل جائے گا اور بینک کا کرایہ قرض کی رقم سے منہا ہوتا رہے گا۔ یہ بینک ابھی تک اردو گھر کے گراؤنڈ فلور پر واقع ہے۔

دہلی اور نئی دہلی کے سنگم پر واقع اردو گھر نے 1977 میں کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ وقت تھا جب ملک میں یو پی اردو اکادمی (قیام 1971) کے علاوہ اردو کا کوئی سرکاری ادارہ نہ تھا۔ ترقی اردو بورڈ کی نہایت مایوس کن کارکردگی کی وجہ سے اس کی جگہ ایک نئے ادارے کے قیام کے لیے انجمن نے کوشش کی اور ترقی اردو بیورو کے نام سے مرکزی حکومت کی وزارتِ تعلیم نے ایک دوسرا ادارہ قائم کیا تھا مگر وہ بھی سسک رہا تھا، اس لیے، کچھ برس بعد اس سفید ہاتھی کو بھی سپردِ خاک کر کے انجمن ترقی اردو (ہند) کی کوششوں سے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان وجود میں آئی۔ ایسے میں اردو گھر ملک کی اردو آبادی کی تمناؤں کے محور میں تبدیل ہو گیا۔ انجمن نے ہر صوبے میں اردو اکادمیوں اور قومی سطح کی اردو یونیورسٹی کے قیام کی کامیاب تحریک شروع کی۔ دونوں خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے۔ آٹھویں دہائی کے آخر تک حکومتِ ہند اردو کے لیے کیے جانے والے ہر کام میں انجمن سے مشورہ کرتی تھی اور اربابِ انجمن کی رائے فیصلہ کُن ہوتی۔ تقریباً 25 برسوں تک خلیق انجم مرحوم اردو دنیا کی سب سے اہم شخصیت تھے۔

پھر حالات تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ 1989 میں ریزرویشن کا دائرہ وسیع کر کے دیگر پس ماندہ ذاتوں (OBCs) کو وزیرِ اعظم وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ذریعے ریزرویشن کے دائرے میں شامل کر لینے کے بعد اردو عملاً کسی کا مسئلہ نہ رہی۔ اردو کے سرکاری ادارے وسائل سے مالا مال قطعاً بے مصرف سمینار کرانے اور ان کے عہدے دار 'من ترا حاجی بگویم تو مرا ملّا بگو' میں مصروف ہو گئے اور اردو تحریک کی بنیادی غلطی یعنی حکومت کی مدد سے اردو کے تحفظ کی منطق نے سرکاری اردو اداروں ہی کے ذریعے اردو تحریک کو ہی تباہ کر دیا جو انجمن کے وجود کی اساس تھی۔ تقسیم کے بعد اردو والوں نے حکومت سے ہر چیز کا مطالبہ کیا، نہیں کیا تو دل سے اردو کو اسکول کے نظامِ تعلیم میں شامل کرنے کا، جس کے نتائج سے اردو لیڈر شپ واقعتاً بے بہرہ تھی۔ صورتِ حال آج بھی بہت تبدیل نہیں ہوئی ہے۔

انجمن میں آنے کے بعد خلیق انجم صاحب کو علمی کام کرنے کے ہر ممکن مواقع میسر آئے۔ ہر طرح کے وسائل موجود تھے۔ قدیم مخطوطات کے نایاب ذخیرے سے لے کر جدید کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری، علمی معاونین کے طور پر کام کرنے والے رفقا کی معاونت نے انھیں اردو کا

مایۂ ناز محقق بنادیا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی شرکت کو دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں بھی قابلِ ذکر اردو آبادی ہے، ہر جلسے یا سمینار میں فخر کی بات تصور کیا جاتا۔ پاکستان میں خصوصاً انھیں نہایت احترام سے بڑے سے بڑے جلسوں اور سمیناروں میں مدعو کیا جانا تو عام بات تھی۔ ان کے انتقال پر پاکستان میں انگریزی روزنامے Dawn میں پروفیسر رؤف پاریکھ نے چھے کالمی تعزیتی کالم لکھا۔

خلیق انجم صاحب کی تقریباً 65 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تاریخِ پیدائش میں پروفیسر رؤف پاریکھ کے مطابق اختلاف ہے۔ پاریکھ صاحب نے اسی لیے دو تاریخیں 22 جنوری 1933 (بہ حوالہ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب عبداللطیف اعظمی) اور 22 دسمبر 1935 (بہ حوالہ جناب مالک رام) نقل کی ہیں۔

خلیق انجم صاحب بنیادی طور پر محقق تھے۔ ان کی تحقیق کو غالب اور غالب کے خطوط، دہلی اور دہلی کے آثار اور متنی تنقید اور اس کے متعلقات جیسے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی زندگی اور غالب کے خطوط سے متعلق تحقیق میں اپنی علمی زندگی کا قابلِ ذکر حصہ صرف کیا اور غالب کے خطوط سے ہی غالب شناس کے طور پر ان کی شناخت قائم ہوئی۔ غالب کے خطوط کو یکجا کر کے پوری صحت کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ مولوی مہیش پرشاد مرحوم کا تھا۔ وہ 1941 میں اس کی پہلی جلد شائع بھی کر چکے تھے اور دوسری جلد پر کام کر ہی رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ مولوی غلام رسول مہر مرحوم نے بھی 1951 میں خطوطِ غالب کی دو جلدیں شائع کیں مگر یہ جلدیں چوں کہ رواروی میں شائع کی گئی تھیں، اس لیے، ان کا متن قابلِ اعتبار نہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے بھی 'مکاتیبِ غالب' میں انتہائی سائنٹفک انداز سے غالبؔ کے خطوط کو پیش کیا مگر اس مجموعے کے زیادہ تر خطوط اس اعتبار سے غیر اہم ہیں کہ ان کی اکثریت سو روپے ماہوار کی رسید کی شکل میں لکھے گئے رقعات پر مبنی ہے۔ خلیق انجم کی کتاب 'غالب کے خطوط' کی پہلی جلد 1984 میں شائع ہوئی۔ اس میں پہلی مرتبہ غالب کے خطوط کو پوری صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور غالب کے خطوط کی اہمیت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ 'غالب کے خطوط' جلد اوّل کا مقدمہ تقریباً سوا دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں بیس پچیس صفحات متن کی تصحیح و ترتیب کی تفصیلات سے متعلق ہیں اور بقیہ صفحات میں خطوطِ غالب کے مطبوعہ مجموعوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور غالبؔ کے اردو املا کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد غالبؔ کے خطوط کا متن ہے۔ انھوں نے غالبؔ کے خطوط کے سلسلے میں لکھا ہے:

''غالبؔ کے خطوط کی نثر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرزِ فکر و احساس [بھی] ہے جو موجِ تہ نشیں کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں غالبؔ کی خلاّقانہ صلاحیت اور نثر سے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ صنّاعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگارنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوطِ غالب اس عہد کے ہندستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی، تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردِّعمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں، شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔ غرض کہ انسان کی روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل کی گونج بھرپور طریقے پر اردو نثر میں پہلی بار خطوطِ غالب ہی میں سنائی دیتی ہے''۔ (غالب کے خطوط، ص41-140)

غالب خطوط سے خلیق انجم کی دل چسپی کا آغاز بہ ظاہر تو غالب صدی تقریبات (1969) کے موقعے پر شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کے سیلاب سے ہوا مگر اس کا اصل محرک خلیق انجم صاحب کی دہلی اور دہلوی تہذیب میں غیر معمولی دل چسپی کو اس لیے قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان خطوط میں دہلی کی آپ بیتی تمام تر جزئیات کے ساتھ محفوظ ہے۔ خلیق انجم خود دہلوی تہذیب کے آخری بڑے نمائندے کہے جاسکتے ہیں۔ اس طرح خطوطِ غالب میں ان کی دل چسپی کو خود اپنی تلاش کا سفر بھی کہہ سکتے ہیں۔

خلیق انجم صاحب نے خاکے بھی لکھے اور بہت عمدہ خاکے لکھے خصوصاً رسا دہلوی پر ان کا خاکہ تو اردو کا لاجواب خاکہ ہے۔ یہ بھی دہلی اور دہلی کی تہذیب سے ان کی گہری وابستگی کا ہی نتیجہ ہے۔ غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ بھی خلیق انجم کا ایک اہم کام ہے۔ اس موضوع پر ان سے پہلے قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں اور حنیف نقوی وغیرہ کی تحریریں ملتی ہیں لیکن خلیق انجم صاحب نے اس واقعے کی، جس کا گہرا اثر غالبؔ کی زندگی پر پڑا، کی معنویت کو جس تناظر میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اسے ایک غیر معمولی ادبی کارنامے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

خلیق انجم صاحب کی کتاب 'متنی تنقید' جو 1967 میں شائع ہوئی تھی، بھی بہت اہم ہے۔ کئی دہوں تک ریسرچ اسکالرز کے لیے ایک ضروری گائڈ کے طور پر کام کرنے والی کوئی باقاعدہ کتاب

اردو میں نہیں تھی۔ یہ کتاب انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کے ایما پر مرتّب کی جو اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب بھی تھی۔ اصولِ تحقیق وتدوینِ متن پر اس وقت موجود انگریزی کتابیں جس کا ماخذ تھیں اور کتاب کا بڑا حصہ خصوصاً انگریزی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن 2006 میں شائع ہوا۔ یہ ہندو پاک کی بہت سی یونی ورسٹیوں میں شاملِ نصاب ہے۔

خلیق انجم صاحب نے سرسیّد احمد خاں کی 'آثارالصنادید' کو بھی ایڈٹ کیا۔ کچھ روز بعد انھوں نے 'سیرتِ فریدیہ' کی ایڈٹنگ بھی کی۔ 'آثارالصنادید' سے تو ہر شخص واقف ہے، 'سیرتِ فریدیہ' کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات پر مبنی ہے۔ یہ خلیق انجم مرحوم کی غالباً آخری کتاب بھی ہے جس کا انتساب انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام کیا ہے۔ غرض یہ کہ اپنے مادرِ علمی کا قرض کسی حد تک ادا کر کے انھوں نے قلم رکھ دیا۔

خلیق صاحب کی بہنوں میں سے تین حیات ہیں جن میں سے دو امریکہ میں اور ایک دہلی میں مقیم ہیں۔ دہلی میں مقیم ان کی بہن ثریا صاحبہ کی شادی استادِ محترم ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب سے ہوئی ہے۔ خلیق انجم صاحب کی دو اولادوں میں ایک بیٹی سیما انجم اور بیٹا ثمر انجم، دونوں ہی شادی شدہ ہیں۔ سیما صاحبہ دہلی میں رہتی ہیں اور دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ میں انگریزی کی استاد ہیں۔ بیٹا ثمر انجم کینیڈا کے کسی شہر میں مقیم اور بینک میں ملازم ہے۔ خلیق انجم صاحب نے موہنی انجم صاحبہ سے 5 نومبر 1968 کو شادی کی تھی۔ شادی کے وقت موہنی صاحبہ دہلی اسکول آف اکنومکس میں استاد تھیں۔ وہ سوسیولوجسٹ ہیں جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سماجیات کے شعبے سے سینئر پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہوئیں اور کئی مرتبہ جامعہ کی قائم مقام وائس چانسلر بھی رہیں۔

2012 میں اپنی خرابیِ صحت کی وجہ سے انجمن سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد خلیق صاحب مختلف بیماریوں سے الجھتے رہے مگر ہمت نہ چھوڑی اور نہ ہی ان کی ظرافت میں کوئی کمی آئی۔ انتقال کے بعد ڈاکٹروں نے تاکید کی تھی کہ انھیں جلد سے جلد دفنا دیا جائے، اس لیے، اربابِ انجمن کی تمام تر خواہش کے باوجود ان کا جسدِ خاکی اردو گھر نہ لایا جا سکا اور جس روز (18 اکتوبر 2016 کو صبح ساڑھے دس بجے) ان کا انتقال — ان کی ساؤتھ دہلی میں واقع رہائش گاہ سریتا وہار میں — ہوا، اسی روز بعد نمازِ مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ □□

اطہر فاروقی

سیما انجم

میرے ابّا: ڈاکٹر خلیق انجم — چند یادیں

ہر لڑکی کی طرح میرے لیے بھی میرے ابّا میرے ہیرو تھے۔ وہ کوئی سوپر مین نہیں تھے، لیکن ایک شخص میں اتنی ساری صلاحیتیں ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ ایک ذمے دار شوہر، آئیڈیل والد، مشفق استاد اور دانشور تھے۔

میں نے بچپن سے اُنھیں ہمیشہ صبح پانچ بجے سے اپنی میز پہ کام کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک وقت پر کئی پروجیکٹس پر ایک ساتھ کام کرتے تھے اور اگر دس منٹ بھی ہوں تو وہ اپنی میز پہ بیٹھ کر کچھ لکھنے لگتے تھے، گویا کہ ایک منٹ بھی برباد نہیں کرتے تھے۔ وہ جس سے بھی ملتے تھے ان کی سطح پر آ کر بات کرتے تھے اور ان سے ہمیشہ کچھ نیا سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چاہے وہ کوئی بچہ، جوان یا بوڑھا ہو، مالی، باورچی یا کوئی مزدور ہو۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کتنے بڑے دانشور ہیں۔

ابّا کی قدیم عمارتوں کے بارے میں بھی معلومات قابلِ تعریف تھی۔ ہر مہینے دو مہینے میں ہم پکنک منانے مہرولی کے نایاب اور نامعلوم قدیم عمارتوں پر جاتے تھے، جیسے کہ. جمالی کمالی، بھول بھلیاں وغیرہ ۔ابّا ہمیں ان کی تاریخ کے بارے میں بتاتے تھے۔ الگ الگ زاویوں سے وہ قدیم عمارتوں کی کمال کی تصویریں کھینچتے تھے۔

میرے بچپن میں ہمارے گھر پہ اکثر گول گپّے، کباب اور کلفی کی دعوتیں ہوتی تھیں۔ ابّا

پورے خاندان کو بلاتے تھے اور خود گول گپّے اور کباب تیار کرتے تھے۔ وہ ایک بالغ نظر شخص تھے، ہر چیز کی صحیح پکانے کی ترکیب پتا کرنے کے لیے گلی میں شادی کا کھانا پکاتے ہوئے باورچی، یا پھر گول گپّے والے کے پاس جا کے پوچھنے میں انھیں کوئی گریز نہیں ہوتا۔

ادب کی دنیا میں تو سب ان کے کام سے بہ خوبی واقف ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انھیں فوٹو گرافی، باغبانی، مغلئی کھانوں اور غزلوں میں بے انتہا دل چسپی تھی۔ بچپن میں ابّا مجھے اپنے پرانے سے اسکوٹر پہ بٹھا کر بیگم اختر کی غزلیں گنگناتے ہوئے اکثر گھمانے لے جاتے تھے۔

جو ابّا سے ایک دفعہ بھی ملتا وہ اُن کی سینس آف ہیومر کا قائل ہو جاتا تھا۔ اُن کی زبان اتنی عام بول چال اور بامحاورہ تھی، اور ان کے قصے سنانے کا انداز اتنا مزے دار تھا کہ سننے والے بہت متاثر ہو جاتے تھے۔

ان کے جیسے انسان لاکھوں میں ایک ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو اتنے مضبوط تھے کہ ہر چیلنج کا ہنس کے سامنا کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے بچپن کی محرومیوں اور بیوہ والدہ کی مشکلوں کو یاد کر کے بچوں کی طرح پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔

ابّا اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن مجھے ہر لمحہ ان کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ آج بھی اپنے مخصوص انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت دے رہے ہیں۔

❑❑

شمیم حنفی

یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

دیکھتے ہی دیکھتے دلّی کا حلیہ کتنا بدل گیا۔ مگر اس شہر کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں ویرانی کا ایسا احساس شاید پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اب سے پندرہ بیس برس پہلے تک اس شہر کے گلی کوچے واقعی اوراقِ مصوّر تھے۔ کیسی بھری پُری زندگی تھی: رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ!

کہنے کو ادبی جلسے، مذاکرے، مشاعرے آج بھی دلّی شہر کا روزمرہ ہیں۔ یہ شہر فاصلوں کا ہے۔ اس کے باوجود تھوڑے بہت لوگ ہر محفل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اخباروں میں خبریں، تصویریں چھپ جاتی ہیں اور اردو والوں کے حساب سے بھی دیکھا جائے تو بہ ظاہر یہی لگتا ہے کہ:

محفل تو تری سونی نہ ہوئی
کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے !

یوں بہارِ عالم کا رنگ تو خیر بدلتا ہی رہتا ہے۔

لیکن خلیق انجم کے چلے جانے سے کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ دلّی کو چپ سی لگ گئی ہے۔ کیسی باغ و بہار شخصیت تھی! دلّی والوں سے دلّی کی گلیاں، محلے بازار آج بھی خالی نہیں ہیں مگر ایسے دلّی والے جن سے دلّی کی محبت کا چرچا علمی، تعلیمی اور تہذیبی اداروں میں بھی عام ہو، اب خال خال نظر آتے ہیں۔ خلیق انجم کا شمار خواص میں ہوتا تھا، مگر ان کی طبیعت اس شہر کی عام اور عوامی زندگی سے بہت گہری مناسبت رکھتی تھی۔ وہ اس بستی کی رگ رگ سے واقف تھے۔ بہت دنوں تک وہ کلاں محل میں رہے۔ دنیا جہان سے آنے والے ان کے پرانے گھر میں مہمان ہوتے اور پرانی دلّی، جامع مسجد کے اطراف کی چہل پہل کا لطف اٹھاتے تھے۔ رضا علی عابدی نے خلیق انجم

کی رفاقت اور رہبری میں دلّی کی سیر کا کچھ حال بیان کیا ہے۔ اور خود خلیق انجم نے بھی تو اپنے آپ کو گویا دلّی کی معاشرت، تہذیب اور روایت کی توسیع اور تاریخ کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دلّی کی عمارتوں، دلّی والوں کے امتیازات، دلّی کی ادبی اور تہذیبی روداد انھوں نے اپنے ہم عصروں میں شاید سب سے زیادہ ذوق وشوق کے ساتھ بیان کی ہے اور اس دائرے میں دستاویزی حیثیت کا کام کیا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں اور مرزا محمد رفیع سودا سے لے کر استاد رسا دہلوی تک ان کی علمی سرگرمیوں نے ایک سلسلہ سا بنا لیا تھا جو کہیں اور کبھی ٹوٹا نہیں۔ ان کے اس انہماک اور سرگرمی کا اعتراف دنیا بھر میں کیا گیا، خاص طور پر ان کے مرتبہ 'آثار الصنادید' اور 'خطوطِ غالب' کے تو یکے بعد دیگرے کئی اڈیشن ہندستان پاکستان میں شائع ہوئے اور یہ لہر اس بےشوقی کے دور میں بھی ابھی جاری ہے۔

خلیق انجم کی محنت اور جاں کاہی کی سب سے جیتی جاگتی مثال دین دیال روڈ پر اردو گھر کی شاندار عمارت ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کی سلطان جہاں منزل کی پرانی تاریخی عمارت سے انجمن ترقی اردو کی خدمت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان دنوں ہم بھی علی گڑھ میں تھے اور خلیق انجم کو صبح سے شام مزدوروں کی طرح کام کرتے دیکھتے تھے۔ جس توجہ اور تن دہی کے ساتھ انھوں نے انجمن کے علمی ذخیرے، مخطوطوں اور دستاویزات کی حفاظت کی، انھیں دلّی منتقل کیا، پھر پرانی تاریخی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا، اس سے ان کی منصب شناسی اور اس تاریخ کے شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ رشید حسن خان کی زندگی کے اختتامی دور میں خلیق انجم نے ان کو کلاسکی ادب کے شہ پاروں کی تدوین پر جس طرح مائل کیا اور مصروف رکھا، وہ ایک کارنامے سے کم نہیں۔ انجمن کا اصل کام اردو کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو کے کم ہوتے ہوئے سرمائے کی حفاظت بھی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی سے لے کر قاضی عبدالغفار اور مولوی عبدالحق تک یہ روش بہت مستحکم رہی۔ تاریخی حیثیت اور کردار رکھنے والے علمی، تعلیمی اور تہذیبی ادارے، درس گاہیں اور مراکز اپنی اسی روایت شناسی سے پہچانے جاتے ہیں اور اپنے حال میں زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی کو زندہ رکھنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں، وہ قصۂ جدید وقدیم کے پھیر میں نہیں پڑتے۔ خلیق انجم نے بساط بھر یہی سلسلہ برقرار رکھا اور وہ اس خدمت کے لیے بھی ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

قطع نظر اس قصّے کے، ان کی کھلی ڈلی، زندہ دل، بھرپور اور روشنیوں سے معمور شخصیت کے اٹھ جانے سے جو سناٹا پیدا ہو گیا ہے، اس کی تلافی کا کوئی امکان اپنے آس پاس تو نظر نہیں آتا:

خدا بخشے....۔ 28 نومبر 2016

اسلم پرویز

میں اور شیطاں

شیطان کا روایتی تصور تو یہی ہے کہ وہ ملعون ہے، مطعون ہے، خدا کی نافرمانی کرنے والا ہے اور انسان کو تمام برائیاں وہی سکھاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور آسمانوں سے آیا ہوا ہے۔ ہماری زمینی زندگی میں شیطان کے کچھ اور تصورات بھی ہیں، مثلاً معصوم بچے کی شرارت کو شیطانی اور ایسے بچے کو شیطان کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک شیطان، انسان کی اس زندگی کا شریک ہے جو 'درد و داغ و سوز و ساز و آرزو جستجو' سے عبارت ہے۔ پھر ہمارے معلّمینِ اخلاق نے بھی گناہ گار لوگوں کے اس رویے کی مذمت کی ہے جہاں وہ اپنے کارِ بد کے لیے شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطاں' کو بھی تھوڑا یاد کرتے چلیں:

میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جنت کی دیوار پہ چڑھ کر
جنت کے دل چسپ مناظر
نیارے نیارے پیارے پیارے
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
موٹی موٹی توندوں والے
لمبی لمبی داڑھی والے
خوف زدہ حوروں کے پیچھے
چٹکی بجاتے ناچتے گاتے

دوڑ رہے تھے بھاگ رہے تھے
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے

ہماری شعری روایت میں شاعر حق کا علمبردار ہے اور اپنا سلسلہ ابراہیم، منصور، سرمد اور سقراط سے ملاتا ہے اور بقولِ حافظ نمائشی زہد کو ریا کا مترادف قرار دیتا ہے: 'کہ حافظ توبہ از زہد و ریا کرد' اور جب راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطاں' میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک ساتھ 'مولوی کی جنت' کا مضحکہ اڑا رہے ہیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ راجا مہدی علی خاں کی رو سے زندگی کی اس تگاپوئے دمادم میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم رتبہ اور ہم پلہ ہیں — اپنے اپنے شخصی امتیاز کے ساتھ یعنی یہ کہ اگر کوئی مجھ سے میرے 'میں' کے تشخص پر سوال کرے تو میں جواب دوں گا: 'میں کہ خود اپنے ہی مذاق طرب آگیں کا شکار' جب کہ شیطان اسی سوال کے جواب میں کہے گا: 'میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بہ جُو'۔ یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ مجھ میں اور خلیق انجم میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں تب ہی تو ہم اتنا لمبا ساتھ نبھاتے چلے آرہے ہیں لیکن ان مشترک خصوصیات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئلہ اور پانی دونوں کی ایک مشترکہ خصوصیت بجلی پیدا کرنا ہے پھر بھی کوئلہ کوئلہ ہے اور پانی پانی۔ ہاں آپ مجھے اور خلیق انجم کو ایک ہی سکّے کے دو رخ کہہ سکتے ہیں اور سکّہ بھی دھات کی اکہری ٹکلی کا جس کی ایک ہی پرت ہوتی ہے جہاں دوسری پرت کے چھٹ کر علاحدہ ہوجانے کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ اس انجذاب و انضمام کے باوجود ایک ہی سکّے کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ہیڈ اور دوسرا ٹیل جس کے لیے تقسیم سے پہلے کی اردو میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والے سکّے کے تعلق سے میم حرف کی اصطلاح رائج تھی۔ میم سے مراد انگریز عورت یعنی ہیڈ اور حرف گویا ٹیل۔ اب وہ دنیا جس میں، میں اور خلیق انجم رہتے ہیں، یہ بات تو بخوبی جانتی ہی ہوگی کہ اس سکّے کا ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہیں اور ٹیل اسلم پرویز۔ اور اس بات کی تصدیق و توثیق خود میں اپنے ساتھ خلیق انجم کی اس سدا بہار اور پُر شفقت ہیکڑی سے کرسکتا ہوں جسے اسی ہیڈ اینڈ ٹیل کے ایک محاورے میں Head I win, tail you lose کہتے ہیں۔ شیطان کے زمینی تصور میں شیطان کی وہ ذہانت اور فطانت اور وہ قوتِ مقابلہ اور مجادلہ بھی ملحوظ ہے جسے اقبال جیسے شاعر نے خراج پیش کیا ہے اور جب میں اپنے ساتھ خلیق انجم کو شیطان کہہ رہا ہوں تو سیدھا سا مطلب یہی ہوا کہ اس ایک سکّے کا، جس کے ہم دونوں دو رُخ ہیں، ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہوئے، اس لیے کہ ذہانت اور فطانت یا بالفاظِ دیگر شیطنت کا تعلق تو سر

ہی سے ہے۔اب میری مشکل یہ ہے کہ اگر چہ میں اس سکّے کی ٹیل یعنی دم ہوں جس کے کہ خلیق انجم ہیڈ یعنی سر ہیں،لیکن اکثر لوگ مجھے بجائے اس سکّے کی دم کے خود خلیق انجم ہی کی دم سمجھتے رہے تا آں کہ میری شادی نہیں ہوگئی اور میں ہر شوہر مسکین کی طرح اپنی بیوی کی دم نہیں ہوگیا۔ خلیق انجم کی 'ہیکڑی' تو مجھ پر آج تک ہے لیکن اس ہیکڑی اور بیوی کی ہیکڑی میں فرق ہے۔خلیق انجم کی دھونس تو مجھ پر یہ ہے کہ بیٹا وہ کام تو میں تیرے اچھے سے کروا کے رہوں گا جس کام کے کرنے کے تو لائق ہے اور میری بیوی کا ٹھینگا یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ایسا کام جو خود ان کے بس کا نہیں، اس کام کو میرے بس کا تو ہونا ہی چاہیے۔اب چکّی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں برابر رگڑے کھا رہا ہوں۔پس یوں نہیں چکتا کہ سخت جان ہوں اور نکل کے باہر جاؤں تو کہاں کہ ان سے باہر سوائے ایک بے اماں خلا کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ 1948 کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں' جب میری اور خلیق انجم کی ملاقات ایک دوسرے سے ہوئی تھی۔1947 سے پہلے اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کی دلی شہر میں کئی شاخیں تھیں۔ایک شاخ دریا گنج میں پٹودی ہاؤس پر بھی تھی جہاں خلیق انجم پڑھتے تھے۔یہ اسکول کلاں محل سے قریب تھا جہاں خلیق انجم کا گھر تھا۔میں شروع ہی سے اجمیری دروازے والی مین برانچ میں تھا۔1947 کے فسادات میں سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔مارچ 1948 میں جب فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اجمیری دروازے پر مدرسہ غازی الدین میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول پھر سے شروع ہوا۔اب پوری دلی میں ایک ہی اینگلو عربک اسکول رہ گیا تھا۔چناں چہ اینگلو عربک کی تمام سابقہ شاخوں کے بچے کھچے طلبہ نے یہیں داخلہ لیا۔ایک روز انگریزی کی کلاس جاری تھی،مولانا زبیر قریشی جو کبھی سینٹ اسٹیفن کالج کے طالب علم رہے تھے،زور شور سے مینس فیلڈ کی گرامر سے Analysis کا سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک لڑکا شلوار قمیص میں ملبوس، پیروں میں چپل پہنے،سر پر بالوں کا گچھا بنائے،بغل میں کچھ کتابیں دبائے کلاس روم میں داخل ہوا۔بظاہر یہ نیو ایڈمیشن کیس تھا۔مولانا زبیر قریشی نے خلافِ عادت اس لڑکے سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔بعد میں اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ اس لڑکے سے ان کی عزیز داری تھی۔مولانا زبیر قریشی نے نو وارد کو ایک خالی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے Analysis کا سبق پھر وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے منقطع کیا تھا۔میرے برابر کی سیٹ پر عشرت نام کا ایک لڑکا بیٹھتا تھا۔یہ لڑکا اس سے پہلے پٹودی ہاؤس کی برانچ میں تھا۔عشرت نے اس لڑکے کے داخل ہوتے ہی کہا 'ابے یہ بھی یہاں آ گیا۔' میں نے پوچھا 'کون؟' وہ بولا 'یہی جو ابھی آیا ہے۔خلیق ہے اس

کا نام، 'بڑا حرامی ہے سالا۔' اس وقت اس لفظ حرامی کا استعمال نہ تو عشرت ہی نے سوچ سمجھ کر کیا تھا اور نہ میں ہی اس کے دور رس امکانات کا اندازہ لگانے کا اہل تھا۔ آج باون برس بعد جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں اس لفظ حرامی کے معنی یہ آ رہے ہیں کہ خلیق انجم دنیا میں صرف اپنی شرطوں پر جینے کے لیے پیدا ہوا ہے اور اس انداز سے جینے کے عذاب ثواب کا بھی وہ تنہا ہی حصے دار ہے۔ عام طور پر لوگ جب کسی کام کی طرف بڑھتے ہیں تو پہلے وہ یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ یہ کام کر بھی سکیں گے، اپنے آپ کو ناپتے تولتے ہیں۔ خلیق انجم کا مزاج یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، اسی کے ساتھ وہ ہاتھ کے ہاتھ اپنے اندر ایک عملی فراست کو جنم دیتا ہے اور پھر اس فراست کے اسپِ تازی کی راسیں کھینچتے ہوئے وہ اس آگ کے دریا کے پار اتر جاتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے عقل کو کہیں عشق کا آئینہ دکھلایا ہے، کہیں دل کا، کہیں جنوں کا اور کہیں خبر کا۔ خلیق انجم عقل کو عمل کا آئینہ دکھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خلیق انجم کارزارِ حیات میں عمل سے کتنا کام لیتے ہیں، یہ تو آپ کو ان کے مقربین میں سے کوئی بھی بتا سکتا ہے رہا یہ کہ انھیں عقل کی رہ نمائی کتنی حاصل ہے، یہ سوال خود انھی سے پوچھنے کا ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ محض عقل سے کام لینے والے زندگی میں زیادہ تر پھسڈی ہی ثابت ہوئے ہیں۔

ہاں تو میرے کلاس فیلو عشرت نے خلیق کے لیے لفظ حرامی کا جو استعمال کیا، اس کے تعلق سے میرے نزدیک کسی مخربِ اخلاق رویے کی عدمِ موجودگی کے باوجود کسی کو حرامی کہنے کی نفسیات یہی ہے کہ یہ شخص ہم سے آگے کیوں نکلا جا رہا ہے۔ گھپلا دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ یوں بھی حرامی ہیں اور ووں بھی حرامی اور وہ اپنے اس طرح کے حرامی پن کو اس طرح کے حرامی پن سے آلودہ کیے رکھتے ہیں لیکن جو حرامی پن خلیق انجم سے منسوب کیا جا سکتا ہے وہ انتہائی شفاف Transparent اور مستحسن قسم کا حرامی پن ہے اور جس عمر کے حوالے سے عشرت نے خلیق کے بارے میں یہ بات کہی وہ تو معصومیت کی وہ شرارت ہے جسے ہم شیطانی کہتے ہیں۔ خیر تو اگلے ہی روز اسکول میں جب تفریح کا گھنٹہ بجا تو میں معمول کے مطابق اپنے ایک دوست کے انتظار میں کینٹین کے سامنے جا کھڑا ہوا، ساتھ چائے پینے کے لیے۔ وہ دوست تو نہیں آئے البتہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے خلیق چلے آ رہے ہیں۔ مجھے ایک دم ان کے بارے میں عشرت کا دیا ہوا خطاب یاد آ گیا، اس لیے انھیں دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سراسیمہ سا ہونے کی تیاری میں لگ گیا۔ اتنے میں وہ قریب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ایک دم بے تکلفی برتتے ہوئے مجھ سے

دریافت کیا 'چائے پئیں گے؟' اور اسی کے ساتھ ہم چائے کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہم چائے کے ساتھ ایک دوسرے کے بارے میں باتیں پوچھتے رہے اور کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے گئے۔ چائے کا کپ ختم ہونے کے بعد خلیق نے جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور پہلے مجھے سگرٹ پیش کیا جو میں نے بلا تردد قبول کر لیا۔ میں نے مکمل اناڑی پن سے اور خلیق نے کمالِ مہارت سے اپنا اپنا سگرٹ جلایا۔ میں سگرٹ کا دھواں باہر کے باہر ہی چھوڑتا رہا اور وہ جلدی جلدی لمبے لمبے کش اندر کی طرف بھرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے اپنے اپنے سگرٹ کے ٹوٹے کینٹین کی بھٹی میں جھونکے اور چل دیے پھر کلاس کی طرف۔ آہستہ آہستہ ہم اسکول سے واپسی پر بھی ساتھ نکلنے لگے جہاں سے ہم اِدھر اُدھر گھومتے اپنے اپنے گھر پہنچتے۔ ایک روز ہم اسکول کے باہر اس گھاس کے میدان میں بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے جو اس زمانے میں شاجی کا تلاؤ (شاہ جی کا تالاب) کہلاتا تھا اور جہاں اب کملا مارکیٹ ہے۔ باتوں باتوں میں خلیق نے مجھ سے پوچھا 'آپ نے سگرٹ کیسے شروع کیا۔' میں نے کہا 'میں تو سگرٹ پیتا ہی نہیں، بس جب آپ پیش کرتے ہیں تو ایک آدھ اب پینے لگا ہوں۔' خلیق نے یہ سن کر میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگرٹ لے کر توڑ کر پھینک دیا اور کہا، 'نہیں پیتے تو مت پیجیے۔ یہ لت بہت بری ہے، لگ جائے تو پیچھا مشکل ہی سے چھوڑتی ہے۔'

انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ان میں تقدیر کو ماننے یا نہ ماننے سے قطع نظر ماحول، وراثت اور سرشت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس وقت میں اور خلیق انجم ایک دوسرے سے ملے، باوجود اس کے کہ اس وقت ہماری عمریں ہی کیا تھیں، خلیق کے والد کو گزرے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے پر میرے والدین حیات تھے۔ اس اعتبار سے خلیق کی حیثیت ایک آوارہ پنچھی کی سی تھی اور میری سنہری پنجرے کے قیدی کی سی۔ گویا خلیق نے 'جہنم کے آزاد شعلوں' کی لپیٹ میں جینا سیکھا اور میں نے 'غلامی کی جنت' میں پرورش پائی۔ چناں چہ خلیق نے شروع ہی سے اختر الایمان کے 'آوارہ منش آزاد سیلانی' لڑکے کی طرح زندگی کی رزم گاہ میں دوڑیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اس طرح خلیق نے مارک ٹوین کے ٹام سویر اور ہیکل بری فن کی طرح زندگی کے بہت سے ایڈونچرز کا مزا لڑکپن ہی کی عمر میں چکھ لیا تھا۔ میری شخصیت پر اس عہد کے اس روایتی باپ کا سایہ تھا جس کے پُر ہیبت ماڈل کو سامنے رکھ کر شاید ہماری زبان میں 'باپ رے باپ' کا محاورہ وجود میں آیا ہے۔ باپ کی بالواسطہ شفقت اور براہِ راست خشونت، کچی مٹی کے گھڑے جیسے میرے لڑکپن پر دباؤ ڈالنے والی ان کی صلابتِ ایثار، میرے

مستقبل کے تحفظ کی فکر میں میری شخصی آزادی کو مصلوب رکھنے کی ان کی سوجھ بوجھ، سونے کا نوالا کھلانے اور قہر کی نگاہ سے دیکھنے کا ان کا رویہ، کھیل کود کو مجھ پر اس طرح حرام کر دینے کا فتویٰ جیسے مسلمان پر سور کھانا، وضع قطع اور لباس کے معاملے میں خود میری پسند ناپسند پر اپنی پسند ناپسند کو ترجیح، گھر سے باہر نکلنے پر پہرے، یہ وہ خزانہ تھا جس سے گھر کی چہار دیواری میں میں مالا مال تھا۔ لیکن خلیق کی طرح بھرے بازار میں بالی عمریا کو سر اٹھا کر لیے چلنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں خلیق کا وجود تازہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کھڑکی کی طرح مجھ پر کھلا جس کے اس طرف اُن خوش گوار آوارگیوں کا بہارستان تھا جس میں شخصیت لالۂ خودرو کی طرح نشو ونما پاتی ہے۔ اس بہارستان میں خلیق جیسوں کی عملداری تھی اور ہم جیسے تو اس میں گھر سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بعد 1948 میں جب اینگلو عربک اسکول دوبارہ کھلا تو دو تین سال تک پڑھائی کی اتنی بری حالت رہی کہ بورڈ کے امتحانات میں فیل ہونے والوں کی شرح صد فیصد رہی۔ اس میں بڑا دخل ہم مسلمان بچوں کے لیے Higher mathematics کے اس مضمون کا تھا جو اس وقت لازمی تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک اسکول کے بیشتر لڑکوں نے اس زمانے میں دسویں کے امتحان کے بعد علی گڑھ کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ خلیق نے علی گڑھ چلنے کے لیے مجھے بھی اکسایا۔ مجھے یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا تھا، اس لیے کہ میرے والد تو گھر ہی سے نکلنے کی اجازت مشکل سے دیتے تھے کجا کہ دلی چھوڑ کر علی گڑھ چلے جانا۔ میں نے خلیق سے کہا، یار مجھے تو اس بارے میں اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن معاملہ اصل میں والد کے رعب سے زیادہ اس کمیونی کیشن گیپ کا تھا جس کے سبب میں والد سے خود ان کی قوتِ رعب سے بھی کہیں زیادہ مرعوب تھا۔ حالاں کہ معاملہ یہ تھا کہ تمام تر سختی کے باوجود میری اعلا تعلیم کے لیے ہمیشہ کوشاں اور فکر مند رہتے تھے۔ خلیق کے لیے یہی نکتے کی بات تھی۔ چناں چہ کیس یہ بنایا گیا کہ اس وقت دلی میں مسلمانوں کے لیے جو ناسازگار فضا ہے اس میں مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کے راستے بند ہیں اور اب علی گڑھ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیس کی وکالت کے لیے جناب اختر ہاشمی کو معہ ان کی ڈاڑھی، ٹوپی اور اچکن کے ساتھ لیا گیا اور تھوڑی ہی سی رد و کد کے بعد میرے حق میں یہ مقدمہ فیصل ہو گیا کہ والد صاحب مجھے علی گڑھ بھیج دیں گے یوں اور بھی کہ وہاں میں اکیلا نہیں ہوں گا، خلیق بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ اب علی گڑھ پہنچ کر تو ہم کو گویا ہوا لگ گئی۔ اب مجھ پر سرشاری کا کچھ وہی عالم تھا جو ابوخاں کی بکری

چاندنی پر رسی تڑا کر آزاد ہونے کے بعد طاری ہوا تھا اور یہاں ابوخاں کی رعایت بھی یوں خوب تھی کہ میرے والد بھی خاں صاحب تھے۔ میرے والد نے اگرچہ مجھے علی گڑھ اپنی مرضی ہی سے بھیجا تھا لیکن ان کے ذہن کے کسی گوشے میں کہیں نہ کہیں ویسی ہی پُر شفقت ناگواری بھی تھی جس سے ماں باپ کو بیٹی جدا کرتے ہوئے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس نفسیاتی گرہ کو ڈھیلا کرنے کے لیے وہ کبھی کبھی کوئی حیلہ لطیف سی سرزنش کا نکال لیا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں کے لیے انھوں نے خلیق کا نام چودھری خلیق الزماں رکھ چھوڑا تھا۔

خلیق نے دوستی کا ناتا جوڑتے ہی اپنی چھٹی حس کے ذریعے میرے بارے میں بہت سے فیصلے خود ہی کر لیے تھے۔ یعنی یہ کہ یہ شخص مخلص ہے، بھروسے کے قابل ہے، تابع دار ہونے کی حد تک وفادار ہے، صاف دل ہے اور یہ بھی کہ ایسا آدمی اندر سے انتہائی کم زور ہوتا ہے۔ وہ مروت کے دائمی مرض میں مبتلا ہوتا ہے، وہ خودمختار نہیں ہوسکتا، اس میں اخلاقی جرأت کی کمی ہوتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک ایسے جری سرپرست کا ہونا نہایت ضروری ہے جو اپنی مشکلات کی باڑ کاٹتے ہوئے اپنا رستہ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی راستہ دکھاتا چلے۔ لیکن جس طرح ریڑھے کے اڑیل ٹٹو کا مالک بیچ سڑک پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ٹٹو کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر لے چلنے کے بجائے چابک مار مار کر اسے بالآخر چلتا کرتا ہے اسی طرح خلیق بھی مجھے چلاتے رہے ہیں میری اپنی ہی ٹانگوں کے بل پر۔ یہ خلیق کا میری زندگی میں ایک اہم رول ہے۔ خیر تو ان کے اس سرپرستانہ رویے کے معنی ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے یہ طے پائے کہ یہ باس اور میں ان کا سب آرڈی نیٹ۔ اب ان تعلقات میں ایسے مقامات بھی آتے رہے ہیں جہاں وہ داستانوں کے بادشاہ اور میں ان کا وزیر با تدبیر ثابت ہوا ہوں مگر بادشاہ پھر بادشاہ ہے اور وزیر وزیر۔ چناں چہ کبھی کبھی وزیر کی تدبیر بھی بادشاہ ہی کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔

علی گڑھ میں ہم چار سال رہے۔ ہمارے علی گڑھ پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد شہر سے 'شمع' کی طرز کا ایک فلمی رسالہ 'جھلک' جاری ہوا۔ ایک انٹرمیڈیٹ فیل قسم کے طاہر صدیقی عرف طاہر علیگ اس کے ایڈیٹر تھے۔ خلیق نے رسالے میں چھپنے کے لیے کچھ بھیجا اور اڈیٹر کے نام لچھے دار قسم کا ایک خط بھی لکھا۔ جواب میں طاہر علیگ صاحب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور پھر ایک دن خود ہی ملاقات کے لیے ممتاز ہوسٹل چلے آئے اور اسی ملاقات میں یہ طے پا گیا کہ اگلے شمارے سے خلیق 'جھلک' کے ایڈیٹر ہوں گے۔ علی گڑھ جیسے چھوٹے سے شہر سے 'جھلک' جیسا نیم فلمی نیم ادبی پرچہ نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ آدھا پرچہ تو خود تصنیف کیجیے اور باقی آدھا چلتے ہوئے

فلمی پرچوں سے نقل کیجیے۔ اب یہ باس اور سب آرڈی نیٹ والا معاملہ جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، میرے اور خلیق کے درمیان ہمیشہ سے ایک طرح کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ رہا ہے، یہ کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ڈرائنگ روم میں دو اشخاص ایک ساتھ داخل ہوں اور اپنے حوصلے یا کم ہمتی، خود اعتمادی یا انکساری، رعونت یا بردباری کے مطابق بنا کسی ردو کد، بنا کسی کنفیوژن، بنا کسی تبادلۂ تکلفات، ان میں سے ایک زیادہ آرام دہ اور قدرے ممتاز اور دوسرا نسبتاً کم آرام دہ اور دورافتادہ نشست اختیار کر لے۔ علی گڑھ میں بی اے کے آخری سال میں چلتے چلتے ہم نے ایک دہلی کیفے بھی کھول ڈالا۔ یہ گولڈن آئیڈیا بھی خلیق انجم ہی کا تھا۔ یوں تو حقیقتاً یہ ہم دونوں کا مشترکہ وینچر تھا لیکن عملی طور پر فیصلے کرنے اور پالیسی بنانے کی مالکانہ قسم کی ترجیحات خلیق انجم کا حصہ تھیں اور انتظامی امور کی پیروی میری ذمے داری تھی۔ اس وینچر کا کیا انجام ہوا اس پہیلی کا حل آپ سوچیے، اتا پتا یہ ہے:

یہ لوگ کیوں مری عریانیوں پہ ہنستے ہیں
لباس پھونک کے میں خود کو تو بچا لایا

مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہوسٹل میں ہم دس گیارہ لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگوں میں ہاسٹل لائف کی پھونک کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی۔ Activity کرنا، پروکٹوریل قوانین کی خلاف ورزی کرنا ہمارا صبح و شام کا معمول تھا۔ اس گروپ کے دو سرغنے تھے، ایک میرٹھ کی نادر علی بلڈنگ کے کسی پولس آفیسر کے فرزند اعجاز اور دوسرے خلیق انجم۔ ہم نے شرارتوں کے میدان میں کئی تاریخی کارنامے انجام دیے، جن کے نتیجے میں کچھ کو یونیورسٹی سے ڈیبار ہونا پڑا، کچھ پر جرمانے ہوئے لیکن سزا سے صاف بچ نکلنے والوں میں جو لوگ شامل تھے، ان میں ایک خلیق انجم بھی تھے۔

علی گڑھ میں ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا، اس لیے ہم دونوں انجم اسلم ہی کے نام سے مشہور تھے۔ بعض لوگوں کو ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی، اس لیے کہ ہم دونوں کی مثال کسی چلتی ہوئی سائیکل کے ایسے دو پہیوں کی سی تھی جس کا اگلا پہیا سو میل فی گھنٹے اور پچھلا دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتا تھا، پھر بھی دونوں اس چلتی ہوئی سائیکل کا اٹوٹ انگ تھے۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے، یہ خلیق بڑا چلتا پرزہ ہے مگر اس کے ساتھ جو وہ گورا سا لڑکا رہتا ہے وہ بہت سیدھا ہے۔ مگر میں اس کامپلی مینٹ سے کچھ خوش نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ مجھے اس موقعے پر منٹو کی ایک کہانی کا وہ کردار یاد آجاتا تھا جو والنٹیر تھا اور جب ایک بار اس کی محبوبہ نے اس سے اس لفظ

والنٹیر کی وضاحت چاہتے ہوئے یہ پوچھا تھا کہ والنٹیر کسے کہتے ہیں تو اس نے برملا جواب دیا تھا 'الو کے پٹھے کو'۔

آج میں جہاں بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں، کبھی جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر خلیق کا وجود میری زندگی میں نہ ہوتا تو جانے میری زندگی کا رخ آج کیا ہوتا۔ یوں تو آدمی زندگی میں جو کچھ بنتا ہے اپنی ذاتی صلاحیتوں ہی کے بل پر بنتا ہے لیکن اس کے کچھ بھی بننے کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے ابتدائی زندگی میں کیسے ساتھی ملے، وہ کن لوگوں کے حلقۂ اثر میں رہا۔ خلیق انجم کے مزاج میں بلا کی سیمابیت ہے وہ ہمیشہ سے ایک بہت ہی Ambitious انسان رہے ہیں۔ ہر Ambitious انسان کی اپنے Ambitions پورا کرنے کی ایک Ethics ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ Ethics مجھ جیسے Unambitious انسان کی Ethics سے یقیناً مختلف ہوتی ہے لیکن Ambitious لوگوں میں اس Ethics کے ان کی اپنی اپنی اچھی یا بری فطرت کے مطابق الگ الگ درجات ہوتے ہیں۔

بے جا مروت، جرأتِ اخلاق کی کمی، شائستگی کی بلندیوں کو چھونے کی للک، اپنے حقوق کا گلا گھونٹنے کا رویہ، چوری چھپے محنت کرنے کی عادت، اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی نہ کہہ سکنے یا نہ کر سکنے کی کمی، یہ میری شخصیت کی وہ کمزوریاں رہی ہیں جو کسی شخص کو کہیں کا بھی نہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسا کیوں ہوا کہ میرے حصے میں کہیں کا بھی نہ رہنا نہیں آیا۔ اس کا جواب اگر صرف ایک لفظ میں پوچھیے تو یہ ہے کہ خلیق۔ اگر خدانخواستہ یہی مزاج جو میرا ہے خلیق کا بھی ہوتا تو 'ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے' والا مضمون ہو جاتا لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اگر ہوا تو یہ ہے کہ 'ہم تو تیرے ہیں صنم تم کو بھی لے تیریں گے'۔۔۔ خلیق انجم کی نظر ہمیشہ Accomplishment پر رہی ہے۔ ایسا آدمی بچھڑتا نہیں، اپنے نشانے کی طرف تیر کی سی تیزی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ میں اس کے برخلاف Perfectionism کے خواب زاروں کا سیلانی ہوں۔ ایسے آدمی کا ایک ایک قدم بھاری پڑتا ہے۔ وہ دو قدم آگے چلتا ہے تو دس قدم پیچھے پھسل پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں میری زندگی کو ایک ایسا آدمی چاہیے تھا جو مجھے وقتاً فوقتاً دوڑائے رکھے اور وہ آدمی خلیق انجم کی صورت میں وقت سے بہت پہلے مجھے مل گیا۔ دراصل ایک لکھنے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں نے اپنے آپ کو جتنا دریافت کیا ہے وہ خلیق انجم ہی کے توسط سے کیا ہے۔ اب اگر اس میدان میں میرا ابھی اپنا کوئی جوہر ہے جو ان تمام جواہر سے علاحدہ ہے جو خلیق انجم کی ذات سے مشخص ہیں تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔ اگر زمانے نے زمین کی قوتِ

کشش کو نیوٹن کے توسط سے دریافت کیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہی قوتِ کشش خود نیوٹن میں بھی ہو اور ایسا ہے بھی نہیں، اس کے باوجود نیوٹن کی عظمت اپنی جگہ برقرار ہے۔

اگر ہم دلّی چھوڑ کر علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ دہلی ہائر سیکنڈری بورڈ کی Higher Mathematics کے لازمی مضمون کی خلیج کو ہم کبھی پار نہ کر پاتے اور ہم پر یونیورسٹی ایجوکیشن کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے۔ مجھ کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڑھ لے جانے والے بھی خلیق ہی تھے۔ علی گڑھ سے واپس آ کر میں نے ہفت روزہ 'آئینہ' کی ملازمت اختیار کر لی اور خلیق انجم بجلی کے پرانے پنکھے بنانے کی فری لانسنگ میں لگ گئے۔ پر ایک روز یوں ہوا کہ دن کے گیارہ بجے خلیق میرے پاس 'آئینہ' کے دفتر میں آئے اور دفتر سے چھٹی دلا کے سیدھے دلی کالج پہنچے۔ میرے پوچھنے پر کہ آخر قصہ کیا ہے، بتایا کہ کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب سے بات کرنی ہے اُردو ایم اے میں داخلے کے لیے۔ بس یہیں سے ہماری زندگیوں کا رخ اس طرف مڑ گیا جہاں آج ہم ہیں۔

ہمارے ایم اے فائنل کے امتحانات قریب تھے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب میں امتحان اس سال نہیں دے سکا۔ خلیق کا ایم اے مجھ سے ایک سال پہلے مکمل ہو گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر سروپ سنگھ کروڑی مل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے۔ وہ کالج میں اردو کا شعبہ بحال کرنے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب سے رجوع کیا کہ وہ اپنے کالج کا کوئی ایسا ایم اے پاس طالب علم انھیں دیں جو دلی والا ہو اور بیگ صاحب اس کی لیاقت سے مطمئن ہوں۔ بیگ صاحب نے فوراً ہی خلیق انجم کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کی جانب روانہ کر دیا۔ خلیق انجم نے پہلے سال پارٹ ٹائم لیکچرر کی حیثیت سے پڑھایا اور اس ایک ہی سال میں نہ صرف پورے کالج میں اپنے لیے فضا ہموار کر لی بلکہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی۔ ایک سال بعد جب لکچرر کی پوسٹ کے فل ٹائم اور پرمانٹ ہونے کا موقع آیا تو ایک صاحب جو سینٹ اسٹیفن کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر تھے، وہ بھی میدان میں آ کودے اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاید یونیورسٹی کے صدر شعبہ بھی ان پر مہربان تھے۔ خلیق انجم نے ان خدشات کا اظہار ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ سے کیا اور بیگ صاحب کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ ٹھہرے کھرے جاٹ۔ انھوں نے خلیق سے کہا، 'دیکھو میں نے یہ پوسٹ صرف تمھارے لیے نکلوائی ہے اور میں نے تمہاری ایک سال کی کارکردگی میں یہ دیکھ لیا ہے کہ آگے چل کر کیمپس کے کالجوں میں اگر کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کو اپنا کوئی امتیاز قائم کرنا ہے تو وہ تم

جیسے آدمی کے یہاں رہتے ہی ہوسکتا ہے۔تم فکر نہ کرو، اگر صدرِ شعبہ نے کسی اور شخص کو کالج پر تھوپنے کی کوشش کی تو میں یہ پوسٹ ہی ختم کردوں گا لیکن اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے، صدرِ شعبہ کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کا عندیہ پتا چل گیا اور پھر وہی ہوا جو ڈاکٹر سروپ سنگھ چاہتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کو آسمانوں پر پہنچا دیا۔ شعبے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے جنھیں یہاں دہرانے کا محل نہیں۔

کروڑی مل کالج سے چل کر وزارتِ تعلیم میں گجرال کمیٹی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر پہنچے۔ یہاں ایک دل چسپ بات کا ذکر ضروری ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہوسٹل میں ہمارے ونگ کا بیرا بہادر نامی ایک بوڑھا شخص تھا۔ پاس ہی کے جمال پور گاؤں کا رہنے والا۔ وہ اسی زمانے سے خلیق انجم کو انجمن صاحب کہا کرتا تھا۔اس کی یہ پیش گوئی خلیق انجم کے حق میں پتھر کی لکیر بن گئی۔ چناں چہ آج وہ اُردو گھر میں اپنے پورے شان وشکوہ کے ساتھ انجمن صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ اردو گھر کی یہ بلند و بالا اور شان دار عمارت جو ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کی سرپرستی اور رہنمائی کے ساتھ خلیق انجم کی شخصیت کا وہ ڈائنامزم بھی شامل ہے جس کی تعریف کرنے والے، جس پر رشک کرنے والے اور جس سے جلنے والے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔

خلیق انجم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی سے روزگار کے وسائل کی تلاش میں کبھی جھوٹے وقار کو اپنے راستے کا پتھر نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر کام کو خواہ وہ اکا دکا نوعیت کا ہو یا کسی اور طرح کا اور کسی بھی سطح کا، اسے پوری Dignity of labour کے ساتھ کیا۔ ان کاموں میں ڈاک خانے کے باہر بیٹھ کر خط لکھنا، سرِ بازار دکان کے پٹرے پر بیٹھ کر بجلی کے پرانے پنکھوں کی مرمت کرنا، کروڑی مل کالج کی لکچرر شپ، گجرال کمیٹی کی ڈائرکٹر شپ جامعہ اردو کی وائس چانسلری اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی جنرل سکریٹری شپ یہ سبھی شامل ہیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے خلیق انجم کے اور اپنے تعلق سے Accomplishment اور Perfectionism کی بات کہی تھی۔ معاملہ یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ہی ساتھ بہت سارے کام کرنے ہوں، اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی کام کو لیے بیٹھا اس میں مینا کاری کرتا رہے۔ وہ مخالفتوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ صحیح کام کو ہر قیمت پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کوشاں رہتا ہے چاہے اس کے لیے کبھی کبھی غلط راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔

وہ ایک کام کی تکمیل کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر دم لینے کا بھی قائل نہیں ہوتا بلکہ پچھلے کام کی تکمیل سے پہلے ہی وہ کسی اگلے کام کو منصوبہ بنا کر اس کی ابتدا بھی کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی ایک نفسیات اور بن جاتی ہے۔ اس کے پاس دوسروں کی سننے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات کو احکام کی طرح صادر کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کو ان کی بات کہنے کا موقع کم ہی دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دوسروں کے پاس تو اپنی بات کہنے کا وقت ہی وقت ہے، لیکن اسے تو انجمن ترقی اردو (ہند) جیسی کُل ہند تنظیم کو چلانا ہے، اردو تحریک کے جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلنا ہے، شاعروں کے مزارات کی بازیافت کے لیے سپریم کورٹ میں وکیل کی جگہ خود کھڑے ہو کر مقدمے کی پیروی کرنی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں 'خطوطِ غالب' اور 'آثار الصنادید' کی تدوین جیسے علمی اور ادبی کارنامے بھی انجام دینے ہیں جو اسے آگے چل کر تاریخِ ادبِ اردو کا ایک حصہ بنانے والے ہیں۔ اس درجہ فعال شخصیت میں تھوڑا بہت عنصر خودسری کا شامل ہونا لازمی سی بات ہے۔ اس خودسری کو بعض لوگ چودھراہٹ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کام کے راستے میں اڑنگے لگانے والوں کے ہجوم کے سروں پر سے چھلانگ لگانے کے لیے کبھی کبھی چودھراہٹ بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ صالح مقاصد کے حصول کے لیے چودھری بننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ Situational ethics کی رو سے تو بسا اوقات قتل کر گزرنا بھی مستحسن قرار پاجاتا ہے۔ چودھری کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے، وہ ان معاملات کی کوکھ سے ہی پیدا ہوتے ہیں جن معاملات کو چودھری چاہیے ہوتے ہیں۔ چودھری مرزا محمود بیگ، چودھری خواجہ احمد فاروقی، چودھری انور جمال قدوائی، چودھری سروپ سنگھ یہاں تک کہ چودھری خلیق انجم بھی ایسی ہی کچھ مثالیں ہیں۔ جب شاعر یہ کہتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تو اس شعر میں خرابی کا سیدھا سا اشارہ بظاہر برقِ خرمن ہی کی طرف ہے۔ لیکن کبھی کبھی خونِ گرم بھی تھوڑی بہت خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں 'تھوڑی بہت' کے لفظ پر اصرار کرتے ہوئے اس شعر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

میں جانتا ہوں کہ خلیق انجم ہائپرٹن شن کے مریض نہیں ہیں۔ میں یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تخریب پسند بھی نہیں۔ ان کے ہاں مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا نہیں اس پر

سبقت لے جانے کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ ہر محاذ پر مقابلے کے لیے ڈٹے رہنا ان کا مزاج ہے۔ نئے نئے مقابلوں کی تلاش ان کی زندگی کا مشغلہ ہے۔ ان کاموں کے لیے لہو گرم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے، اس لیے مخالفین کے ساتھ یہاں تک کہ دوستوں کے ساتھ بھی کبھی کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں چلتی رہنی چاہئیں۔ ایسی جھڑپوں میں مدِمقابل کو زچ کر دینے کے خلیق انجم کے پاس بہت سے پینترے ہیں۔ مثلاً کسی بحث کے آغاز ہی میں اپنی بات زور وشور سے کہی اور سامنے والے شخص کی جانب سے اس بات کا جواب آنے سے پہلے ہی بجلی کی سی تیزی سے گفتگو میں گریز کا پہلو نکال کر کوئی اور بات شروع کر دی یا اپنی بات کے جواب میں اگر دوسرے کی بات سنی بھی تو اس کے سامنے اس بات کو یہ کہتے ہوئے گویا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا 'اچھا چھوڑو یار کوئی اور بات کرو'۔

میرے ساتھ خلیق انجم کا معاملہ دنیا سے نرالا ہی ہے۔ وہ کوئی پروگرام، کوئی اسکیم، کوئی پروجیکٹ بنائیں اس کے لیے میرا نام ان کی سمجھ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ پھر ساتھ میں یہ بھی کہیں گے، یار تم کام دام تو کرتے نہیں اب تمہارا نام رکھا ہے تو مجھے رسوا نہ کر دینا۔ میرے کام نہ کرنے سے ان کی عزت آبرو اتنی جلدی خطرے میں پڑتی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس سمیناروں کے دعوت نامے آتے ہیں جن میں سے بعض لوگ شرکت کی منظوری بھیج دینے کے بعد بھی نہ سمینار کے لیے مقالہ لکھتے ہیں اور نہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور منتظمین بھی پہلے سے ان تمام باتوں کا حساب کتاب لگا کر چلتے ہیں کہ اتنے لوگوں کو دعوت نامہ بھیجا جائے گا، ان میں سے اتنے آ پائیں گے اور جتنے آ جاتے ہیں کبھی کبھی وہ بھی زیادہ ہی پڑ جاتے ہیں مگر یہ منتظمین بقول خلیق صاحب انھیں یہ کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں۔ دیکھیے خلیق صاحب آپ کے مشورے پر ہم نے اسلم پرویز صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تھا اور وہ نہیں آئے، ہمارا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔

لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر دنیا میں خلیق انجم کے سب سے قریب کوئی ہے تو وہ میں ہوں لیکن روح الامین کے عروج سے بھی ایک اگلی منزل معراج کی ہے اب اس کا مطلب آپ خود ہی سمجھ لیں۔ نزدیک ترین کی اصطلاح بھی دو چیزوں یا دو افراد کے درمیان کسی نہ کسی نوع کے فصل کا اشاریہ خواہ وہ فصل بال برابر ہی کیوں نہ ہو۔ خیر تو اِس نزدیکی کی بنا پر بعض لوگ جو خلیق انجم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے پکڑتے ہیں یہ سوچ کر کہ سب سے زیادہ قابو خلیق انجم پر شاید میرا ہی ہے۔ خلیق انجم پر بھلا کس کا زور چلا ہے اور اگر چلے گا بھی تو صرف اس کا جس کا زور

وہ اپنے پر چلوانا چاہیں گے۔ میں ٹھہرا گھر کی مرغی۔ میرے ان سے قریب ترین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بات کے لیے جتنا صاف صاف مجھے منع کر سکتے ہیں دنیا میں کسی کو بھی نہیں کر سکتے۔ کسی دوسرے کی کوئی بات مانیں گے تو اس کی کوئی رگ بھی دبے گی ان سے۔ میری بھلا وہ کون سی رگ دبالیں گے پہلے ہی سے ساری رگیں دبائے بیٹھے ہیں۔

خلیق انجم بلا کے حاضر جواب ہیں اور اتنے ہی بلا کے وہ حاضر دماغ بھی ہیں۔ اکثر بحث و مباحثے میں وہ اپنی اسی طاقت کے بل پر دوسروں کو چت کر دیتے ہیں۔ وہ باتوں باتوں میں ہاتھ کے ہاتھ اس پھرتی سے کوئی دلیل گھڑ کر پیش کر دیں گے کہ اس دلیل کے غیر معتبر ہونے کا دوسرے کو کوئی گمان بھی نہیں گزرے گا۔ مثلاً ایک بار میں نے ان سے کہا کہ یار میرا فلاں شاگرد ترقی اردو کونسل میں فلاں پوسٹ کے لیے درخواست دینا چاہتا ہے اس کے لیے اسے ایک Experience سرٹیفکٹ چاہیے۔ تم اپنے دفتر کے لیٹر ہیڈ پر اسے ایک سرٹیفکٹ بنوا کر دو۔ ابھی میرا فقرہ پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اُدھر سے اس کا جواب بھی چل پڑا ''یار میں پہلے ہی دو امیدواروں کو اس قسم کے سرٹیفکٹ دے چکا ہوں، اب اور نہیں چلے گا۔'' میری سمجھ میں فوراً ان کی یہ بات آ گئی۔ میں نے کہا، ''اچھا تو اس نوکری کے لیے اس کی وہاں سفارش ہی کر دو۔'' اس بات کا برجستہ جواب یہ ملا کہ ''یار صرف ایک پوسٹ ہے اور اب تک سو درخواستیں وہاں پہنچ چکی ہیں۔ ان میں دس بیس تو یقیناً بڑی سفارشوں والی بھی ہوں گی، ایسے میں میری سفارش کیا کرے گی۔'' میں ان کی یہ بات سمجھنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ بہر حال طالب علم سے کہا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بنا پہلی فرصت میں درخواست تو دے ہی آئے اور پھر آ کر مجھے بتائے۔ پھر اگلے روز جب وہ طالبِ علم پہلی ہی فرصت میں درخواست داخل کر کے میرے پاس آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس پوسٹ کے لیے دفتر میں سب سے پہلے پہنچنے والی درخواست تو خود اسی کی تھی۔ خلیق انجم کا بیٹا ثمر جیٹ ایرویز میں کسی اچھی پوسٹ پر لگا ہوا ہے۔ ایک روز میں نے خلیق انجم سے کہا ''یار ثمر سے کہہ کر فلاں لڑکے کو جیٹ ایرویز میں کسی چھوٹی موٹی نوکری پر لگا دو۔'' فوراً سے بھی پیشتر جواب آیا، ''ابھی ٹھہر جاؤ یار، وہ پہلے ہی دس پندرہ دوستوں کو وہاں لگوا چکا ہے۔'' بہر حال جہاں تک ان کی طرف سے خود اپنے طور پر میری ذات کو فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اسی قدر فعال رہتے ہیں جس قدر کہ میں خود مجہول ہوں۔

خلیق انجم اپنے روزانہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں رات کو دس بجے اپنے بستر پر ہوتے ہیں۔ صبح ساڑھے چار بجے اٹھ کر اپنے مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے

ہیں۔اب آٹھ ساڑھے آٹھ تک یہ تین چار گھنٹے کا ٹائم ان کا اپنا ہے جوان کی ادبی کاوشوں کے لیے وقف ہے۔انھوں نے بالخصوص تحقیق و تدوین کے میدان میں اپنی جو شناخت قائم کی ہے وہ اسی سحر خیزی کے معمول کی دین ہے۔دفتر کا ٹائم ساڑھے نو بجے کا ہے، یہ نو اور سوا نو کے بیچ دفتر پہنچ کر اپنی میز سنبھال لیتے ہیں اور اب شام تک دنیاداری ہوتی رہتی ہے۔آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے چار خوش چار ناخوش۔ دفتر کے مسائل اور الجھیڑے الگ، اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت، بک ڈپو، انجمن کمپیوٹر سینٹر، قیصر تعلیمی مرکز، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، ملک بھر میں پھیلی ہوئی انجمن کی شاخوں کی خبر گیری، اردو کے مسائل اور ان سے متعلق مطالبے، جلسے، جلوس اور تحریکیں غرض اتنی مصروف زندگی کہ خدا کی پناہ۔اتنی مصروف زندگی میں آدمی کو تھوڑا بہت کامک ریلیف تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔اس کامک ریلیف کا سامان بھی قدرت نے خود خلیق انجم کی ذات میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔

خلیق انجم تہذیب اور شائستگی کا مطلب بخوبی جانتے ہیں لیکن مختلف مراتب کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی طرح کی تہذیب کو برتنے کے وہ قائل نہیں۔ وہ شائستہ لوگوں کے ساتھ شائستہ، نیم شائستہ لوگوں کے ساتھ نیم شائستہ، یہاں تک کہ ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ناشائستہ تک بن کر دکھا سکتے ہیں۔ان کی وضع اس معاملے میں بقولِ سید انشا یہ ہے:

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

یہ بڑی جرأت کی بات ہے جو ہر شخص میں نہیں ہوتی۔خلیق انجم ایک انتہائی مہذب انسان ہیں، اس بات کی گواہی دینے والے کچھ لوگ تو اس دنیا سے اُٹھ گئے جیسے کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مرزا محمود بیگ، پروفیسر محی الدین قادری زور، جو لوگ بفضلِ خدا ہمارے بیچ موجود ہیں ان میں اندر کمار گجرال، ڈاکٹر سروپ سنگھ، سید حامد، پروفیسر جگن ناتھ اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس بات کے گواہ ہیں۔اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں خلیق انجم نے رسمِ عقیدت کو کج کلاہی اور بانکپن سے نبھایا ہے۔ایسے لوگوں میں پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام، حیات اللہ انصاری اور پروفیسر مسعود حسین خاں شامل ہیں۔

خلیق انجم میں ظرافتِ طبع بھی بلا کی ہے۔ان کی حسِ مزاح انتہائی تیز ہے جوان کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے مل کر بڑے گل کھلاتی ہے۔کوئی بھی برجستہ جملہ، کوئی زوردار پھبتی، کوئی

انتہائی موزوں مذاق دوستوں کی محفل میں یا سمیناروں کے اسٹیج پر برملا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے اور پوری محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ تاہم خلیق انجم کو بذلہ سنج کہنے میں مجھے تھوڑا تامل سا ہے، ان کے مزاج کے اک گونہ پھکڑ پن کے سبب۔ بذلہ سنجی تہذیبی سطح پر ایک ایسے مزاج کی متقاضی ہے جو پھکڑ پن ذرا سا بھی برداشت نہیں کرتا۔ گویا بذلہ سنجی میں لطیف قسم کے تصنع کی بھی ہلکی سی رمق ہوتی ہے، اسی لیے بذلہ سنجی کا علاقہ بھی قدرے محدود ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی ظرافتِ طبع کو تو ایک بے کراں میدان چاہیے اور کھل کر بات کرنے کی ان کی طبیعت کو رواداری کی سپر سے زیادہ بے باکی کی تیغ کی ضرورت ہے اور اس بے باکی کی انتہا ہے منہ پھٹ اور پھکڑ ہونا جو کبھی کبھی خلیق انجم کو ہونا پڑتا ہے لیکن اس کا استعمال وہ براہِ راست کبھی نہیں کرتے۔ وہ مجلسی خوش گپیوں کے حیلے سے یہ کام کر جاتے ہیں۔

میں کافی دیر سے اس مضمون کو اختتام پر پہنچانے کی فکر میں ہوں لیکن اس کی باگ میرے ہاتھ سے کب کی چھوٹ چکی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سب سے مشکل کام خلیق انجم کا خاکہ لکھنا ہی لگتا ہے، اسی لیے میں اس کو اب تک ٹالتا رہا تھا۔ اگر خلیق انجم میرے لیے کوئی معروضی حقیقت ہوتا تو میں اسے ماڈل کی طرح اپنے سامنے بٹھا کر کب کا اس کا نقش اتار چکا ہوتا۔ لیکن ماڈل اور رول ماڈل میں جو فرق ہوسکتا ہے وہی فرق خلیق انجم کی معروضی شخصیت اور اصلی خلیق انجم میں ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ اصلی خلیق انجم کیا ہے تو اس اصلی خلیق انجم کی بھی کئی اصلیتیں ہیں، خود ان لوگوں کی اپنی اصلیتوں کے تعلق سے جن کے وجود میں خلیق انجم کسی نہ کسی طور سمایا ہوا ہے۔ تو میرے وجود میں بھی خلیق انجم پچھلے باون برسوں سے پوری طرح متھا ہوا ہے۔ میں اسے کسی فرد اکائی کی شکل میں اپنے اندر سے باہر لا کر آپ کو دکھا ہی نہیں سکتا، اسی لیے تھوڑا تھوڑا سا کہیں کہیں سے کھرچ کھرچ کر باہر لا لا کر دکھانے میں لگا ہوں اور یہ نظارہ میتھی کی روٹی کے اس گندھے ہوئے آٹے کے پیڑوں کی طرح ہے جہاں آٹا اور میتھی کا ساگ اپنے اپنے دو نمایاں سفید اور سبز رنگوں میں دیکھے تو جا سکتے ہیں لیکن انھیں علاحدہ علاحدہ کر کے نہیں بتایا جا سکتا۔

(سہ ماہی 'ایوانِ ادب' مرتبہ: انیس دہلوی، 2000)

○○○

مجتبیٰ حسین

خلیق انجم — انجمن کا آدمی

یہ 1972 کی بات ہے جب میں حکومتِ آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات وتعلقاتِ عامہ کے اردو شعبہ سے وابستہ تھا۔ ایک دن ایک سرکاری مراسلہ وزارتِ تعلیم، حکومت ہند کی جانب سے مجھے موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ میں دو برسوں کی مدت کے لیے ڈپیوٹیشن (Deputation) پر دہلی آؤں اور (Committee for Promotion of urdu) کی رپورٹ کی تیاری میں کمیٹی کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہ وہی کمیٹی ہے جس نے بعد میں سارے ملک میں ''گجرال کمیٹی'' کے نام سے شہرت پائی۔ اندر کمار گجرال مرکزی وزیر اطلاعات اس کمیٹی کے صدر نشین تھے۔ علی جواد زیدی اس کے سکریٹری اور خلیق انجم اس کے ڈائرکٹر تھے۔ اس کے ارکان میں کرشن چندر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر سروپ سنگھ، آل احمد سرور، عابد علی خاں، احتشام حسین اور مالک رام وغیرہ جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں شامل تھیں۔ 19 ستمبر کو میں کمیٹی کے دفتر میں رجوع بکار ہونے کے لیے دہلی کے شاستری بھون میں پہنچا تو پہلے علی جواد زیدی سے ملاقات کی۔ میرے دہلی آنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ہدایت دی کہ میں ڈاکٹر خلیق انجم سے ملوں جو اسی عمارت کے 'C' بلاک میں بیٹھا کرتے تھے۔ خلیق انجم نہایت تپاک سے ملے۔ انہیں یاد تھا کہ 60 کی دہائی کے اوائل میں حیدرآباد کے اورینٹ ہوٹل میں ان سے میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی، جب وہ اپنے کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں حیدرآباد آئے تھے۔ تاہم ان سے باضابطہ، مسلسل اور تفصیلی ملاقاتوں کا آغاز گجرال کمیٹی کے حوالے سے ہی ہوا۔ شروع شروع میں ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ بعد میں غلام ربانی تاباں بھی بیٹھنے لگے تھے۔ میں نے خلیق انجم کو نہایت ملنسار، خوش اخلاق، شائستہ اور مہذب انسان کے روپ میں پایا۔ تاہم بات چیت کے دوران ان کی برجستہ گوئی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور فقرہ بازی ان کی شخصیت کو اور بھی دلکش اور دلنواز بنا دیتی تھی۔ وہ نہ صرف دُھن کے پکّے تھے بلکہ کام کے

بھی سچّے تھے۔ جو کام بھی کرتے بڑے انہماک اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔ مجھے کمیٹی کی رپورٹ کے لیے درکار تاریخی مواد کو اکٹھا کرنے کی غرض سے بسا اوقات نیشنل آرکائیوز کے دفتر میں بھی جانے کا موقع ملتا تھا، جہاں چھان بین کے دوران مجھے اچانک کچھ ایسی دستاویزات بھی ملیں جن سے پتا چلتا تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنے دورِ اقتدار میں اردو کی کن کن نظموں کو ضبط کیا تھا۔ میں نے جب اس کی اطلاع علی جواد زیدی کو دی تو بہت خوش ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں کمیٹی کے لیے درکار مواد کے علاوہ ان نظموں کو بھی جمع کرتا چلوں۔ بعد میں خلیق انجم اور میں نے مل کر ان ضبط شدہ نظموں کو کتابی شکل میں مرتب کیا جس کا اجرا وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ کچھ دنوں بعد اس کا ہندی اڈیشن بھی شائع ہوا۔

گجرال کمیٹی نے مختلف مقامات کا طوفانی دورہ کیا اور شبانہ روز محنت کے بعد اس کی رپورٹ کو نہ صرف دو سال کی مقررہ مدت میں مکمل کر لیا بلکہ اسے حکومت کے حوالے بھی کر دیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اندر کمار گجرال نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لاتے ہوئے کئی ریاستی حکومتوں کو اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ وہ کمیٹی کی بعض سفارشات کو فوراً روبہ عمل لے آئیں۔ مثال کے طور پر کئی ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم کی گئیں جو آج بھی موجود ہیں۔ ریڈیو پر اردو نشریات کے اوقات میں اضافہ کے علاوہ اردو اخبارات کو بعض سہولتیں بھی فراہم کی گئیں۔ مگر افسوس کہ گجرال کمیٹی کی، اردو تعلیم اور روزگار سے متعلق بہت سی اہم سفارشات آج تک ٹھنڈے بستے میں بند پڑی ہوئی ہیں۔ میں یہاں کمیٹی کے ذکر کو طول نہیں دینا چاہتا کیوں کہ اس کے حشر سے ہر کوئی واقف ہے۔

خلیق انجم ٹھیٹ دہلی والے تھے اور وہ نہ صرف اس کے چپے چپے سے واقف تھے بلکہ اس کے قبرستانوں کا حال بھی خوب جانتے تھے کہ کس قبرستان میں کون مدفون ہے۔ دہلی کے آثارِ قدیمہ پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ کسی عمارت کا حال بیان کرنے بیٹھ جاتے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ عمارت خود انھوں نے بنوائی ہو۔ دہلی کے محاوروں کے علاوہ دہلی کے کھانوں، میلوں ٹھیلوں، رسم و رواج، زیورات اور ملبوسات سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ غرض وہ دہلی میں بسے ہوئے تھے اور دہلی ان میں بسی ہوئی تھی۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دہلی میں خلیق انجم کے تعلقات نہایت وسیع ہیں اور ان کا رسوخ بہت بااثر ہے۔ اُن دنوں وہ مشہور سماجی کارکن اور رہنما سبھدرا جوشی کے رسالے ''سیکولر ڈیموکریسی'' کے اردو اڈیشن کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ایک دن میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ ہولی کے موقع پر اپنے رسالے کی جانب سے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد کریں۔ چناں چہ 1973 میں یہ

تاریخی مشاعرہ لال قلعہ کے سامنے وسیع میدان میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں شائقینِ ادب نے شرکت کی تھی۔ اس میں شمالی ہند کے مزاحیہ شعرا کے علاوہ حیدرآباد کے کئی مزاحیہ شعرا جیسے سلیمان خطیب، حمایت اللہ، بوگس حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ وغیرہ کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ بعد میں شمالی ہند میں ان دکنی شعرا کی مقبولیت میں خاصہ اضافہ ہوا۔ اس کامیاب تاریخی مشاعرہ کو لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔ غرض کمیٹی کے کام کے سلسلے میں خلیق انجم کی رفاقت میں دو سال کچھ ایسے خوشگوار گزرے کہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کمیٹی کا کام ختم ہوا تو مجھے اصولاً حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات میں اور خلیق انجم کو کروڑی مل کالج میں واپس جانا تھا، مگر خدا کی کرنی کچھ ایسی ہوئی کہ مجھے این سی ای آر ٹی میں ایک اچھی ملازمت مل گئی اور خلیق انجم انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ میں تو خیر بعد میں اپنے مقررہ وقت پر ملازمت سے ریٹائر ہو گیا لیکن خلیق انجم 2012 تک اپنے عہدہ پر ڈٹے رہے۔ یوں خلیق انجم سے دہلی میں لگاتار اور بے شمار ملاقاتوں کی صورت نکل آئی اور وہ میرے لیے خلیق انجم سے ''خلیق انجمن'' بن گئے۔

خلیق انجم نہایت مستعد، چوکس اور فعّال آدمی تھے۔ تحقیق کے میدان میں وہ اعلا رتبہ کے حامل تھے۔ تاہم میری نظر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر کو علی گڑھ سے اٹھا کر دہلی لے آئے اور اس کے لیے ایک عالیشان عمارت تعمیر کروائی اور اس کا افتتاح اس وقت کے وزیراعظم مرارجی دیسائی کے ہاتھوں کرایا۔ چناں چہ دہلی کے مرکزی علاقہ راؤز ایونیو میں واقع ''اردو گھر'' آج اردو کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سب سے اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اس کارنامے کو انجام دینے کے لیے خلیق انجم کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس کام کا تجربہ ہے۔

خلیق انجم نے اپنی طویل میعادِ ملازمت میں نہ صرف دہلی بلکہ ملک کے مختلف مقامات پر سینکڑوں اجتماعات، کانفرنسیں اور سمینار وغیرہ منعقد کیے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں اردو کے سلسلے میں بھرپور نمائندگیاں کیں۔ انجمن کی شاخوں میں اضافہ کیا اور اردو دانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اُن سے لگ بھگ پچپن برس کے مراسم تھے۔ اُن کا حال بیان کرنے بیٹھوں تو سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ وہ بہترین مقرر تھے اور اپنی تقریر میں وقفہ وقفہ سے ایسے فقرے کہہ جاتے تھے کہ محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ ان کی حسِ مزاح بہت تیز تھی اور خاص بات یہ تھی کہ ان کے بے ساختہ فقروں سے کسی کی دلآزاری نہیں ہوتی تھی۔ شوخی کے باوجود شائستگی کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔

پاکستان کے ممتاز محقق اور بے مثال مزاح نگار مشفق خواجہ مرحوم کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے شہر سے یا اپنے ملک سے کبھی باہر جاتے تھے تو وہاں اپنے کسی شناسا کے گھر میں قیام نہیں کرتے تھے بلکہ ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ تاہم 1985 میں جب وہ پہلی اور آخری بار دہلی آئے تو انھوں نے بطورِ خاص خلیق انجم کے گھر میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک ملاقات میں جب مشفق خواجہ سے خود اپنے اس معمول سے انحراف کا سبب پوچھا تو ہنس کر بولے ''میں تو اصل میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی غلط اردو اور اُن کے غلط تلفظ کا جائزہ لینے کی خاطر ان کے گھر میں مقیم ہوا ہوں''۔ جب تک مشفق خواجہ دہلی میں رہے میرا بھی زیادہ وقت خلیق انجم کے گھر پر ہی گزرتا تھا۔ خلیق انجم اور مشفق خواجہ کی نوک جھونک سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ دونوں کی اس فقرے بازی میں بسا اوقات خلیق انجم بازی مار لے جاتے تھے۔

خلیق انجم نے ہمیشہ مجھے بہت عزیز رکھا۔ اپنی موجودہ ''حالت'' اور ''حالات'' کے باعث دہلی میں لمبے قیام کے بعد آٹھ برس قبل میں بالآخر حیدرآباد منتقل ہوگیا لیکن کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جب ان سے فون پر لمبی بات نہ ہوئی ہو۔ اکثر اوقات ان کی اہلیہ موہنی انجم، جو نہایت سلیقہ مند خاتون ہیں، مجھے فون ملا کر کہتی تھیں کہ ''خلیق انجم آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ لیجیے ان سے بات کیجیے''۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ طویل ٹیلی فون بات چیت میں کبھی انھوں نے اپنی علالت یا کسی پریشانی کا ذکر نہیں کیا۔ ان کے اندر جینے کا حوصلہ بہت توانا تھا۔ کبھی مایوسی کی بات نہیں کرتے تھے۔ تاہم مجھ سے ہمیشہ شاکی رہے کہ میں دہلی سے حیدرآباد منتقل ہوکر دہلی کو سونی کر گیا۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ جب سے حیدرآباد آیا ہوں، خود حیدرآباد میرے لیے سونا ہوگیا ہے کیوں کہ میری نوجوانی کے زمانے کا کوئی دوست اب اس شہر میں باقی نہیں رہا۔ یوں سمجھیے کہ اپنی نعش کو خود اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں۔

اُن کے انتقال کے پندرہ منٹ بعد ہی فیاض رفعت نے جب لکھنو سے فون کر کے مجھے اُن کے گزر جانے کی اطلاع دی تو سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کیسی کیسی انمول اور بے مثال ہستیاں اس دنیا سے اٹھ گئیں۔ کتنوں کو یاد کروں، کس طرح یاد کروں اور کب تک یاد کروں۔ اب تو میری عمر کی نقدی بھی ختم ہونے کو ہے اور اب مجھ میں اس سے زیادہ بوڑھا ہونے کی دور دور تک کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ رہے نام اللہ کا۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں ❑❑

عتیق اللہ

خلیق انجم: ایک فرد، ایک انجمن، ایک تحریک

(خلیق صاحب پردۂ غیاب میں ضرور چلے گئے لیکن اردو گھر کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک ذرّے میں وہ آج بھی زندہ ہیں)

خلیق انجم بھی نہیں رہے۔ ایک کے بعد ایک ہمارے ان معاصرین بزرگوں سے اردو معاشرہ خالی ہوتا جارہا ہے جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ اردو زبان وادب کی مشاطگی میں گزرا ہے۔ ان میں انتظار حسین، جوگندر پال اور پیغام آفاقی جیسے فکشن نگار تھے۔ قرۃ العین کے چھوڑے ہوئے سنّاٹوں سے ابھی ہم جوجھ ہی رہے تھے کہ افتاد پر افتاد یہ پڑی کہ انتظار حسین نے بھی کوچۂ جسم وجاں سے معدومیت کی راہ اختیار کرلی۔ زبیر رضوی جیسے منفرد شاعر، نثر نگار اور عدیم المثال مدیر کا بدل بس ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ ندا فاضلی کے کرب میں ڈوبے ہوئے لہجے اور ہر طرف کو آر پار کرتی ہوئی کاٹ دار آواز کو کہاں ڈھونڈ سکیں گے۔ ملک زادہ منظور احمد کی پختہ و موثر نثر اور بیان وخطاب کرنے کے اپنے انداز وانفراد کی کیا کوئی مثال قائم کرسکے گا۔ اسلم فرخی، اسلوب احمد انصاری، انور سدید، شکیل الرحمٰن، سیدہ جعفر اور خلیق انجم سے تنقید وتحقیق کے ایوانوں میں جو رونق تھی اس کا بس ایک تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ رشید حسن خاں، محمد حسن، قمر رئیس کے بعد آسمانِ شعر وادب کی یہ پوری ایک کہکشاں تھی، اسی سلسلے کے ایک انجم تابناک کا نام خلیق انجم تھا۔ جو ذاتِ واحد میں خود ایک انجمن تھے۔ پیشہ ورانہ سفر کا آغاز اردو استاد کی حیثیت سے ہوا، لیکن کروڑی مل کالج کا شعبۂ اردو اُن پر حد قائم نہیں کرسکا۔ اس پرندے کے لیے تو دوسرا ہی آسمان چشم براہ تھا۔ آزادیِ ہند کے بعد اردو پر جو افتاد پڑی تھی اور اردو معاشرے میں ایک

اندوہ ناک سکوت سا طاری ہوگیا تھا۔ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والوں کے حوصلوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ انجمن ترقیِ اردو کی مہمات 'ہماری زبان' کے حروف والفاظ تک محدود ہوکر رہ گئی تھیں۔ ایک نئے جمہوری نظام سے جو بلند کوش خواب دیکھے گئے تھے ان کی ایک الم ناک تعبیر اردو دشمنی کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ آل احمد سرور مرحوم نے محسوس کرلیا تھا اور صحیح محسوس کیا تھا کہ اردو کے وسیع تر کاز کے لیے وسیع تر منصوبے اور ایک وسیع تر میدانِ عمل کی ضرورت ہے اور اس میدانِ عمل کے لیے علی گڑھ کی علم پرور فضا بہت تنگ تھی۔ سرسید کی مہم جوئی کو بالخصوص اردو کے سلسلے میں مولوی عبدالحق سے کافی تقویت ملی تھی۔ اگرچہ سرسید کا موقف دوسرا تھا، ان کا ایک وسیع لائحۂ عمل تھا جس کے مقاصد کی فہرست میں علمی، تہذیبی اور اقتصادی ترقی کے علاوہ اخلاقی تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اردو زبان کے مسئلے کی حسّاسیت کو سرسید بخوبی سمجھتے تھے اور انھیں درِ پردہ اردو مخالف قوتوں کی سرگرمیوں اور درجہ بدرجہ اقدامات کا بھی گہرا شعور تھا لیکن اردو کے تحفظ وترقی کے مسئلے کو وہ تحریک میں بدلنے اور اسے ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں نہ تھے کیوں کہ راجہ رام موہن رائے کی مثال ان کے پیشِ نظر تھی جن کے لیے نئے علوم کی رسائی کی راہ انگریزی سے ہوکر جاتی ہے اور ان کی نظر میں انگریزی زبان ہی وقت کا تقاضا بھی تھی۔ سرسید کے برخلاف شبلی، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار کے علاوہ اکثر مسلم قائدین اور علما اردو کے تحفظ وترقی کو وقت کی ایک اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ آزادی کے بعد تو یہ ضرورت شدید ضرورت میں بدل گئی۔ آل احمد سرور کا موقف بھی یہی تھا کہ اردو کے حقوق کی لڑائی اب اتنی آسان نہیں ہے۔ نہرو جی، اور مولانا آزاد جیسے سیکولر قائد موجود تھے۔ ایوانِ سیاست کے باب تھوڑے سے وا تھے، سو انجمن ترقی اردو کو چھوٹا سا قطعۂ اراضی، ایک وسیع تر میدانِ عمل کے طور پر دہلی میں حاصل ہوگیا۔ قطعۂ اراضی کا حصول بھی اتنا آسان نہ تھا لیکن یہ محض ایک خاکہ تھا جو رنگوں سے عاری تھا، خاکہ آرائی یا کسی عمارت کے کاغذی منصوبے کو روبہ عمل لانا نسبتاً اس سے زیادہ مشکل کام ہے۔ جس اردو گھر کا خواب مولوی عبدالحق نے دیکھا تھا اور جس زمانے میں دیکھا تھا وہ حالات کچھ اور تھے۔ ابھی جاگیرداری اور زمیں داری کا نظام موجود تھا، مسلم معاشرہ کی اکثریت اس وقت بھی دوسری اقوام سے ذہنی اور اقتصادی طور پر پسماندہ تھی لیکن تعلیمی ترقی اور اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے نام نہاد مسلم رؤسا کا طبقہ بیدار تھا اور اس کی ہم دردیاں ان مہم جوؤں کے ساتھ تھیں۔ آزادی کے بعد جاگیرداری نظام کا پورے طور پر

خاتمہ ہوگیا اور پاکستان کے قیام کے بعد ہندستانی مسلمان اور اردو کو جن سیاسی حالات کا سامنا کرنا پڑا اُن حالات نے بھی اردو معاشرے کو گہرے حاشیائی اندھیروں کی طرف دھکیل دیا۔ اس قسم کے حالات نئے ذہنوں کے متقاضی تھے۔ جوان پسپائیوں سے ابھرنے اور نئی توقعات قائم کرنے اور انھیں پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ سیاسی سطح پر ہندستانی مسلمانوں کی آواز کو روز بروز دبانے اور کچلنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کیے جارہے تھے اس حوصلہ شکن صورتِ حال سے نپٹنے اور کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے بلا خوفی اور منصوبہ بند مساعی کے بغیر نہ تو کسی مسئلے کا حل ممکن تھا اور نہ کسی مقصد کی تکمیل اندراز امکان تھی۔ ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات میں خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو کی کمان سنبھالی، وہ جوان العمر تھے، ان میں نیا جوش وولولہ تھا، محض ادب ان کا مسئلہ نہ تھا، زبان کا تحفظ اور اس کی ترقی ان کا مقصدِ خاص تھا۔ اردو کے استاد تھے زبان کی قوت سے بھی وہ بہرہ ور تھے اور بے باکی بھی ان کے خمیر میں شامل تھی کیوں کہ بقول ان کے وہ نسلاً پٹھان ہی تھے۔ پٹھان سیدھی اور ہموار بات کرنے اور بات سننے پر یقین رکھتا ہے۔ غصہ ور انسان جتنا غصیلا ہوتا ہے اتنا ہی اس میں انکسار بھی ہوتا ہے، کیوں کہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ غصہ کو چھوٹ دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے اور نتائج کیا صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ خلیق انجم صاحب نتائج سے بے خبر لوگوں کو عاقبت نااندیش کہا کرتے تھے۔

خلیق صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کیا ہوئے ایک بہت بڑے ذمّے داری کے پہاڑ کو اپنے سر پر اٹھالیا۔ وہ پورے اردو معاشرے کی امیدوں کا مرکز بن گئے تھے۔ جس زمین کا ٹکڑا میسر آیا تھا اس پر اردو گھر کی عمارت کی تعمیر ابھی محض تصور ہی میں تھی۔ خلیق مرحوم کی حکمتِ عملی اور سوجھ بوجھ سے تعمیر کا کام بھی شروع ہوا مگر وہ رفتار نہیں پکڑ سکا۔ سب سے بڑا مسئلہ مالیات کی فراہمی کا تھا۔ بہرطور خلیق صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ اردو معاشرے کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی بھی ادارے کی تکمیل تک تو دبی چھپی زبان میں اعتراضات کے تیر پھینکنے سے تو باز نہیں آتے لیکن جیسے ہی ادارہ پوری طرح قائم ہوجاتا ہے تو اس کے ثمرات لوٹنے کے لیے ہزار طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ خلیق مرحوم کو اردو معاشرے کی نیک نیتی اور بدنیتی دونوں کا بخوبی علم تھا۔ علی گڑھ نے تھوڑی بہت ان کی ذہنی تربیت کی تھی اور معاملہ فہمی کا درس بھی دیا تھا۔ انھوں نے مختلف علاقوں کے مسلسل دورے کیے۔ انجمن کی شاخیں قائم کیں یا تعطل کی شکار انجمنوں میں نیا جوش وخروش اور نئی روح ڈالنے کی کوشش کی جو بے حد

کامیاب رہی۔

مجھے 1974 کی وہ ساعت بھلائے نہیں بھولتی جب میں خلیق مرحوم سے ملاقات کی غرض سے اردو گھر پہنچا تھا۔ اس وقت عبداللہ کمال کو بھی انھوں نے ملازمت دے رکھی تھی۔ میں تقریباً 12 بجے کے وقت پوچھتے پاچھتے اس دیارِ اردو کے خرابے تک پہنچ ہی گیا۔ عمارت کا ایک ادھورا سا ڈھانچہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ڈھانچے کے اردگرد ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ ریت کے تودے تھے۔ کہیں تھوڑے سے سریے پڑے ہوئے تھے، کہیں کچھ سیمنٹ کے بوروں کا ڈھیر تھا۔ سارا گرد و پیش دھول سے اٹا ہوا تھا۔ ڈھانچے کے اندر جانے کا کوئی ہموار راستہ نہیں تھا۔ آنے جانے والے لوگوں یا مزدوروں کے قدموں کے نشانات سے ایک پتلی سی پگڈنڈی پر نظر پڑی اور اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے قدم کو آگے بڑھائے۔ ڈھانچے کے بیچوں بیچ یا ایک طرف کچھ یاد نہیں آتا، گرد و غبار سے شرابور اس ماحول میں دو تین بلبوں کی تیز روشنی بھی ایک محدود بساط میں بھنچ کر رہ گئی تھی۔ تھوڑی دور کے فاصلے سے ایک جوان العمر شخص کا صرف خاکہ سا نظر آیا جو کرسی پر دراز تھا، ذرا اور قریب جا کر دیکھا تو عبداللہ کمال ایک دھول اٹی کرسی پر سنبھلے ہوئے بیٹھے دکھائی دیے۔ میز کی دائیں طرف خلیق مرحوم تھے۔ بال الجھے، بکھرے ہوئے، ایک آستین کہنی تک پلٹی ہوئی دوسری آدھی، ہاتھ میں ایک پین، چہرے پر بدحواسی کا سماں تھا۔ کاغذوں پر دھول چڑھی ہوئی، فائلوں پر اس قدر دھول تھی کہ ان پر لکھی ہوئی تحریر بھی دھندلی ہوگئی تھی۔ خلیق مرحوم ہمیں (غالباً میرے ساتھ شاہد ماہلی یا کوئی اور تھا) دیکھ کر ایک دم کھڑے ہوگئے اور سامنے پڑی ہوئی دو نحیف و نزار کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ عبداللہ کمال نے ہمارا تعارف کرایا۔ خلیق مرحوم نے بڑی خوش دلی سے استقبال کیا، چائے سے تواضع کی۔ اپنے دوستوں اور دوست نما کرم فرماؤں کا ذکر کیے بغیر اپنی مشکلات کی طرف کچھ اشارے کیے۔ اپنے عزمِ صمیم اور ارادوں کی پختگی کے حوالے سے ہماری ڈھارس بندھائی جیسے یہ ساری مشکلات ہم جھیل رہے ہیں۔ ہم نے ان کے حوصلوں کی داد دی۔ ان کی حکمت عملیوں، ان کے استقلال و استقامت، ان کی پامردی اور ضبط و تحمل کی تعریف کرتے ہوئے ان کی اس جدوجہد کو اردو زبان کی ترقی کی راہ میں ایک غیر معمولی اقدام سے تعبیر کیا۔ ان دگرگوں حالات میں بھی انھوں نے 'ہماری زبان' کو جاری رکھا تھا اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طور پر قائم تھا۔ میرا نام اس وقت تک ایک شاعر کی حیثیت سے خاصا جانا پہچانا ہوگیا تھا۔ 'شب خون' اور

'کتاب نما' وغیرہ میں میری کئی نظمیں، غزلیں شائع ہو چکی تھیں اور 'ایک سو غزلیں' بھی منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ حیرت جب ہوئی کہ انھوں نے مجھ سے بھی اپنی شاعری کے ایک مختصر سے انتخاب کی دعوت دے دی۔ خلیق مرحوم مختصر انتخاب پر مبنی چند مجموعے پہلے ہی شائع کر چکے تھے۔ مجھے ان کی اس خوش خلقی اور نوجوان نسل کو موقع فراہم کرنے کے اسلوب نے بے حد متاثر کیا۔

برسوں کے بعد 'اردو گھر' کی تعمیر خواہ وہ درجہ بدرجہ سہی، مکمل ہو چکی تھی۔ خلیق مرحوم اردو کی ترقی کا علم بلند کیے ہوئے ہمہ وقت سفر پر کمر بستہ نظر آئے۔ سرکار کو اردو کے مختلف النوع مسائل سے آگاہ کرتے اور احتجاج بھی کرتے، شکایت کرنے کا بھی ان کا اپنا ایک انداز تھا، درخواست کرنے کی بھی ایک الگ ڈھب تھی، وزرا، کو پشیمان کرنا اور انھیں بوتل میں اتارنے کا فن بھی انھیں خوب آتا تھا، بحث کرنے میں خصوصاً سیاسی عمائدین سے ان کا لہجہ ایک الگ طور اختیار کر لیتا تھا۔ کبھی تھوڑی سی گرمی، کبھی تھوڑی سی نرمی، کبھی حقوق کا حوالہ دے کر جھنجھلاہٹ، کبھی اظہارِ تاسف، کبھی منٹوں میں کسی بات کو مان لینا، کبھی ضد پر آمادہ، اکثر مسخرگی سے بھی باز نہیں آتے۔ اس قسم کی مسخرگی، لطیفہ بازی، فقرے بازی، سنجیدہ ماتمی ماحول کو گرم کرنے کا محض ایک بہانہ ہوا کرتی تھی ان کے حسِ مزاح کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ مذاق ہی مذاق میں دوسرے کو قائل کرنے کا ایک ایسا ہنر رکھتے تھے جو انہی کا حصہ تھا۔ حاضر جوابی میں ان سے بازی لے جانا مشکل تھا۔

خلیق مرحوم کو غیر محسوس طور پر سنجیدہ ماحول کو غیر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ ماحول کو سنجیدہ میں بدلنا بھی خوب آتا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے کو مزید پشیمانی سے بچا بھی لیتے تھے اور کبھی حسِ مزاح اس قدر پھڑکتی کہ دوسرے کو اپنے استبعادی (Paradoxical) فقرے یا جملے سے کچھ اس طور پر رام کر لیتے تھے کہ دوسرا اسے اپنا سچا ہم درد سمجھنے لگتا۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ خلیق مرحوم نے اردو گھر میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے لیے استقبالیہ رکھا تھا۔ پورا ہال سامعین سے معمور تھا، جن میں یونیورسٹی طلبہ کی خاصی تعداد تھی۔ ڈائس پر نثار احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیق مرحوم اور ایک شعبۂ اردو کے صدر کرسی نشین تھے۔ تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ فاروقی صاحب کی ادبی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو ہوئی۔ جناب صدرِ شعبہ کو بھی دعوتِ سخن دی گئی۔ مرحوم نے بڑے مزے مزے کی باتیں کیں۔ جب انھوں نے فاروقی صاحب کی شرحِ میر کا ذکر کیا تو ان کی زبان سے 'شورِ شعر انگیز' نکلا۔ ہال میں کھلبلی سی مچ گئی۔

طلبہ ہنسنے لگے۔شعرشورانگیز کی آوازیں بلند ہوئیں۔اسی دوران نثار احمد فاروقی نے صدرِشعبہ کی طرف دیکھ کر'شعرشورانگیز' کہا لیکن نثار مرحوم کی آواز بھی اَن سنی کر دی گئی۔صاحبِ صدرِشعبہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہاں ہاں وہی 'شورِشعرانگیز' اس فقرے پر اور ٹھوکا لگا۔آخر میں شمس الرحمٰن فاروقی کے خطاب اور شکریے کی رسم کے بعد یہ جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

عرشے (ڈائس) سے اترنے کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، خلیق مرحوم، کمال احمد صدیقی، جناب صدرِشعبہ وغیرہ ایک گھیرا بنائے ہوئے اِدھراُدھر کی باتیں کر رہے تھے تو موصوف صدرِشعبہ یک لخت شمس الرحمٰن فاروقی کی طرف رجوع ہوئے اور کہنے لگے۔کیوں فاروقی صاحب کیا میں نے 'شورِشعرانگیز' کے بجائے 'شعرِشورانگیز' کہہ دیا۔ فاروقی صاحب نے مسکراتے ہوئے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا''ارے محترم آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا ہم ہی نے غلط سنا۔'' جیسے ہی فاروقی صاحب نے یہ کہا خلیق مرحوم کے کان کھڑے ہوئے انھوں نے سوچا، صدرِشعبہ کو اور مذاق کا موضوع نہ بنایا جائے۔سو انھیں خفت اور شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ انھیں ایک طرف یہ کہتے ہوئے لے گئے کہ چھوڑو یار تم کہاں شعرانگیز اور شورانگیز کی بحث میں پڑ گئے۔لو بسکٹ کھاؤ، چائے پیو۔خلیق مرحوم کے ہم دردانہ رویے سے قطعِ نظر، صاحبِ صدرِشعبہ آخر تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ فاروقی صاحب کی شرحِ میر کی جلدوں کا صحیح عنوان کیا ہے کیوں کہ موصوف فطرۃً ضدی اور بہت ہٹ دھرم واقع ہوئے تھے۔

ایک طرف خلیق مرحوم کا یہ لاابالی پن تھا، جس سے سب ہی واقف تھے دوسری طرف ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، تیسرے ان کی حکمتِ عملی اور چیزوں کو فوراً سمجھنے اور منفی حالات کو انگیز کرنے اور اسے اپنے موافق ڈھالنے کی اہلیت، چوتھے باخبری جو کسی بھی اردو ادارے کے سربراہ کے لیے ضروری ہے، پانچویں عملی تگ ودو میں اپنے شوق کو قائم رکھنا جو اتنا آسان نہیں ہوتا لیکن خلیق مرحوم نے مساوی طور پر اپنی تحقیقی وتنقیدی سرگرمیوں کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ تدوین کے ایسے غیر معمولی کارنامے انجام دیے جو انتہائی مستقل مزاجی (جس کی خلیق مرحوم میں بظاہر بہت کمی نظر آتی تھی) ہی نہیں جاں فشانی وجگر کاوی کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔خلیق صاحب کے ترتیب وتدوین کے کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے، ان میں غالب کی نادر تحریریں، غالب اور شاہانِ تیموریہ، غالب کے خطوط، رسومِ دہلی، دلی کے آثار قدیمہ، آثار الصنادید، جوش ملیح آبادی کے خطوط اور غالب کا سفرِ کلکتہ کی میرے لیے خاص اہمیت ہے اور جو مستقل حوالے کا حکم

رکھتے ہیں۔ تحقیق کا باب کبھی بند نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہمیشہ کھلا رہنے والا یعنی Open ended میدان ہے۔ خلیق مرحوم کو بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں رہا کہ انھوں نے جس مسئلے کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا تھا اس پر ان کی دریافت حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلیق مرحوم میں ضبط و تحمل کا مادّہ بھی بے مثال تھا۔ انھیں اپنی زندگی میں کئی حادثات کا سامنا کرنا پڑا، جن کے باعث انھیں معمول پر آنے کے لیے بے حد جسمانی مشقت کرنی پڑی لیکن انھوں نے کبھی حادثات کے سامنے سر نہیں جھکایا، سینہ سپر رہے۔ آخری برسوں میں وہ اکثر مذاکروں اور میٹنگوں میں شرکت کے لیے چھڑی لے کر آتے، پھر واکر پر آنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ باقاعدہ بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے، حسِ مزاح سے بھی کام لیتے، فقرہ بازی بھی کرتے، دوسرے کے طعن و تشنیع کا معقول جواب بھی دیتے۔ پھر میں نے دیکھا کہ پہلو میں پیشاب کی تھیلی لگی ہوتی، لیکن وہ اسے چھپاتے نہیں بلکہ اس سے بھی لطف لیتے۔ حالات کا مقابلہ کرنے میں انھیں کوتاہی برتنا تو آتا ہی نہ تھا۔ کہتے تھے زندگی اسی کا نام ہے۔

عموماً یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ عمل پر تو ہزار انگلیاں اٹھتی ہیں لیکن جو سست خورے، محض انگشت نمائی کے عادی یا کیریئرسٹ اور موقع پرست لوگ ہیں، انھیں بس اعتراض کرنے اور کیڑے نکالنے سے مطلب ہوتا ہے۔ صاحبِ عمل کن کن دشوار گزار راہوں سے ہو کر یہاں تک پہنچا ہے اور کن کن نشیب و فراز اور خطرات و مصائب سے دوچار رہا ہے۔ اس کا انھیں علم ہونے کے باوجود اپنی نشتر زنی کی عادت سے باز نہیں آتے۔ خلیق صاحب جتنے شفاف دل تھے، ان کی زبان بھی بے حد شفاف تھی۔ ان کی تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ وہ لفظوں سے نہیں کھیلتے، دوٹوک بات کرتے، دوٹوک لکھتے، طعن و طنز کے حربے بھی اگر استعمال کرتے تو مزاح کا عنصر بھی چٹکی بھر اس میں ڈال دیتے۔ ایسی ہستیوں سے اردو کا میدانِ کارزار خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اب سرکاری یا نیم سرکاری ادارے ہی باقی بچے ہیں ان کے اپنے حدود اور مجبوریاں ہیں۔ خلیق صاحب نے آزادی کے ساتھ جو کچھ مراحل طے کیے اور کبھی کسی لمحے چپکے نہیں بیٹھے۔ انفراد کا یہ پہلو ان کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو تھا جو اب محض ہمارے تصور کی زینت ہے۔ دیکھیے یہ خالی جگہ کس طرح اور کب پُر ہوتی ہے۔ خلیق صاحب پردۂ غیاب میں ضرور چلے گئے ہیں، لیکن وہ اپنے لفظوں اور اردو گھر کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک ذرّے میں آج بھی زندہ ہیں۔

❑❑

رضا علی عابدی

خلیق انجم، علم کی دولت چھوڑ کر گئے

اردو پر عجب وقت آن پڑا ہے۔ اس زبان کے کیسے کیسے سر پرست اٹھتے جا رہے ہیں۔ چل چلاؤ تو سدا سے جاری ہے مگر اس طرف تو یوں لگتا ہے کہ ہماری اس زبان پر سناٹا طاری ہونے کو ہے۔ خلیق انجم کے ہونے سے بڑی ڈھارس بندھی تھی، وہ بھی چل بسے۔ اردو زبان کو جیسے انھوں نے سنوارا اور نکھارا، اردو والے ہی جانتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد اس میدان میں ہمارے دانش ور خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ بس اتنا ضرور ہے، اور یہ خیال آتا ہے تو جبینِ عقیدت آپ ہی آپ جُھک جاتی ہے کہ یہ جانے والے بڑا کام کر گئے۔ غضب کا علم سمیٹا اور پھر اس میں ہمیں حصہ دار بنا کر گئے۔ اسی کو صدقۂ جاریہ کہتے ہیں۔

اور خلیق انجم کے کام کا کوئی شمار ہے؟ عمر بھر لکھتے رہے اور وہ بھی تحقیق کے جا بجا بکھرے ہوئے موتی بٹور کر۔ اوپر سے یہ کہ اپنی اس ساری مشقت کو اتنے سلیقے اور ہنرمندی سے کتاب کے ورق پر بکھیر گئے کہ علم کی آنکھیں بھی منور ہوتی ہیں اور ذہن کے دریچے بھی۔ ان علم و حکمت کے جواہر کی بات ذرا دیر بعد، پہلے ان لمحات کو یاد کر لیا جائے جو میں نے خلیق انجم کے ساتھ گزارے۔

جب کبھی لندن آتے، بی بی سی کی اردو سروس ضرور آتے اور پھر جو احباب کی محفل سجتی تو منظر یہ ہوتا کہ درمیان بیٹھے، خالص دلّی کے لب و لہجے میں وہ شگفتہ باتیں کر رہے ہوتے اور اہلِ مجلس لطف اٹھا رہے ہوتے۔ ایک بار تو بڑی شان سے آئے۔ ہوا یہ کہ ان کے ساتھ صدیق

الرحمٰن قدوائی اور دارالمصنّفین کے عظیم دانش ور سید صباح الدین عبدالرحمٰن بھی تھے۔ یوں لگا کہ بی بی سی کی عمارت بش ہاؤس میں علم و دانش کا سمندر در آیا۔ تینوں ہستیاں اردو کے اور علمیت کے میدان کے شہ سوار اور ان کی باتیں ایسی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ خوب رنگ جما، انٹرویو ہوئے، زبان کی بات ہوئی، تاریخ کی گفتگو ہوئی، رسالہ معارف، جس کا سید صباح الدین سے گہرا تعلق تھا، اس کی اعلا خدمات کا ذکر ہوا اور میرے لیے یہ بات کسی اعزاز سے کم نہ تھی کہ ان کے ساتھ میرا جو جذباتی تعلق تھا وہ قریبی رشتے میں بدل گیا۔ پھر میرا جب بھی دلّی جانا ہوا، خلیق انجم اور قدوائی صاحب کے ساتھ یادگار وقت گزرا۔

یہ سنہ پچاسی کی بات ہے جب میں ریڈیو کے لیے جرنیلی سڑک کے عنوان سے دستاویزی پروگرام تیار کر رہا تھا۔ پشاور سے کلکتے تک کیسے کیسے تاریخی پڑاؤ آتے ہیں، سبھی جانتے ہیں لیکن ان مقامات کو دیکھنا اور جاننا آسان نہ تھا، اور پھر سب سے بڑھ کر دلّی۔ اس وقت سوچیے کون میری مدد کو آیا۔ خلیق انجم، جو نہ صرف یہ کہ خالص دلی والے تھے بلکہ قدیم دلّی کے کھنڈروں کی ایک ایک اینٹ سے واقف تھے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر چلے اور اس عظیم شاہراہ کے معمار شیر شاہ سوری سے تعلق رکھنے والا ایک ایک گوشہ دکھایا۔ میرے پروگرام میں ان کی آواز خوب خوب محفوظ ہے، وہی دلّی کے مخصوص لہجے کے ساتھ۔ پھر یہ کہ ان کے نام کے ساتھ لفظ خلیق لگا ہے تو یوں ہی تو نہیں۔ جب تک میں ان کے شہر میں رہا، انھوں نے میرا خیال رکھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ وہ بھی سنہ انیس سو پینتیس میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہ خلیق احمد خان تھے۔ انھوں نے اعلا تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی پھر وہ کروڑی مل کالج دہلی میں لیکچرر ہوئے اور دس سال وہاں اردو پڑھائی۔ سنہ ستر میں دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی جس کے لیے انھوں نے اردو کے شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں پر تحقیق کی پھر وہ بھارت کی وزارتِ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور اردو کے فروغ کے لیے قائم ہونے والی اندر کمال گجرال کمیٹی کے رکن بنے جس کے لیے انھوں نے ملک کے سارے ہی علاقوں کا دورہ کیا اور اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کے نتیجے میں تیرہ ریاستوں میں اردو اکادمی کے نام سے جو ادارے قائم ہوئے وہ اب تک قائم ہیں۔ 1974 میں انھیں انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت انجمن کا حال اچھا نہ تھا۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی اور باقی وہ سب کچھ تھا جو بدنظمی میں ہوا کرتا ہے۔ اب وہاں اردو گھر کے نام سے شاندار عمارت کھڑی ہے۔ یہ ادارہ

مسلسل اردو رسالے اور کتابیں چھاپ رہا ہے۔

اب ہم آتے ہیں خود خلیق انجم کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرف جنھیں شمار کرنا بھی مشکل ہے لیکن ان کی سب سے اہم کتابوں میں 'متنی تنقید' کمال کے درجے کو پہنچی ہے جو اعلا ترین جماعتوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ موضوع یہ ہے کہ متن کو کیسے پرکھا جائے، کیوں کر اس کی تدوین کی جائے اور توضیح کیسے ہو اور کس طور پر متن کو ترتیب دیا جائے۔ خلیق انجم کا دوسرا کارنامہ وہ پانچ جلدیں ہیں جن میں انھوں نے مرزا غالب کے تمام دستیاب خط یک جا کر دیے ہیں۔ اوپر سے تمام حاشیے اور وضاحتیں ان کی تحقیق کا بے مثال نمونہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تین کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ''غالب کا سفرِ کلکتہ''، ''غالب کچھ مضامین'' اور ''غالب اور شاہانِ تیموریہ''۔

دلی کے کھنڈروں کا حال آپ پڑھ چکے۔ اس میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی تین کتابیں، مرقعِ دہلی، دلّی کے آثارِ قدیمہ اور درگاہِ شاہ مرداں شہر کی قدیم عمارتوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ اس سے بھی بڑا کمال انھوں نے یہ کیا کہ سرسید احمد خاں کی تاریخ ساز کتاب 'آثار الصنادید' کو ترتیب دیا، سنوارا نکھارا اور جدید زمانے کے قاری کو تین جلدوں میں پیش کیا۔

اردو زبان سے ان کے لگاؤ کو بیان کرنا دشوار ہے۔ اس بارے میں ان کی جو رائے تھی، آخر دم تک اس پر قائم رہے۔ ہمارے اردو کے استاد ڈاکٹر رؤف پاریکھ سے ایک ملاقات میں انھوں نے کہا تھا کہ اردو کبھی مر نہیں سکتی۔ اپنی طویل تاریخ میں یہ کتنی ہی آزمائشوں سے بچ نکلی اور ابھی اور کئی آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ یہ اپنی راہیں خود تراشے گی اور دنیا میں ہر جگہ پھولے پھلے گی۔ میں اردو اور اس کے مستقبل کے معاملے میں بہت پُر امید ہوں۔ بھارت میں اردو کا کیا حال ہوگا، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہاں اردو کا مستقبل اسی قدر خطرے میں ہے جتنا ہندی کا ہے۔ اردو زبان کو یہ خطرہ انگریزی سے ہے جو دونوں ہی ملکوں میں ترجیحی زبان ہوتی جا رہی ہے۔ مالدار طبقہ اب انگریزی ہی بولتا ہے اور اس پر اتراتا بھی ہے۔ یہ جو دنیا سکڑ رہی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ انگریزی کو برتری حاصل ہو رہی ہے۔ یہ کتنی ہی زبانوں کو تباہ کر رہی ہے اور لوگوں سے ان کی مادری زبان چھین رہی ہے۔ کچھ بھی ہو، میں یہی کہوں گا کہ اردو ساری آزمائشوں کو پھلانگ جائے گی۔

پاکستان کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہاں اردو کا حال قدرے بہتر ہے کیوں کہ یہ ایک مشترک زبان ہے جو پورے ملک کو یکجا رکھتی ہے۔اس کے علاوہ یہاں اردو کی مخالفت نسبتاً کم ہے اور اردو سے لگاؤ رکھنے والے بہت ہیں۔ بھارت میں اردو کتابیں ہندی رسم الخط میں چھاپنے کے رواج کی بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ بھی ایک مجبوری ہے۔لوگ غالب کو اور فیض کو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتے۔انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اس میں اردو کا کوئی نقصان نہیں کیوں کہ اس طرح اردو کتابیں مقبول ہو رہی ہیں۔البتہ اردو رسم الخط تبدیل کرنے کا خیال بھی دل سے نکال دینا چاہیے۔ اردو رومن حروف میں لکھی جائے، میں اس کا بھی مخالف ہوں۔

ادب کے معیار کی بات چلی تو خلیق انجم نے کہا مجھے پاکستان میں اردو کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی تحقیق اور تنقید کا معیار ہندستان میں کہیں اونچا ہے۔البتہ پاکستان میں تخلیقی ادب کا حال بہت بہتر ہے۔ پاکستان میں ادیب اور شاعر بہت آگے ہیں لیکن بھارت میں دانش ور بہتر کام کر رہے ہیں۔وہاں تحقیق کی روایت صدیوں پرانی ہے، کتاب خانے ہیں، کلاسیکی تحریریں محفوظ ہیں اور چھان بین کے اسباب زیادہ ہیں۔اس ملاقات کے آخر میں خلیق انجم نے کہا کہ بھارت سے آنے والوں کی پاکستان میں جو آؤ بھگت ہوتی ہے وہ دلوں میں جگہ کر لیتی ہے۔ایسے میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ یہاں میرے میزبان کبھی بھارت آئیں تو یہاں جیسی میزبانی کی توقع نہ رکھیں۔

ہم تو یہ جانتے ہیں کہ کیا یہاں اور کیا وہاں، خلیق انجم، آپ ایک بہتر ٹھکانے کو سدھار گئے ہیں۔ ○○

فاروق بخشی

ڈاکٹر خلیق انجم — کچھ یادیں کچھ باتیں

خلیق انجم صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ دہلی آنے سے کئی سال قبل شروع ہو چکا تھا مگر وہ پہلی ملاقات تھی بڑی جان لیوا۔ اس دن ہی ان کی شخصیت اور مزاجی کیفیت سے کسی حد تک آگاہی ہو چکی تھی۔ ہوا یوں کہ میرٹھ کالج میں استادِ محترم ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے اردو تقریب کا اہتمام کیا۔ ہمیشہ کی طرح میرے کاندھوں پر یہ ذمہ داری تھی کہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر شریف احمد اور ڈاکٹر مغیث الدین کے ہمراہ ڈاکٹر خلیق انجم کو لے کر میرٹھ پہنچوں۔ میں مقررہ وقت پر دریا گنج والے گھر سے انھیں اور دیگر اساتذہ کو ساتھ لے کر میرٹھ کے لیے روانہ ہوا۔ خلیق انجم صاحب نے دورانِ گفتگو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ لنچ میں کس طرح کا کھانا پسند کرتے ہیں۔ میرٹھ کے جس ہوٹل میں لنچ کا اہتمام تھا وہ بہت معقول تھا مگر سامانِ خورد و نوش میں دسترخوان پر ان اشیا کی کمی تھی جس کی طرف انھوں نے دورانِ سفر اشارہ کیا تھا بقیہ تینوں اساتذہ کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ سو خلیق انجم صاحب کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔ لنچ سے فراغت کے بعد میرٹھ کالج پہنچے اور جلسے کا آغاز ہوا۔

شاہین صاحب اپنے تینوں اساتذہ کے تعارف میں اس قدر رطب اللسان ہوئے کہ خلیق انجم صاحب کا تعارف کرانا بھول گئے۔ میرے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ میں نے شاہین صاحب کو اشارہ کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ خلیق انجم صاحب اپنا تمتمایا ہوا سا چہرہ لے کر جلسہ گاہ سے اُٹھنے کو ہی تھے، مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ روہیلہ آج دلی کی طرح

میرٹھ کو بھی تاراج کر کے چھوڑے گا۔ میں نے سارے جہان کی ہمت مجتمع کر کے دخل در معقولات کے تحت استادمحترم ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین سے معذرت کرتے ہوئے دومنٹ کے لیے مائک پر آنے کی التجا کی۔ شاہین صاحب کو معاملے کی نزاکت کا اندازہ خلیق انجم صاحب کے ہاؤ بھاؤ سے ہو چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہ اور جوڑ دیا کہ فاروق بخشی مائک پر آ کر اپنے فرائض کی انجام دہی کریں۔ مجھے جتنی بہتر سے بہتر اردو آتی تھی اس کے تمام الفاظ خلیق انجم صاحب کی تعریف وتوصیف میں صرف کر دیے۔ اردو کا جادو اثر دکھانے لگا تھا۔ چہرے کی سرخی اور تمتماہٹ گلابی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ چشمے کے پیچھے سے ان کی ذہین آنکھوں میں ہلکا ہلکا تبسم لہرانے لگا۔ تقریب کا اختتام بڑے خوش گوار ماحول میں ہوا اور یوں میرٹھ اس روہیلے کے غیظ وغضب کا شکار ہونے سے رہ گیا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی مگر انھوں نے اس تقریب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور میں اس مغالطے میں تھا کہ وہ دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ قدرت کا کرنا دیکھیے کہ شاہین صاحب کا آناً فاناً میں انتقال ہو گیا۔ بطورِ خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جلال انجم اور میں نے شاہین صاحب پر ایک کتاب مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ طباعت کے اخراجات کی تمام ذمہ داری ہمارے ہم سبق ڈاکٹر نسیم بخاری صاحب دہلوی نے بہ خوشی اپنے سر پر لی تھی۔ اب جلال انجم اور میرے سامنے شاہین صاحب پر مضامین لکھوانے کا مرحلہ سب سے کٹھن تھا۔ نارنگ صاحب، قمر رئیس صاحب، عنوان صاحب اور دہلی کے دیگر اکابرین سے درخواست کی۔ سب نے مقررہ وقت پر تحریریں بھجوانے کا وعدہ کیا اور مضامین ہمیں دے بھی دیے۔

جلال انجم چاہتے تھے کہ خلیق انجم صاحب سے بھی گزارش کی جائے مگر سابقہ معاملات کی وجہ سے مجھے ہچکچاہٹ تھی۔ بہر حال انجمن کے دفتر میں حاضر ہوئے۔ ان کی گفتگو نے ہمارے تمام اندیشوں کو خارج کر دیا اور جلد از جلد مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا اور پھر نبھایا بھی کہ ان کا مضمون جو شاملِ کتاب ہوا کئی دوسروں سے بہتر ہے اور مجھے اندازہ ہوا کہ کسی مذہب، رنگ، نسل سے چیزوں کو دیکھنا کس قدر گھٹیا فعل ہے۔ یقیناً انھیں غصہ آتا تھا سب دلی والے جانتے تھے کہ وہ گفتگو میں کیسے بے باک ہیں مگر ان کے دل میں بغض وکینہ نام کو بھی نہیں تھا۔ خود اپنی جدوجہد اور محنت سے اس مقام تک پہنچے تھے اس کی تفصیل مطلوب ہو تو ڈاکٹر اسلم پرویز سے ملیے۔ ان دونوں کی جگل جوڑی کل دہلی میں مشہور تھی، یاری رشتہ داری میں بھی تبدیل ہوئی

مگر محبت کا وہ بندھن جو دونوں نے اپنے ابتدائی ایام میں باندھا تھا دمِ آخر تک قائم رہا۔ دہلی کے خوں آشام حالات اور آزادی کے بعد رونما ہونے والی کسمپرسی اردو زبان وادب اور تہذیب پر ٹوٹ پڑنے والی بے چارگی کے وہ محض تماشائی نہیں بلکہ از خود اس کا حصہ تھے۔

دسمبر 1980 میں میرٹھ سے دہلی منتقل ہوا تو ہم نوجوانوں نے جن میں ابنِ کنول تھے، ارتضیٰ کریم تھے، توقیر احمد خاں اور جلال انجم تھے، محمود فیاض اور چندر شیکھر بھی تھے، ایک ادبی انجمن 'قلم زاد' کی بنیاد ڈالی۔ قمر رئیس صاحب کی سرپرستی حاصل تھی۔ جلسے کہاں کیے جائیں۔ میں، ارتضیٰ کریم اور ابنِ کنول خلیق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے بغیر کسی تکلف انجمن کا ہال ہمیں جلسوں کے لیے دینے کا وعدہ کرلیا اور وعدہ اس طرح نبھایا کہ جلسے کے بعد حاضرینِ جلسہ کی ضیافت کا اہتمام بھی انہی کی جانب سے ہوتا تھا۔ قلم زاد کا قیام، اس میں تمام بڑے دانشوروں اور ادیبوں کی آمد، ہماری ذہنی اور ادبی تربیت کا حصہ بنے اور اس میں بڑا ہاتھ تو خلیق انجم صاحب کا تھا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) ان کی قیادت میں محض کتابیں چھاپنے اور فروخت کرنے کا ادارہ نہیں تھا۔ انھوں نے اسے ایک فعال اور متحرک ادارے میں تبدیل کر دیا تھا۔ گجرال کمیٹی کے زمانے کی جدوجہد ہو یا گجرال صاحب کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں سردار جعفری کمیٹی کی تگ و دو۔ سب میں خلیق انجم کی حیثیت اردو کے ہراول دستے کے جانباز کی سی تھی۔ ان تمام کارروائیوں کے باوجود ان کا تحقیقی مشن جاری رہتا تھا۔ اس میں ادبی تقریبات کے انتظام وانصرام سے لے کر قلم کا سفر بھی جاری رہتا۔

1980-81 میں دہلی میں اردو اکادمی کے قیام کی جدوجہد شروع ہوئی۔ خلیق انجم صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ شریف الحسن نقوی صاحب جیسا تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص دہلی اردو اکادمی کا پہلا سکریٹری مقرر ہوا۔ خلیق صاحب نے ہمیشہ اردو اکادمی کے ایک فعال رکن ہونے کا ثبوت دیا۔ انہی کے مشورے سے نقوی صاحب نے دلی والے جیسے سمینار کی بنیاد ڈالی اور خلیق صاحب نے ڈاکٹر صلاح الدین کو تیار کیا کہ وہ اس سمینار کی قیادت کریں۔ ڈاکٹر خلیق انجم دہلی اور دہلی والوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ اچھی خاصی اردو چھوڑ کر وہ غیظ و غضب کے عالم میں کرخنداری پر آنے میں بھی دیر نہیں لگاتے تھے۔ انہی کے مشورے پر نقوی صاحب نے مرزا فرحت کے تمثیلی مشاعرہ کو پیش کرنے کا ارادہ کیا حالانکہ ابتدا میں نقوی صاحب تذبذب کے شکار تھے کیوں کہ اکادمی کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور پروجیکٹ

کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت تھی اور پھر اس مشاعرے کے کرداروں کا انتخاب ایک بڑا مسئلہ تھا۔

شریف الحسن نقوی صاحب نے یہ بارِ گراں خلیق صاحب کے کاندھوں پر ڈال دیا اور اس ناتواں نے (حالانکہ وہ ناتواں نہیں تھے) اس بارِ گراں کو ایسے اٹھایا کہ وہ تمثیلی مشاعرہ تاریخ ساز ثابت ہوا۔ دہلی کی تینوں دانش گاہوں کے اساتذہ نے اس میں مختلف شاعروں کے کردار ادا کیے تھے۔ نوجوانوں میں ابنِ کنول، ارتضیٰ کریم، محمود فیاض، چندر شیکھر اور بھی کئی دوسرے تھے۔ اس مشاعرے کے کئی لطیفے ہیں جنھیں سنانے کو جی چاہتا ہے۔ مشاعرے کو ڈائرکٹ کرنے کے لیے فلم ڈائرکٹر ہمت رائے شرما کو بمبئی سے بلایا گیا تھا۔ ان دنوں اکادمی کا دفتر آصف علی روڈ پر ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا وہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ تیس پینتیس لوگوں کی سمائی ہو سکے اور ریہرسل ہو سکے۔ لہٰذا دریا گنج میں بس آتی تھی اور سب اس میں سوار ہو کر مہرولی میں قطب صاحب جا کر بڑے خاموش ماحول میں ریہرسل کرتے۔ تمثیلی مشاعرے کا پہلا شو بھی پھول والوں کی سیر کے موقعے پر ہوا جس میں اس زمانے کے نائب صدر جمہوریہ مہمانِ خصوصی تھے جو بعد کو صدر جمہوریہ بھی بنے۔ شو کامیاب رہا۔ پھر فلّی آڈیٹوریم میں اس کا دوسرا شو ہوا جو پہلے سے بھی کامیاب تھا۔ مشاعرے کی ریہرسل شروع ہوئی تو مجھے حکیم مومن خاں کا کردار دیا گیا تھا۔ غالب گمان یہ تھا کہ مومن ایک مترنم شاعر تھے اور ان دنوں میں اچھے خاصے ترنم سے دہلی کے مشاعرے لوٹتا تھا۔ مگر خلیق صاحب نے مشورہ دیا کہ فاروق بخشی کو غیر معروف کردار دیا جائے تاکہ یہ ترنم کے زور پر اسے مقبول بنا سکیں۔ ان کا مشورہ کامیاب ثابت ہوا۔ مجھے بال مکند حضور کا کردار دیا گیا جو دہلی کے بڑے ساہوکار تھے اور لال قلعہ اور بادشاہ ان کے قرض کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے۔ غزل بہت کامیاب رہی اور خلیق صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی بڑے مسکراتے ہوئے کہتے کہیے حضور کیسی رہی۔

ان کی شفقت اور دردمندی، ہر دوسروں کی پریشانی محسوس کرنے کی عادت، یوں تو بہت سے قصے ہیں لیکن ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اکادمی کی تشکیل کے بعد وہ غالباً تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ ایک صاحب جو بہار کے رہنے والے تھے میرے پاس آئے کہا کہ میں ان کی سفارش خلیق انجم صاحب سے کروں۔ اردو اکادمی اُن دنوں دہلی کے اقلیتی اسکولوں میں اپنے خرچ سے اساتذہ کی خالی اسامیوں پر نئے لوگوں کو مقرر کرتی تھی۔

تنخواہ سرکار کے برابر تو نہیں لیکن معقول تھی۔ میں ان صاحب کو لے کر خلیق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خلیق صاحب نے کرم فرماتے ہوئے ان کی سفارش کی اور ان کا کام ہو گیا۔ چند روز بعد وہ صاحب دوبارہ تشریف لائے اور کہنے لگے میرا جن صاحبہ سے معاشقہ چل رہا ہے اگر انھیں بھی ملازمت مل جائے تو ہماری شادی خانہ آبادی کا راستہ ہموار ہو جائے، دہلی کے اخراجات کا علم تو آپ کو ہے ہی۔ میں خلیق صاحب کے پاس جاتے ہوئے کترا رہا تھا مگر ان صاحب نے اپنا کیس کچھ اس طرح بیان کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایک مرتبہ پھر خلیق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کل روداد سن کر مسکرائے کہنے لگے مان گئے بھئی شاعر ہو۔ دردِ دل کی حقیقت سے واقف ہو۔

دہلی میں غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کا قیام بھی ان کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جائے گا۔ خلیق انجم صاحب، ساغر نظامی صاحب کے حلقۂ ارادت منداں میں شامل تھے۔ سب جانتے ہیں ساغر صاحب کا تعلق نہرو خاندان سے کیسا تھا۔ پدم بھوشن سے نوازے گئے تھے۔ سرکاری حلقوں میں ان کا احترام تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی جیسا مشکل کام خلیق صاحب کی تگ و دو کی بدولت اتنی آسانی سے ہو گیا۔ ان کا خواب تھا کہ دہلی میں اردو کے شعرا اور ادبا ایک جگہ رہیں۔ خواب تعبیر تک پہنچا بھی۔ کچھ لوگوں نے وہاں رہنا بھی شروع کیا مگر سب ادیب تھے شاعر تھے۔ تعمیرات کی نزاکتوں اور باریکیوں سے ناواقف۔ غالب ہاؤسنگ سوسائٹی ادیبوں کی ہوتے ہوئے بھی ادیبوں کی نہ ہو سکی۔

خلیق انجم صاحب ادیب تھے، محقق تھے، متوازن نقاد تھے، اچھے نثر نگار اور اس سے بھی اچھے خطیب اور مقرر۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کو انھوں نے ایک فعال ادارے کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اب شاید ہی کبھی بھر پائے۔ حق مغفرت کرے۔

ٹی.آر.رینا

ڈاکٹر خلیق انجم

چند ملاقاتیں، چند باتیں، چند یادیں

انسانی زندگی میں سولھواں سال جوانی کی اُٹھان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصل میں عہدِ شباب کا یہ ابتدائی سال ہوتا ہے جس میں جذبات، اُمنگیں، احساسات، محسوسات اور تصورات عروج پر ہوتے ہیں۔ خوابوں میں بہاریں ہی بہاریں نظر آتی ہیں، مگر اکیسویں صدی کا یہ سولھواں سال ہمارے برصغیر ہندو پاک کی ادبی دنیا کے لیے کسی بے رحم خزاں سے کم نہیں رہا۔ بڑے بڑے ادبی تناور درخت زمین بوس ہوکر پیوندِ خاک ہوگئے یا نذرِ آتش۔ اس سال کے رفتگاں کی فہرست طویل ہے، پھر بھی چند حضرات کے نام درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں، مثلاً: ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ)، جوگندر پال (دہلی)، پروفیسر اسلوب احمد انصاری (علی گڑھ)، شکیل الرحمٰن (دہلی)، اسلم محمود (لکھنؤ)، فرید نعمانی (رامپور)، انتظار حسین (لاہور)، ندا فاضلی (ممبئی)، عابد سہیل (لکھنؤ)، رویندر کالیا (دہلی)، شرف رحمانی گنوری (گنور)، زبیر رضوی (دہلی)، انور سدید (کراچی)، عبدالرحمٰن شوق مانوی (دہلی)، پیغام آفاقی (دہلی)، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ (دہلی)، پروفیسر شمیم نکہت (لکھنؤ)، ڈاکٹر صلاح الدین (دہلی)، ادا جعفری (کراچی)، مہاشویتا دیوی (کولکاتا)، نیلا بھا اشک (دہلی)، ریوتی سرن شرما (دہلی) اور ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)۔ یہ سبھی اپنے اپنے میدان کی معروف شخصیات تھیں۔ جب بھی کوئی ادبی شخصیت اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتی ہے تو ادب سے تعلق رکھنے والوں کے ذہن ضرور متاثر ہوتے ہیں:

کس کو روئیں کس کا غم کریں
عدم کا یہ قافلہ رواں دواں ہے

ایک دن میں نے انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر کے دفتر جناب عبدالرشید (کمپیوٹر کمپوزر) کو اپنے کام کے سلسلے میں فون کیا، بات ختم ہونے سے قبل اُنھوں نے مجھ سے پوچھ لیا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کا انتقال ہو گیا ہے؟ میں نے کہا ارے بھائی نہیں تو! 'ہماری زبان' کا جو شمارہ (21-15 اکتوبر 2016) آیا ہے، اُس میں تو ایسی کوئی خبر نہیں اور 28-22 اکتوبر کا شمارہ ابھی آیا نہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ ہفت روزہ 'ہماری زبان' کا ہر شمارہ چند دن پہلے چھپ جاتا ہے، اس لیے ان شماروں میں یہ خبر نہیں چھپی۔ اُن کا انتقال 18 اکتوبر کو ہوا ہے۔ میں نے دوبارہ سوال کیا کہ اُن کی تدفین کب ہوئی؟ انھوں نے جواب دیا، اُسی دن شام کے وقت۔ میں نے پھر اُن سے پوچھ لیا کہ اُن کا بیٹا تو شاید بدیش میں کہیں کام کرتا تھا؟ ہاں وہ آ گیا تھا۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ کیسے کیسے لوگ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔

میرے مراسم مرحوم سے مارچ 2006 سے بہ ذریعۂ خط شروع ہوئے تھے۔ 26 فروری کو جناب رشید حسن خاں کا انتقال ہوا تھا۔ راقم نے ''رشید حسن خاں کے خطوط مشاہیرِ ادب کے نام'' کے عنوان سے ایک اشتہار ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا۔ میری پہلی ملاقات اُن سے ان کے دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) میں ہوئی۔ میں مع اپنی شریکِ حیات گُرو پورنیماں پر کانپور گُرو جی کے پاس گیا ہوا تھا، واپسی پر جب ہم دہلی پہنچے تو بیگم صاحبہ کو اُن کے ماموں کے ہاں سبھاش نگر چھوڑا اور وہاں سے سیدھا انجمن کے دفتر پہنچا۔ چپراسی سے پوچھا صاحب اندر ہیں؟ اُس نے ہامی بھری۔ میں نے کاغذ پر اپنا نام لکھ دیا۔ وہ اندر گیا اور آتے ہی کہا آپ اندر جا سکتے ہیں۔ جوں ہی میں اندر داخل ہوا، انجم صاحب نے کرسی سے اٹھ کر ہی مصافحہ کیا اور سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔ چپراسی پانی لے کر آ گیا۔

ہماری بات چیت شروع ہوئی۔ اُنھیں میرے خطوط کے ذریعے پہلے سے ہی یہ علم تھا کہ میں مرحوم رشید حسن خاں کے خطوط جمع کر رہا ہوں اور انھیں مرتّب کر کے شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات سے وہ بہت خوش تھے کہ میں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا یہ بات آپ کو کیوں کر سوجھی اور آپ خاں صاحب کو کیسے جانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جناب یہ تو میں نہیں جانتا کہ اُن کے خطوط جمع کرنے کی بات مجھے کیوں کر سوجھی، شاید یہ کسی غیبی طاقت کا کرشمہ ہے۔ ہاں جناب رشید حسن خاں سے پہلی ملاقات جولائی 1980 میں تعطیلات کے دوران، دہلی یونیورسٹی کے گائر ہال میں ہوئی تھی۔ اُس وقت میں ''پنڈت میلا رام وفا: حیات و خدمات'' پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میرا ہی ایک عزیز دوست ایم. ایل. پروانہ، پروفیسر عابد پیشاوری کے ہمراہ

دہلی آئے تھے مواد کی تلاش کے سلسلے میں۔ خاں صاحب و عابدؔ صاحب آپس میں دوست تھے، اس لیے انھوں نے ہم دونوں کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے کام سے متعلق مشورہ کرنے کے لیے کہا۔ پروانہؔ صاحب ''داستانِ ہفت سیّاح'' مرتّب کر رہے تھے۔ ایسے کام خاں صاحب سے بہتر کون کر سکتا تھا، لہٰذا ہم اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، اُنھوں نے ہمارے کاموں سے متعلق بہت سے مشورے دیے۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ اُن سے جاری ہو گیا۔ ہمیں جب بھی اپنے اپنے کام سے متعلق کچھ پوچھنا ہوتا ہم اُنھیں خط لکھتے، وہ فوراً جواب دیتے اور ہماری مشکل آسان کر دیتے۔ وہ تین مرتبہ جمّوں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر جموں تشریف لائے۔ پہلی بار تین ہفتوں کے لیے اپریل 1983 میں، دوسری بار چار ہفتوں کے لیے یکم تا 30 ستمبر 1995 اور تیسری بار تین ہفتوں کے لیے 26 جنوری تا 14 فروری 1990۔ یونیورسٹی میں ہر روز ان کے لکچر کے دوران حاضری ہوتی اور شام کے وقت ہمراہ پروفیسر عابدؔ پیشاوری ہم دونوں بھی یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ان کے کمرے میں حاضر ہوتے اور رات دیر تک ادبی گفتگو جاری رہتی۔ اُنھوں نے ہی اپنے پہلے سفر کے دوران مجھے ''پنڈت میلا رام وفا: حیات و خدمات'' کا پہلا باب لکھنے کو کہا (مواد تو میں پہلے سے ہی جمع کر چکا تھا، لیکن ترتیب نہیں دے پایا تھا) اور صرف ایک دن کی مہلت دی کہ کل شام چار بجے تک وہ میرے گیسٹ ہاؤس کے کمرے کے ٹیبل پر ہونا چاہیے۔ میں نے اُن کے حکم کے مطابق عمل کیا، دوسرے دن ٹھیک چار بجے میں پہلا باب لے کر حاضر ہوا۔ اُنھوں نے اسے ٹیبل پر رکھنے اور واپس جانے کے لیے کہا۔ دوسرے دن شام کے وقت جب ہم گیسٹ ہاؤس پہنچے تو وہ پہلے باب کے صفحات دیکھ چکے تھے۔ آخر میں اُنھوں نے اپنے قلم کی سیاہ روشنائی سے یہ نوٹ لکھا تھا: ''اسی طرح کام کرتے رہو گے تو جلد مکمل ہو جائے گا، میں آپ کے کام سے خوش ہوں''۔ حضور! وہ اوراق میں نے آج تک سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔

جب وہ حیات تھے میں دو بار اُن کے دولت کدے پر حاضری دے آیا ہوں۔ ایک بار میں اپنی شریکِ حیات کے ساتھ گُرو پورنیماں پر گُرو جی کے قدموں میں حاضری دینے کانپور جا رہا تھا کہ ہم نے شاہجہان پور کا راستہ اختیار کیا، 10 جولائی 2003 کو ہم شاہجہان پور ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ہماری پھوپھی جان کا پوتا وہاں فوج میں آفیسر تھا، اُس نے اسٹیشن گاڑی بھیج دی تھی، بارش زوروں کی ہو رہی تھی۔ گاڑی ہمیں اُس کے گھر لے گئی۔ شام کے وقت وہ ہمیں باڑوزئی دوم رشید حسن خاں صاحب کے گھر لے گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر میں اُن کے دونوں بیٹے، دونوں بہوئیں اور پوتی و پوتا ڈرائنگ روم میں ہی جمع ہو گئے۔ عمدہ کوالٹی کی چائے و

مٹھائی وغیرہ سے ہماری تواضع کی گئی۔غروبِ آفتاب تک ہم اُن کے ساتھ رہے۔ میں اپنا کیمرہ ساتھ لے گیا تھا۔ بہت سی تصویریں اُتاری گئیں، آخر اجازت لے کر چلنے لگے تو وہ دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔

اتنی دیر میں ڈاکٹر خلیق انجم نے چائے منگوالی۔ہم دھیرے دھیرے چائے پیتے جارہے تھے اور گفتگو ہوتی جارہی تھی۔ ہاں تو جناب دوسری بار 3 نومبر 2005 کو میں اکیلا اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس بار میں ان کا ویڈیو انٹرویو لینا چاہتا تھا۔سردی شدت کی پڑ رہی تھی، خاں صاحب کی صحت اچھی نہیں تھی، وہ زیادہ دیر کے لیے بیٹھ نہیں سکتے تھے اور بات کرنے میں بھی تکلیف محسوس کررہے تھے۔رمضان کا آخری دن تھا۔شام کو ویڈیو کا انتظام بھی نہ ہوسکا۔خاں صاحب نے اس پروگرام کو آئندہ گرمیوں میں اٹھا رکھنے کو کہا۔ دوسرے دن 4 نومبر کو عید تھی۔ جب میں اُن سے رخصت لے کر چلنے لگا تو میری چھٹی حس نے کہا شاید آئندہ گرمیوں تک خدا جانے کیا ہو۔رات کو وہاں ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا اور 4 نومبر کو بہ راستۂ لکھنؤ میں کانپور کے لیے روانہ ہوگیا۔

باتوں باتوں میں میں نے خلیق صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا یہ بات درست ہے کہ آپ، ڈاکٹر اسلم پرویز اور خاں صاحب ادبی دنیا میں ایک ادبی مثلث کے طور پر مشہور تھے۔اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا کہ بھائی! دہلی میں 36 برس کا ساتھ رہا۔دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بہ طورِ اسسٹنٹ لائبریرین خاں صاحب کو لانے سے قبل خواجہ احمد فاروقی صاحب نے مجھے ان کے سبھی مضامین پڑھنے کے لیے کہا تھا جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔میں ان کی علمیت سے بے حد متاثر تھا۔شعبے میں آنے کے بعد برسوں ہمارا ساتھ رہا۔ چاہے وہ سمیع اللہ کی دکان ہو یا Friends Tee Stall، جس کا نام ہم نے چنڈوخانہ رکھ چھوڑا تھا، یونیورسٹی کا کافی ہاؤس ہو یا کناٹ پلیس، ہماری اکثر شامیں ساتھ گزرتیں۔اُن کے دہلی آنے کے ابتدائی دو سالوں میں مَیں کنوارا تھا اور وہ شادی شدہ۔

باتوں باتوں میں میں نے ان سے رشید حسن خاں مرحوم کے خطوط کی فرمائش کی۔انھوں نے فرمایا کچھ تو انجمن کی لائبریری میں ہوں گے اور کچھ گھر پر۔ میں انھیں تلاش کروں گا اور یہ آپ تک پہنچیں گے ضرور۔

انجم صاحب نے انیس احمد صاحب کو بلایا جو خطوط سیکشن کے انچارج ہیں اور کہا دیکھو یہ رینا صاحب ہیں، جموں سے آئے ہیں۔مرحوم رشید حسن خاں صاحب کے خطوط جمع کر کے مرتّب کرنا چاہتے ہیں۔کیا خطوط سیکشن میں خاں صاحب کے خطوط میرے نام کے علاوہ دوسرے حضرات

کے بھی موجود ہیں؟ انیس صاحب نے کہا ضرور ہوں گے جناب، مگر تلاش کرنے پڑیں گے۔ انجم صاحب نے ان سے کہا کہ آپ انھیں ساتھ لے جائیں اور فائلیں نکال کر دیکھیں، ایک دو آدمیوں کو اور ساتھ لے لیں تاکہ وہ کام تھوڑا جلد ہو جائے۔ اٹھنے سے قبل میں نے ہفت روزہ 'ہماری زبان' کا 'رشید حسن خاں نمبر' نکالنے کا اصرار کیا، اس سے قبل بھی میں انھیں اسی سلسلے میں خط لکھ چکا تھا۔ کہنے لگے ہاں میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسا ہونا چاہیے، کوشش کرتا ہوں۔ خاں صاحب سے متعلق مضامین لکھوانا و جمع کرنا مشکل کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ 'ہماری زبان' کا نمبر خاں صاحب کی شایانِ شان ہو۔ مضامین اچھے حضرات کے لکھے ہونے چاہئیں۔ میں آداب کہہ کر انیس میاں کے ساتھ ہو لیا۔

یہ مجھے ساتھ لے کر خطوط سیکشن کے ساتھ والے کمرے میں آ گئے، وہاں دو حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ انیس صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں ایک امیر الحسن اور دوسرے محمد ہاشم رشیدی تھے۔ انھوں نے متعلقہ فائلیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ میں نے ان سے خطوط کی نشان دہی کرنا شروع کر دی۔ انھوں نے بھی میرا ساتھ دیا، تین چار گھنٹے وہاں رہنے کے بعد میں چلا آیا۔ انیس صاحب نے چلتے وقت فرمایا کہ ان کے زیروکس آپ کے گھر کے پتے پر پہنچ جائیں گے۔ میرے جموں پہنچنے کے ایک ماہ کے اندر ایک دن مجھے انجمن کی طرف سے ایک پیلے رنگ کا پیکٹ ملا۔ جب میں نے اسے کھولا تو اس میں خلیق انجم صاحب کے نام کے 72 خطوط کے عکس کے علاوہ چند زیروکس اور بھی موجود تھے۔ میں انھیں پا کر بے حد خوش ہوا۔ خط لکھ ان کا شکریہ ادا کیا۔

جب میں دوسری بار رشید حسن خاں صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا تھا تو ان کی لکھنے کی میز پر میں 'گنجینۂ معنی کا طلسم' کا 1700 صفحات پر مشتمل مسودہ مکمل رکھا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اسے خاں صاحب نے انجمن کے دفتر میں خلیق انجم صاحب کے پاس اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا۔

خاں صاحب کی حیات میں اس کا کچھ حصہ کمپوز بھی ہو چکا تھا۔ اگلے سال ماہ جولائی میں میں پھر انجمن کے دفتر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کے دوران میں نے انجم صاحب سے خاں صاحب کے مسودے کی رفتار سے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کام ہو رہا ہے۔ مسودہ ضخیم ہے وقت لگے گا۔

میں ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میں دہلی جاتا، انجمن کے دفتر میں خلیق صاحب سے ملاقات ہوتی، دیر تک باتیں ہوتیں۔ چائے پلائے بغیر انھوں نے کبھی نہیں آنے دیا۔

رشید حسن خاں صاحب کی وفات کے بعد 15 جولائی 2008 کو میں شاہجہان پور اُن کے

مزار پر حاضری دینے پہنچا۔ اُن کا بیٹا خالد حسن خاں مجھے برگد والی مسجد یا باڑوزئی اول کے پیشاوری والے قبرستان لے گیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اُس وقت وہاں تکیے دار گیسو شاہ موجود نہیں تھا، وہ اپنے گھر جا چکا تھا۔ خالد میاں نے گیٹ کھولا جو کالے کپڑے کی پٹّی سے بندھا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو ایک عجیب قسم کی خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ شعرا حضرات نے ایسی جگہوں کو شہرِ خموشاں کا نام دے رکھا ہے جو واقعی درست ہے۔ اندر کی زمین گیلی تھی۔ ایک دن پہلے بارش ہوئی تھی۔ پانو دھنس رہے تھے۔ مشکل سے ہم ایک بیری کے پیڑ کے پاس پہنچے جہاں رشید حسن خاں مرحوم اور اُن کے پائیں پہلو میں اُن کی بیگم آرام فرما رہے تھے۔ بیگم صاحبہ اور خاں صاحب کی آخری آرام گاہوں پر گھاس اُگ آئی تھی بلکہ پورا شہرِ خموشاں ہری گھاس سے لہرا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کی قبر ہموار ہو چکی تھی، ہاں خاں صاحب کی قبر کا اُبھار تھوڑا باقی تھا۔ میں نے خالد میاں سے اس قبر کو پکّا کرنے کے لیے کہا، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر آپ ایسا کریں تو میں پہلا شخص ہوں گا جو آپ کی مدد کرے گا۔ خالد میاں نے جواب دیا ''اسلامی قانون کے مطابق قبروں کو پکا نہیں کیا جاتا''۔ میں خاموش ہو گیا جب کہ اُسی قبرستان میں بہت سی پکی قبریں تھیں۔ بعض پر چار ستونوں کے سہارے چھت بھی ڈلی ہوئی تھی۔ ہندستان کی کتنی زیارت گاہیں: ہمایوں کا مقبرہ، شیر شاہ سوری کا مقبرہ، اکبر کا مقبرہ اور شاہجہاں و بیگم ممتاز محل کا مقبرہ اپنی شان اور فنِ تعمیر کے نمونے کے طور پر پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

رات ہوٹل میں قیام کیا، دوسرے دن وہاں سے لکھنؤ ہوتا ہوا کانپور چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد دہلی پہنچا اور سیدھا انجمن کے دفتر خلیق انجم صاحب سے ملنے چلا آیا۔ اُنھیں اپنی پوری داستان سنائی، اُن سے کہا'' آپ نے ذوقؔ کا مزار ڈھونڈ نکالا اور اسے یادگار کے طور پر بنوا دیا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب آپ کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اگر آپ ان کے مزار کو پکا کرنے کی کوشش کریں گے تو میں اپنی توفیق کے مطابق ضرور مدد کروں گا۔ یہ کام آپ آسانی سے کر سکتے ہیں''۔ انھوں نے فوراً جاوید میاں کو بلایا اور اُن سے کہا کہ دیکھیے رینا صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے بات دُہرائی۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا وہاں قیام کا کیا انتظام ہے۔ میں نے کہا انجم صاحب وہاں اسٹیشن کے ساتھ ہی اچھے سے اچھے ہوٹل ہیں۔ ویسے تو آپ صبح کی گاڑی سے جائیں تو شام کو لوٹ کر آ سکتے ہیں، نہیں تو وہاں قیام میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ انجم صاحب نے جاوید میاں سے یہ بات نوٹ کرنے کو کہا اور یاد کرانے کی بات بھی کہی۔ جاوید میاں نے ہماری دو تین تصویریں بھی کیمرے سے لیں۔ انجم صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا'' یہ کام ضرور ہوگا، ہم وہاں

جائیں گے''۔ میں اس یقین کے ساتھ ان سے اجازت لے کر چلا آیا کہ اب یہ کام ضرور ہو جائے گا۔ وقت گزرتا گیا مگر انجم صاحب کا یہ وعدہ وفا نہیں ہوا۔

22 فروری 2011 کو راقم کا مرتّب کردہ ''رشید حسن خاں کے خطوط'' کا پہلا مجموعہ، جس میں 61 مشاہیرِ ادب کے نام کے 1038 خطوط شامل ہیں اور جو 1055 صفحات پر مشتمل ہے، منظرِ عام پر آیا۔ میں نے اس کے نسخے سبھی جان کاروں کو بھیجے، خاص کر جن کے خطوط اس مجموعے میں شامل تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈاکٹر شمس بدایونی کا فون آیا، پوچھا کیا کتاب کا رسمِ اجرا ہو گیا؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ کہا چار نسخے غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی کے نام بھیج دیجیے اور ایک خط بھی کتاب کے رسمِ اجرا سے متعلق لکھ دیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اُنھوں نے بھی ماہلی صاحب کو فون کر دیا۔ اس طرح 25 مارچ 2011 کا دن اس کتاب کے رسمِ اجرا کا مقرر ہوا۔ عنوان تھا ''غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیرِ اہتمام شامِ شہرِ یاراں کے تحت ڈاکٹر ٹی. آر. رینا کی مرتّبہ کتاب 'رشید حسن خاں کے خطوط' کی رسمِ اجرا، مقررین: ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب شمس بدایونی اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ''۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمائی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی اور سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی بھی ڈائس پر موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے۔ کتاب کی رسمِ اجرا ڈاکٹر خلیق انجم کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے تقریر کی، ڈاکٹر شمس بدایونی اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے مقالے پڑھے۔ ڈائرکٹر ماہلی صاحب اور سکریٹری پروفیسر قدوائی صاحب نے خاں صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے میرے کام کی تعریف کی۔ آخر میں ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید حسن خاں صاحب مرحوم سے اپنے تعلقات اور ادبی کاموں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ رینا صاحب کا یہ کارنامہ نہایت ہی قابلِ تعریف ہے۔ ایسے کام بڑے بڑے ادبی ادارے انجام دیتے ہیں، مگر رینا صاحب نے تنِ تنہا یہ کام کر دکھایا۔ 1038 خطوط کی ایک جلد شائع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ میں انھیں اس کام کے لیے مبارک باد دیتا ہوں۔ ان سے قبل میں مختصر طور پر اپنی بات رکھ چکا تھا۔ اس جلسے میں میری شریکِ حیات بھی موجود تھیں (اب مرحومہ ہو چکی ہیں)۔

اگلے برس یعنی 2012 ماہِ جولائی میں جب میں انجمن کے دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ خلیق صاحب اپنے گھر کے باتھ روم میں گر گئے ہیں اور اُن کے ہپ جوائنٹ میں چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ فون پر بات ہوئی، اُنھوں نے بتایا کہ ابھی حالت کچھ ٹھیک نہیں۔ وقت گزرتا گیا ملاقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آخر 18 اکتوبر 2016 کا وہ دن آ پہنچا کہ ادب کا یہ تناور

درخت زمین بوس ہوکر پیوندِ خاک ہوگیا۔

خلیق انجم صاحب کے سوانحی خاکے کے مطابق ان کا بچپن کا نام غلام احمد خاں تھا۔ اسکول میں لڑکے 'غلام' کہہ کر چھیڑنے لگے تو والدین نے ان کا نام خلیق احمد خاں بدل دیا۔ جب انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو خلیق اقبال ہوگئے، کچھ عرصے بعد خلیق انجم؛ اور یہی نام آخر تک جاری رہا۔ والدین کے نام: محمد احمد و قیصر سلطانہ ہیں۔ دادا و پردادا حضرات کے نام: اصغر خاں و ثمر خاں ہیں۔ یہ پانچ بہنوں کے اکیلے بھائی تھے۔ اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول، دہلی سے ہائی اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ، بی. اے اور ایم. اے (1957)، ڈپلوما اِن لنگوسٹک (1960)، ڈپلوما اِن لائبریری سائنس (1961) اور پی ایچ.ڈی (1962) دہلی یونیورسٹی سے کی۔

خلیق صاحب کی ملازمت کا آغاز 1957 میں بہ حیثیت لکچرر کروڑی مل کالج دہلی سے ہوا۔ 1974 میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ستمبر 2012 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ جن رسائل کی زندگی میں انھوں نے ادارت کی اُن کے نام ہیں 'اعتمادیہ' اسکولی دور میں، ماہنامہ 'جھلک' علی گڑھ 54-1953، سہ ماہی 'ادبی تبصرے' 72-1971، 'سیکولر ڈیموکریسی' 74-1971، سہ ماہی 'اردو ادب' 97-1974 اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' 1974 تا ستمبر 2012۔ ان کی شادی اور اولاد کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ 2004 تک ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد میری جان کاری کے مطابق 36 تھی، جن میں 'غالب کے خطوط' کی پانچ جلدیں بھی شامل ہیں۔ ان کے مقالوں، تبصروں اور کتابوں پر پیش لفظ کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ ان کو وقتاً فوقتاً جو انعامات و اعزازات ملے ہیں ان کی تعداد 13 سے اوپر ہے۔

ماہنامہ 'کتاب نما' اور 'ایوانِ ادب' نے ان پر خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ان پر قطب سرشار کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوچکی ہے۔ 70 سے زائد قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کر چکے تھے۔ جن بیرونی ممالک کے انھوں نے سفر کیے ان میں خاص طور سے انگلینڈ، ماریشس، پاکستان، متحدہ عرب امارات اور قطر شامل ہیں۔ قریب 26 ادبی اداروں اور کمیٹیوں کی انھیں رُکنیت حاصل تھی، بعض کے یہ صدر بھی تھے۔

اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والی اگرچہ ہر ادبی شخصیت جسمانی طور پر فنا ہوجاتی ہے، مگر اس کے قلمی کارنامے اُسے سیکڑوں نہیں ہزاروں برس تک زندہ رکھتے ہیں۔

□□□

سرورالہدیٰ

خلیق انجم: اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

خلیق انجم کے انتقال سے دہلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک دور رخصت ہوگیا۔ میں نے اس دور کو تحریروں میں زیادہ دیکھا ہے۔ ابھی ہمارے درمیان چند ایسی شخصیات موجود ہیں جن کا تعلق خلیق انجم کے عہد سے رہا ہے اور جنھیں دیکھنے اور سننے کے بعد خلیق انجم کا عہد ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ خلیق انجم کے انتقال سے قبل چند ایسی شخصیات رخصت ہوگئیں جن سے ادبی دنیا اور خصوصاً دہلی کی ادبی دنیا علمی و ادبی اعتبار سے زیادہ روشن تھی۔ خلیق انجم ان تمام شخصیات کے درمیان رہے۔ ان شخصیات کے نام ادبی دنیا کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ نثار احمد فاروقی، تنویر احمد علوی، امیر حسن عابدی، محمد حسن، قمر رئیس، زبیر رضوی، رشید حسن خاں وغیرہ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ خلیق انجم نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی لیکن خلیق انجم کا خیال ان شخصیات کے ساتھ بھی آتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص علمی و ادبی اعتبار سے اتنا ثروت مند ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ خلیق انجم نے علمی و ادبی اعتبار سے ان شخصیات سے فیض بھی حاصل کیا اور انھیں فیض پہنچایا بھی۔ دہلی کی ادبی زندگی میں اب شاید ایسی شخصیات ایک ساتھ یکجا نہ ہوسکیں۔ خلیق انجم خواجہ احمد فاروقی کے شاگرد تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جن شخصیات کا اوپر ذکر ہے ان میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی رشتہ خواجہ احمد فاروقی سے رہا ہے۔ خلیق انجم کئی اعتبار سے سب سے مختلف تھے مگر انھیں معلوم تھا کہ انھیں جن دوستوں کا تعاون حاصل ہے ان کا بدل تلاش کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے علمی و ادبی کاوشوں کے ساتھ اردو زبان کے مسائل کے حل کی طرف توجہ صرف کی۔ علی گڑھ سے انجمن کا دہلی منتقل ہونا ایک واقعہ تھا۔ انجمن کی عمارت دہلی کے جس علاقے میں ہے وہ خلیق انجم کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس عمارت کے تصور سے خلیق

انجم کی انتظامی صلاحیت کا احساس تیز تر ہوجاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا جوہر ادبی محفلوں میں کھلا کرتا تھا۔ وہ مزاح کا پہلو تلاش کرلیا کرتے تھے۔ ان کی موجودگی سے علمی و ادبی مسائل کے درمیان ایک فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ محفل میں چاہے وہ کہیں بیٹھے ہوں ان کا ہونا ہی بہت اہم تھا۔ مزاح میں لپٹے ان کے چبھتے ہوئے جملے شخصیت کا داخلی اظہار معلوم ہوتے۔ کوئی لفظ فاضل نہیں ہوتا تھا۔ کسی کے تنقیدی خیال یا تحقیقی دریافت کو رد کرنے میں وہ اسی اندازِ گفتگو سے کام لیتے۔ اسی لیے بعض اوقات ان کی بہت اہم باتیں قہقہوں کی نذر ہوجاتی تھیں۔ ایک سامع اور قاری کے طور پر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ انھیں جتنی توجہ سے سنا گیا کاش اسی توجہ سے انھیں پڑھا جاتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی تحریریں ہمارے مطالعے میں نہیں آئیں۔ بات صرف یہ ہے کہ خلیق انجم کی چند ایسی کتابیں اور تحریریں ضرور ہیں جن پر اور زیادہ سنجیدہ گفتگو ہونی چاہیے تھی۔ ان کی ایک اہم کتاب 'رفیع سودا' ہے۔ اپنے موضوع پر یہ بنیادی اور اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے ماخذ اور حوالے یہ بتاتے ہیں کہ وہ تحقیق کے تئیں کس قدر حساس تھے۔ کم و بیش پچاس سال قبل سودا پر اس سطح کی کتاب لکھنا آسان نہیں تھا۔ اسی طرح 'متنی تنقید' بھی اپنے موضوع پر بنیادی کتاب ہے۔

خلیق انجم اپنے معاصرین کی علمیت اور ذہانت کے اعتراف میں نہایت فراخ دل تھے۔ نثار احمد فاروقی کو وہ نثار کہا کرتے تھے۔ نثار احمد فاروقی کی پہلی برسی کے موقع پر غالب اکادمی میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس کی نظامت میرے ذمے تھی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ نثار نے مجھے ابتدا میں جو علمی مشورہ دیا اس پر میں نے عمل کیا۔ پہلا مشورہ غالب کی تحریروں کو جمع کرنے کا تھا اور دوسرا مشورہ خطوطِ غالب کی ترتیب سے متعلق تھا۔ چناں چہ یہ دونوں کتابیں آج خلیق انجم کی ادبی کارگزاریوں کا اہم حوالہ ہیں۔ ''غالب کی نادر تحریریں'' کے عنوان سے ان کی کتاب کے دو اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ خطوطِ غالب کی جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے ہی ان کی ایک اہم کتاب ''غالب کا سفرِ کلکتہ'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ غالب شناسی کے تعلق سے ان کی کاوشوں کو یاد رکھا جائے گا۔ مختلف اوقات میں غالب سے متعلق شائع ہونے والی یہ کتابیں خلیق انجم کی محنت و کاوش کے ساتھ اس عہد کا بھی فیضان ہیں جس میں اتنی اہم شخصیات دہلی میں جمع ہوگئی تھیں۔ خلیق انجم اور ان کے معاصرین کی مختلف تحریروں میں اس عہد کی ادبی ملاقاتوں اور باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان دنوں ادبی صحبتیں کتابوں

کے مطالعے کا بدل بھی تھیں اور ان کا حاصل بھی۔ کمال یہ ہے کہ خلیق انجم کی تنقیدی و تحقیقی تحریروں میں بذلہ سنجی نہیں ہے۔ انھیں ابتدا ہی سے تاریخ، ادبی تاریخ میں دلچسپی تھی۔ ''آثار الصنادید'' کے علاوہ ان کی کئی کتابیں ہیں جن کے مقدمے اور مشمولات سے تاریخ میں ان کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ دہلی کی قدیم عمارتوں، مقبروں، کتبوں کے تعلق سے ان کی واقفیت بہت گہری تھی۔ وہ جب دہلی کی تاریخی عمارتوں کا ذکر کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ وہ وہاں موجود ہوں۔ کاغذ پر جب نقشے بناتے تو محسوس ہوتا کہ عمارت تو خلیق انجم کے وجود کا حصہ ہے۔ میں نے کئی موقعوں پر خلیق انجم سے تاریخی مقامات سے متعلق گفتگو کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دہلی کی ادبی اور تہذیبی تاریخ ان کے ساتھ سفر کرتی رہی ہے۔ انھوں نے ادبی شخصیات سے وابستہ مقامات کی حفاظت کے لیے کوششیں بھی کیں۔ ان کا ایک اہم حوالہ مزارِ ذوق بھی ہے۔ خلیق انجم کی علمی و ادبی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال بھی آتا ہے کہ انھوں نے انجمن کی مختلف ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے کس طرح اتنا وقت نکالا ہوگا۔ جو لوگ شخصی اعتبار سے ان سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ خلیق انجم عام ملاقاتوں میں گفتگو کو پھیلاتے نہیں تھے۔ جو شخص ان سے ملنے جاتا وہ فوراً پوچھتے کہ تشریف آوری کیسے ہوئی؟ پانی اور چائے کے بعد وہ مدعا پر آجاتے۔ اگر گفتگو طویل ہونے لگتی تو وہ پہلو بدلنے لگتے۔ انھیں یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں تھا کہ ہماری گفتگو مکمل ہو چکی ہے۔ کسی ادارے کا ذمہ دار شخص اپنی ذمے داریوں کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے۔ خلیق انجم کے یہاں کوئی تکلف نہیں تھا۔ ایک ٹھیٹھ آدمی زمینی سطح پر آکر بات کرتا تھا۔ کسی طرح کا اشرافیائی رویہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ انجمن کے تعلق سے ان کی جو خدمات ہیں وہ تو مستقل ایک موضوع ہے یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر خلیق انجم عام سطح پر لوگوں سے مکالمہ نہ کرتے تو انجمن کا دائرۂ کار اتنا وسیع نہ ہوتا۔ ان کی شخصیت باغ و بہار تھی جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ جملے چسپاں کرنے میں انھیں دیر نہیں لگتی تھی، لیکن جہاں پر انھیں ٹھہرنا ہوتا ٹھہر کر گفتگو کرنا ہوتا وہاں وہ دوسرے خلیق انجم نظر آتے تھے۔ جب کبھی مجھے کسی موضوع پر ان سے کچھ دریافت کرنا ہوتا تو وہ کہتے آپ انجمن کی ایک پیالی چائے پینے کیوں نہیں آجاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب دیوان میر عبدالحئ تاباں پر کچھ کام میں نے کرنا شروع کیا تو بعض مشوروں کے بعد کہنے لگے آپ نثار احمد فاروقی سے بات کیجیے۔ یہ عجیب شخصیات تھیں جنھیں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ایک پر نظر کیجیے تو دوسرے پر نظر چلی جاتی ہے۔ ان کے اختلافات اپنی جگہ لیکن یہ

حقیقت ہے کہ یہ تمام لوگ علمی اور ادبی اعتبار سے ایک دوسرے کا احترام کرتے اور تحقیق کرنے والے کو نام اور گھر کا پتا بتاتے تھے۔

ایک موقع پر تنویر احمد علوی، خلیق انجم اور چند دوسرے حضرات سے محوِ گفتگو تھے میں بھی علوی صاحب کو سن رہا تھا۔ علوی صاحب کی گفتگو میں تسلسل بھی تھا اور جاذبیت بھی۔ خیالات کی کڑیاں ٹوٹتی نہیں تھیں۔ سبھی لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ خلیق انجم صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ علوی صاحب سے فرمایا کہ یار علوی! تم ہمیشہ تقریر کرنے لگتے ہو۔ علوی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، خلیق! اب نہ گفتگو میں ایسی علمیت ہے اور نہ ایسا تسلسل اور نہ ایسا کوئی بے تکلف دوست۔ خلیق انجم اپنی حاضر جوابی اور بے تکلفی سے یہ بھی بتانا چاہتے تھے میرا جوہر مجھ میں تو ہے مگر اس کے اظہار کے لیے وہ علمی اور تہذیبی فضا چاہیے جس نے انھیں مستقل ایک کردار کی حیثیت عطا کر دی۔

ان کی کتاب ''سودا'' کا نیا ایڈیشن آنے والا تھا۔ میں استادِ محترم اسلم پرویز صاحب سے ملنے کے لیے انجمن آیا۔ استادِ محترم تو بعد میں ملے۔ خلیق انجم صاحب نے خیریت پوچھی اور ایک مسودہ میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھایا کہ آپ اسے دیکھ لیں۔ اسلم صاحب نے تفصیلات بتائیں اور میں مسودہ لے کر جے این یو چلا آیا۔ پڑھنے میں چند دنوں کی تاخیر ہوگئی۔ خلیق انجم صاحب کو معلوم تھا کہ وقت تو دیکھنے میں لگے گا ہی۔ انھیں تو کہنا تھا تاکہ ہم اس بات کو یاد رکھ سکیں۔ اب کیا تھا میرے سامنے اسلم صاحب سے کہہ دیا کہ اسلم بھائی تمہارے شاگرد تمہاری طرح ہیں۔ اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی تو وہ کہنا نہیں بھولے کہ آپ نے مسودہ بہت دیر سے لوٹایا۔ لیکن یہ تو ایک دکھانے کی خفگی تھی۔ مجھے انھوں نے اپنے دوستوں اسلم پرویز، صدیق الرحمٰن قدوائی اور شمیم حنفی صاحب کی وجہ سے بہت عزیز رکھا۔ میں اپنے ان اساتذہ اور بزرگوں کی شفقت وعنایت کے سبب آج جس قدر ثروت مند ہوں اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔ جب جامعہ میں میرا تقرر ہوا تو خلیق انجم صاحب نے مٹھائی تقسیم کی۔ جوائنگ کے بعد انجمن جانا ہوا تو گلے لگایا مبارکباد دی اور یہ کہنا نہیں بھولے کہ آپ کا تقرر تو میں نے کرایا ہے۔ پروفیسر منیجر پانڈے کی کتاب 'ساہتیہ کے سماج ساشتری بھومیکا'' کے اردو ترجمہ کی اشاعت کا جب مرحلہ آیا تو انھوں نے فوراً انجمن سے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی اطلاع جب مجھے ملی تو میں نے ان سے رابطہ کیا کہ سر آپ کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شکریہ انھوں نے لوٹا دیا۔ دو ہفتے میں کتاب شائع

ہوگئی۔ جے این یو میں اس کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔ اس وقت کے وائس چانسلر بھٹا چاریہ نے اسے ریلیز کیا تھا۔ جلسے کی صدارت شمیم حنفی نے کی اور اس کا سنچالن پرشوتم اگروال نے کیا تھا۔ اس تاریخی موقع پر خلیق انجم مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔

خلیق انجم صاحب کو خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میر حیات اور شاعری'' کو شائع کرنے کا خیال آیا۔ مجھے انجمن بلایا کہنے لگے آپ نے خواجہ صاحب کی کتاب پڑھی ہے میں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر پوچھا قاضی عبدالودود کا تبصرہ پڑھا تو میرا جواب اثبات میں تھا۔ اصل میں 'میر حیات اور شاعری' مشکل سے ملتی ہے ویسے میں نے تلاش کرنے کی زحمت بھی کہاں اٹھائی تھی، خلیق انجم صاحب نے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب 'میر حیات اور شاعری' میرے ساتھ کر دی یہ کہتے ہوئے آپ اسے توجہ سے پڑھیں، پھر میں بات کروں گا۔ قاضی عبدالودود کا تبصرہ ان کی کتاب ''میر'' میں شامل ہے یہ کتاب خلیق انجم صاحب نے مطالعے کے لیے مجھ سے مستعار لی۔ اس طرح معاملہ وقتی طور پر برابر کا ہوگیا۔ میرے لیے مشکل کتاب کے بارے میں ان سے گفتگو کرنا تھا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری کتاب پڑھی اور ان سے گفتگو بھی ہوئی۔ میرا خیال یہ تھا کہ کتاب کے دوسرے اڈیشن میں قاضی صاحب کا تبصرہ اخیر میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن وہ بعد میں مجھے بھی مناسب معلوم نہیں لگا۔ خلیق انجم صاحب قاضی صاحب کے اعتراضات کے تعلق سے کہنے لگے کہ کسی کے بس کا نہیں ہے کہ وہ اس کا جواب دے۔ لیکن انھوں نے مجھے 'میر حیات اور شاعری' پر ایک مضمون لکھنے کا حکم دے دیا۔ اور میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مضمون 'اردو ادب' میں شائع ہوا۔ 'میر حیات اور شاعری' اطہر فاروقی صاحب نے شائع کر دی ہے۔

خلیق انجم کو اپنے دوستوں کی علمیت اور صلاحیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے علمی احسانات کا بھی بڑا لحاظ تھا۔ 'کتاب نما' کا نثار احمد فاروقی نمبر کے پیش لفظ میں خلیق انجم نے لکھا ہے:

> ''میں نے غالب کے تمام اردو خطوط چار جلدوں میں مرتب کیے ہیں۔ میرے اس کام کی ہندستان اور پاکستان میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ لیکن شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ اس کے پیچھے دراصل نثار صاحب کا ہاتھ تھا۔ اگر نثار صاحب 'غالب کی نادر تحریریں' مرتب کرنے کی ترغیب نہ دیتے تو مجھے غالب سے دل چسپی پیدا نہ ہوتی اور پھر میں 'غالب اور شاہانِ تیموریہ'

اور چار جلدوں میں غالب کے خطوط شائع نہ کرتا۔''

(پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر 'کتاب نما' مرتبہ خلیق انجم، 1993)

ان اعترافات میں خلیق انجم کی شخصی پذیرائی پوشیدہ ہے۔ یہ خوبی پہلے بھی کم تھی اب تو تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ ہر شخص پہلے ہی دن سے نکتہ رس اور صاحبِ بصیرت ہے۔ نثار احمد فاروقی نے اپنی زندگی میں شائع ہونے والی آخری کتاب ''مقالاتِ فاروقی'' کے حرفِ آغاز میں لکھا ہے:

''اس کتاب کی اشاعت میں ہمارے دوست ڈاکٹر خلیق انجم نے دل چسپی لی اور دلّی اردو اکیڈمی سے اس کی طباعت کے لیے معقول گرانٹ دلائی۔''

(مقالاتِ فاروقی، اسلامک فاؤنڈیشن، دسمبر 2003، ص 10)

مالی تعاون کے لیے اس طرح شکریہ ادا کرنا بھی ظرف کی بات ہے۔ یہ ظرف یکساں طور پر خلیق انجم اور ان کے دوستوں کے ہاں تھا۔ یاد ہے کہ انجمن نے اردو کے مسائل پر ایک بڑا جلسہ منعقد کیا تھا۔ نثار احمد فاروقی نے انجمن کی مختلف شاخوں کے بارے میں صاف صاف کہا کہ یہ سب بند پڑی ہیں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ ایک عجیب غصے کا عالم تھا۔ خلیق انجم صاحب پاس بیٹھے سن رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے نثار سچ بول رہے ہیں۔ جب مجھے خلیق انجم اور ان کے معاصرین یاد آتے ہیں تو عرفان صدیقی کا شعر یاد آتا ہے:

ہم سب آئینہ در آئینہ در آئینہ ہیں
کیا پتہ کون کہاں کس کی طرف دیکھتا ہے

ان دیکھنے والوں کی تحریریں یہ بتاتی ہیں کہ ہم لوگ مل کر ایک عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خلیق انجم علمی محفلوں میں اپنے معاصرین کو ایک خاص انداز سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس میں علمی اعتراف بھی ہوا کرتا تھا اور طنز بھی۔ ایک مرتبہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی محفل میں قمر رئیس صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا کہ غالب کی شاعری کو پڑھ کر لگتا ہے کہ غالب کے سماجی رشتے کمزور تھے۔ اور جب میں نے خلیق انجم صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس بات کی تائید کی۔ خلیق انجم نے فوراً کہا ہر بات مائک پر کہنے کے لیے نہیں ہوتی، اور پورا مجمع قہقہہ زار ہوگیا۔ ایک موقعے پر جب خطوطِ غالب کی تدوین کے تعلق سے کوئی گرفت کا پہلو نکل آیا تو انھوں نے دبی زبان میں مقرر سے کہا آپ کہتے رہیے۔ اس کے بعد فراخ دلی کے ساتھ وہ

معترض کی تعریف کرنے لگے کہ کسی نے توجہ سے پڑھ کر کوئی بات تو کہی۔ ایسے کئی ایسے واقعات ہیں جن سے خلیق انجم کی ایک وہ شبیہ ابھرتی ہے جس کا ذکر عموماً کم کیا جاتا ہے۔

خلیق انجم کی ایک اہم کتاب ''مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا'' ہے۔ اس کتاب میں 19 خاکے ہیں۔ خلیق انجم کی شخصیت کے دو اہم حوالے ہیں۔ ایک تاریخ اور تہذیب میں ان کی دلچسپی اور دوسرا مختلف علمی و ادبی شخصیات کو موضوعِ گفتگو بنانا۔ اس اعتبار سے ''مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا'' خلیق انجم کی شخصیت کا بنیادی حوالہ بن جاتی ہے۔ خلیق انجم کی گفتگو میں جو قصہ گوئی تھی اس کا رشتہ بھی دراصل تاریخ میں ان کی دلچسپی سے ہے۔ شخصیت تاریخ سے الگ نہیں ہے، اسی لیے ان کی تحریروں میں تاریخ اور شخصیت ایک دوسرے کا تکملہ بن جاتی ہیں۔ خلیق انجم گفتگو کے دوران جس طرح کسی شخصیت کا خاکہ کھینچتے تھے اس میں بلا کی کاٹ اور کشش تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان کی شخصیت دوسری شخصیت سے الگ نہیں ہے۔ اختلاف کے ذکر میں بھی وہ اسی مانوسیت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ ''مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا'' کی شخصیات خلیق انجم کے لیے علمی و ادبی اعتبار سے اہم تو تھیں ہی مگر وہ شخصی اعتبار سے بھی ان سے ایک قربت کا احساس رکھتے تھے۔ جہاں یہ احساس نہیں ہے وہاں خلیق انجم کا قلم بھی کچھ خشک اور رکا رکا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خلیق انجم کے لیے مختلف شخصیات پر قلم اٹھانا ان کے مختلف تجربات کا نتیجہ ہے۔ خلیق انجم دلّی والے تھے انھیں اس بات پر فخر تھا لیکن اس دہلویت کا ان کے یہاں تعصب سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ کچھ ایسے جملے بولتے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی علاقے کی زبان کو رد کر رہے ہیں اور لطف کا پہلو پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن داخلی سطح پر ان کے یہاں کشادگی تھی۔

خلیق انجم نے یہ بھی بتایا کہ مخالفین سے مقابلے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ اپنا کام ذمہ داری کے ساتھ کیا جائے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مخالفین کو بھی اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ مخالفت سے کس طرح تعمیری کام لیا جاتا ہے یہ ہنر خلیق انجم کے ادبی سفر سے سیکھا جا سکتا ہے۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

○○○

چودھری شرف الدین

خلیق انجم: ایک معتبر محقق

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری اور خوش مزاج و خوش گفتار اور آہنی ارادوں کے مالک ڈاکٹر خلیق انجم کی رحلت کی خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ مرحوم کئی مرتبہ انجمن ترقی اردو یوپی کے جلسوں میں شریک ہونے لکھنؤ تشریف لائے اور ایک بار آنجہانی جگن ناتھ آزاد کے ہمراہ بھی شریکِ محفل ہوئے۔ دونوں نے خادم کے غریب خانے پر ہی قیام فرمایا۔

مرحوم کی تقریر بڑی شگفتہ اور سیدھے سادے لفظوں میں ہوتی تھی۔ اگر مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کردوں کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کو بامِ عروج تک پہنچانے میں ڈاکٹر خلیق انجم کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ قریب 38 سال تک انجمن سے وابستہ رہے اور ابتدائی دور سے نکلنے والے ہفتہ وار 'ہماری زبان' کو برابر جاری رکھا۔ خادم کو بتایا گیا تھا کہ ذوقؔ کے مزار کی تعمیر کے سلسلے میں جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں اس کے لیے انھوں نے کورٹ کا سہارا لیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی۔

مرحوم کی جب تک صحت رہی وہ اردو کی خدمت کرتے رہے۔ میرے خیال میں مولوی عبدالحق کے بعد اگر کسی نے انجمن کی ترقی و بقا کے لیے کام کیا ہے تو اس میں سرِ فہرست ڈاکٹر خلیق انجم کا نام آتا ہے۔ اس موقعے پر مرحوم کی زندگی کے چند پہلوؤں پر بات کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے خاندان کا سلسلہ تو افغانستان سے ملتا ہے مگر کئی پشتوں سے یہ ہندستان میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کی پیدائش شہر دلّی کی ہے جو ہندستان کا دل ہے۔ یہ شہر بار بار لوٹا گیا اور تاراج کر دیا گیا مگر جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اگر دلّی شہر کے لُٹنے اور اُجڑنے کی داستان بیان کی جائے تو اچھی خاصی کتاب تیار ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ تاریخ کی کتابوں میں رقم ہیں، مگر 1947 میں دلّی کے گلی کوچوں میں جو قتلِ عام ہوا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔

خلیق انجم کی پیدائش غالباً1933 کی ہے، اس لیے جب دلّی میں چاروں طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، گلی کوچوں میں چھرے بازیاں ہورہی تھیں تو اس وقت آپ کی عمر لگ بھگ بارہ تیرہ سال تھی۔ گرچہ ابھی پورے طور پر شعور پیدا نہیں ہوا تھا مگر آپ کے خاندان پر جو گزرا وہ بھول نہیں سکتے۔ ایماندار اور معتبر صحافی وہی ہوتا ہے جو سچائی بیان کرے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گھر میں فاقوں تک کی نوبت آ گئی، باوجود منع کرنے کے خلیق انجم صاحب گھر سے نکل پڑے اور اپنی والدہ کی تین مہینے کی تنخواہ لینے اسکول پہنچ گئے اور تنخواہ لے کر واپس لوٹے۔ اسکول جاتے وقت چاوڑی بازار میں انھوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان جارہا تھا، ایک صاحب دروازے سے نکلے اور رسّی کا پھندا ڈال کر مسلمان کو اندر کھینچ لیا۔ بچپن میں خلیق انجم صاحب اجمیری گیٹ کے پاس اپنے تایا کے گھر میں رہتے تھے اور سامنے کونڈہ والی گلی میں ہر گھر کا ایک نہ ایک فرد قتل ہو چکا تھا۔ محلے کے محلے خالی ہو گئے۔ ان کو اچھی طرح یاد ہے کہ گلی کونڈہ والی سے لاشوں اور زخمیوں کو نکالا جارہا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو وہاں پہنچ گئے، ایک زخمی عورت پنڈت جی سے چمٹ گئی اور انھوں نے جواہر لال نہرو کو بھی روتے دیکھا۔ یہ ان کو اچھی طرح یاد ہے کہ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ نہ شادیاں، نہ مشاعرہ، نہ میلاد، نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ان کے والد صاحب انجینئر تھے مگر ایک سال بیمار رہے اور نوجوانی میں ہی انتقال ہو گیا، جو اثاثہ تھا ختم ہو گیا، والدہ صاحبہ پڑھی لکھی تھیں اسکول میں نوکری کر کے گھر کو سنبھالا اور بچوں کو پڑھایا لکھایا۔

خلیق انجم صاحب کے نانا عزیز الرحمٰن صاحب کافی پڑھے لکھے تھے، انگریزوں کو پڑھاتے تھے۔ اسی طرح دادا بھی فارسی اور اردو کے معلّم تھے۔ ان کی کئی کتابیں نصاب میں داخل تھیں۔ اس طرح نانا کی طرف سے بھی، دادا کی طرف سے اور والد والدہ کی طرف سے بھی تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد تھے، اس لیے ان کو پڑھنا لکھنا ورثے میں ملا ہے اور بچپن سے ہی محنت کے عادی ہیں، جس کام میں لگ گئے اس کو پورا کر کے ہی چھوڑا۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی غالبؔ کا دیوان مع شرح ازبر کرلیا۔ اس طرح اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں اساتذہ میں مقبول ہو گئے اور عزت بڑھی۔ چوں کہ خلیق انجم صاحب کے نانا اور دادا روشن خیال تھے اس لیے لڑکیوں میں تعلیم کا رواج رہا۔ ان کی بہنیں بھی تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ خلیق انجم کو یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ ان کی بہن کی شادی تھی اور روپے کی کمی تھی، اس زمانے میں یوپی گورنمنٹ نے کتابوں پر انعام دینا شروع کیا تھا۔ اسی درمیان انھوں نے خبر پڑھی کہ ان کو 5000 روپیہ یوپی گورنمنٹ نے دینا منظور کیا ہے، ان کو روپیہ مل گیا، گویا یہ بھی غیبی امداد تھی۔ حضرات! آپ نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ ''قلم

زیادہ طاقت ور یا تلوار''، بالقلم اور بالسیف کی لڑائی پرانی ہے مگر خلیق انجم صاحب کو دونوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ انھوں نے ملٹری کی وردی پہن کر اپنے دادا ثمر خاں کی روح کو خوش کر دیا جو بہت بہادر اور جری سپاہی تھے۔

ان کے آبا و اجداد جب ہندستان آئے تو خاندان کے ایک بزرگ شاہی فوج میں بھرتی ہو گئے اور رشتے دار لاہور میں رنجیت سنگھ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جب چین سے جنگ چھڑی تو ہندستان میں ملٹری کے شعبے میں کافی کمیاں تھیں۔ یہ کالج سے وابستہ تھے مگر چاروں طرف فوج میں بھرتی شروع ہوئی تو کمیشن میں دہلی یونیورسٹی میں خلیق انجم صاحب کا انٹرویو ہوا اور کرنل ہوشیار سنگھ نے ان کو ناگپور بھیج دیا۔ اب یہاں سوال کیا گیا کہ جسمانی طور پر تو آپ وزن میں بھی کم ہیں مگر ایسا معلوم پڑتا ہے کہ فوج کی وردی کی چمک دمک نے یہ بھی کہنے پر مجبور کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب میری شادی کا انحصار ہی فوج کی بھرتی پر ہے اور لڑکی والوں کی یہ شرط ہے کہ میں فوجی بنوں۔ پھر دل کا معاملہ تھا، ڈاکٹر بھی پسیج گیا۔ وہ کہتا کہ کمر سیدھی کر کے چلو ورنہ شادی نہ ہو پائے گی۔ خیر یہ باتیں تو گئی گزری ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ خلیق انجم صاحب نہایت محنتی رہے تھے اور یہ محنت کا پھل ہے جس نے ان کو آج صفِ اوّل کے محققین میں شامل کرا دیا۔ آپ نے گجرال کمیشن میں کام کیا۔ ان کے استاد خواجہ احمد فاروقی جب لندن سے لوٹے تو Textual Critism کا خیال لے کر آئے۔ یہ بالکل نیا Subject تھا۔ خواجہ صاحب نے خلیق انجم صاحب کو یہ کام سونپا اور یہ امتحان ان کی کامیابی کا زینہ بن گیا۔ یہ اُس وقت کروڑی مل کالج میں پڑھا رہے تھے، ان کے ساتھی کوہلی صاحب انگریزی کے استاد تھے۔ انھوں نے ان کی مدد کی اور اس موضوع پر کتابیں پڑھنے کو دیں۔ دوسری میٹنگ میں خواجہ صاحب نے آخر میں خلیق انجم صاحب سے کہا کہ آپ بھی کچھ بتائیں۔ یہ کوہلی صاحب کے ساتھ مطالعہ کر چکے تھے، انھوں نے جب بولنا شروع کیا تو خواجہ صاحب کافی خوش ہو گئے۔

انھوں نے اس موضوع پر کئی لوگوں کے فارم بھروائے اور گویا ایک کلاس تیار ہو گئی اور خلیق انجم صاحب سے کہا کہ آپ کلاس لیں گے۔ خلیق انجم نے متنی تنقید پر پڑھنا اور کلاس لینا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب نے متنی تنقید کا موضوع دے کر خلیق انجم صاحب کا رُخ تخلیقی کاوشوں کی طرف موڑ دیا اور انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے مظہر جانِ جاناں پر کتاب لکھی اور مرزا سوداؔ پر بھی۔ اس طرح اردو ادب میں ان کی جگہ بن گئی۔ انجم صاحب پرسرور صاحب بھی مہربان تھے۔ گجرال صاحب کے ساتھ کام کر چکے تھے، وہ بھی واقف ہو چکے تھے۔ آنند نرائن ملا

صاحب ان کے کام سے خوش تھے، مالک رام اور سجاد ظہیر صاحب بھی معترف تھے، ان کو انجمن ترقی اردو (ہند) کا کام سونپا گیا، مگر بالکل اسی طرح جس طرح مولوی عبدالحق مرحوم کو انجمن کا دفتر ملا تھا، ایک میز اور قلم دوات۔ خلیق انجم صاحب نے جب کام شروع کیا تو پیسہ نہ تھا اور ٹوٹی پھوٹی سلطان منزل۔ اس موقعے پر کرنل بشیر زیدی صاحب نے ہمت بڑھائی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ انجمن کی اپنی عالی شان عمارت ''اردو گھر'' کے نام سے موجود ہے۔

الیکشن کے وقت ہر سرکار کچھ نہ کچھ اعلان کرتی ہے۔ آپ سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام بائیس لاکھ دستخطوں پر مشتمل میمورنڈم ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی رہنمائی میں پیش کیا گیا تھا، مگر کیا ہوا؟ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ملک کے صدر بنے، گجرال صاحب وزیر اعظم بنے مگر وہ میمورنڈم برف خانے میں پڑا رہ گیا۔

انجمن ترقی اردو کے پاس تو کوئی طاقت ایسی نہیں کہ یہ اپنی بات منوالے، اس لیے جب بھی کوئی یہ کہتا ہے کہ آپ اردو کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ تو ان کے پاس یہی جواب تھا کہ ہم بے بس ہیں اور یہی بات اتر پردیش کے لیے بھی لاگو ہوتی ہے۔ دہلی میں بیٹھ کر ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ کام تو ایسے کیے ہیں جو یادگار رہیں گے۔ سرسیّد احمد خاں نے ایک کتاب 'آثار الصنادید' ایک جلد میں لکھی تھی۔ میری نجی لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے، وہ غالباً 1847 کی ہے مگر اسی کتاب کو خلیق انجم صاحب نے تین جلدوں میں مرتّب کر کے شائع کی۔ خود نئے فوٹو اپنے ہی کیمرے سے کھینچے ہیں اور حاشیوں میں مزید اضافہ کر کے 'آثار الصنادید' کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اسی طرح انجم صاحب نے دہلی کے آثارِ قدیمہ پر ایک کتاب لکھی ہے، یہ بھی تحقیقی کام ہے۔

درگاہ شاہِ مرداں ان ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ غالبؔ کے خطوط کو پانچ جلدوں پر مشتمل شائع کیا۔ ان کی ایک کتاب حسرتؔ موہانی پر بھی ہے۔ ایک کتاب ایسی ہے جو 'مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا' کے عنوان سے ہے۔ یہ خاکے ہیں ان حضرات کے جن سے یہ ملاقات کرتے رہے تھے۔ خلیق انجم صاحب کی کتابوں کی تعداد لگ بھگ 80 ہے۔ ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے جو مولانا الطاف حسین حالیؔ پر ہے۔ یہ بھی ایک تحقیقی کتاب ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے بانی سرسیّد احمد خاں کی جدوجہد کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ خلیق انجم صاحب کا کام عرق ریزی کا رہا ہے۔ تلاش و جستجو اور دیدہ ریزی کا کام رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خلیق انجم صاحب کی زندگی اور کارناموں پر کوئی یونیورسٹی کا طالبِ علم پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے آگے بڑھے۔ میں یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ □□

محضر رضا

مطالعۂ سوداؔ اور خلیق انجم

خلیق انجم کی پہلی شناخت غالب شناس کی حیثیت سے قائم ہے۔ بلاشبہ اس کی وجہ خطوطِ غالب کی پانچ جلدیں، غالب کی نادر تحریریں اور غالب کا سفرِ کلکتہ ہے۔ لیکن غالب شناسی ان کی شناخت کا واحد حوالہ نہیں۔ سودا پر ان کی کتاب ''مرزا محمد رفیع سودا'' ان کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا اشاریہ ہے۔ سودا پر پہلی مستقل کتاب جس میں سائنٹفک طریقۂ کار کو اپنایا گیا وہ شیخ چاند کی تصنیف ''سودا'' ہے۔ ''سودا'' پہلی مرتبہ 1936 میں شائع ہوئی۔ شیخ چاند کو زندگی نے دوسرا اڈیشن تیار کرنے کی مہلت نہیں دی، بلکہ وہ تو پہلی اشاعت بھی نہ دیکھ سکے۔ البتہ کتاب طباعت کے مراحل سے نکل چکی تھی کہ پیامِ اجل آیا۔ خلیق انجم شیخ چاند کی صلاحیت اور اس کے عملی اظہار کے معترف تھے۔ لیکن علمی اور تحقیقی حقائق یک بیک آشکار ہونے والی شئے نہیں مرورِ ایام کے ساتھ نئے حقائق روشن ہوتے جاتے ہیں اور پرانے منسوخ قرار پاتے ہیں۔ ''مرزا محمد رفیع سودا'' کا پہلا اڈیشن 1967 میں شائع ہوا۔ اس طرح دونوں کتابوں کے درمیان تین دہائیوں سے زائد کا فاصلہ حائل ہے۔ اس درمیان سودا کی حیات اور شاعری کے تعلق سے کافی نیا مواد جمع ہو چکا تھا۔ خلیق انجم نے تمام مواد کا غائر مطالعہ کے بعد اسے از سرِ نو مرتب کیا، جس میں سابقہ رایوں سے اتفاق و اختلاف کی صورتیں پیدا ہوگئیں۔ شیخ چاند کے بعد قاضی عبدالودود کی تحریروں کا انھوں نے بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ ان تحریروں میں کہیں واضح حقائق اور کہیں دھندلے اشارے موجود تھے، جن میں انھوں نے خود رنگ بھرا۔

خلیق انجم کی کتاب ''مرزا محمد رفیع سودا'' بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حیات اور دوسرا فن۔ فن کے ذیل میں ہی ان کے شاگرد اور کلیاتِ سودا کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا ذکر ہے۔ شیخ چاند ہی کی طرح خلیق انجم نے سیاسی وسماجی حالات کو پہلا عنوان قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سماجی و سیاسی حالات ہی انسان کے ذہن کی ترتیب وتشکیل میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ سیاسی حالات کے باب میں اس قدر گنجائش ہے کہ کتاب کا غالب حصہ اسی کی نذر ہو جائے، لیکن خلیق انجم نے یہاں بڑی ہنرمندی سے ان ہی حالات کو قلم بند کیا ہے جن کا کوئی نہ کوئی اثر سودا کی شاعری پر مرتب ہوا ہے۔ اردو شاعری میں امرد پرستی کی جو روایت ملتی ہے اس کے بھی سماجی انسلاکات کو معروضی طور پر نشان زد کیا ہے۔ اس باب کی سب سے اہم خصوصیت توازن ہے۔ اکثر مقام پر تفصیل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے کہ قاری ان کے تعلق سے خود مطالب دریافت کر سکتا ہے۔

اختلافِ رائے اگر مضبوط بنیادوں پر ہو تو یہ نہ صرف حقائق سے پردہ کشائی کرتا ہے بلکہ تحقیق کی روایت کو بھی مستحکم کرتا ہے۔ لیکن جہاں یہ عمل فیشن کی صورت اختیار کرے تو حقائق کوشی کے ساتھ ایک غلط روایت کے استحکام کا باعث بن جاتا ہے۔ خلیق انجم نے مقدمے میں ہی سابقین سے بعض جگہ اختلاف کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب کا متن اس کی تصدیق بھی کرتا ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد کیا ہے؟ سودا کے اجداد کے سلسلے میں تذکروں سے لے کر شیخ چاند کی تصنیف تک میں یہ بات کہی گئی کہ وہ کابل سے ہندستان آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ شیخ چاند کے ماخذ میں مجموعۂ نغز، گلشنِ بے خار، طبقات شعرائے ہند وغیرہ رہے ہوں گے۔ لیکن خلیق انجم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے سودا کے اجداد کا اصل وطن بخارا بتایا ہے۔ اور ان کا ماخذ نقش علی کی کتاب ''نقشِ معانی'' ہے۔ نقش علی سے سودا کے ذاتی تعلقات ہونے کے سبب ان کے پاس ذاتی معاملات سے آگاہی کے نسبتاً زیادہ مواقع تھے۔ اس طرح کے اور بھی مقامات ہیں جہاں خلیق انجم نے نئی تحقیقات پیش کی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ تو سابقہ تحقیقات سے آسودہ تھے اور نہ ان کی یہ کتاب تحصیلِ حاصل کے زمرے میں داخل کی جا سکتی ہے۔

سوانحی کوائف کے سلسلے میں سماجی اور معاشرتی پس منظر کا ذکر سودا کے قصائد کی تفہیم میں خاصا معاون ہے۔ سودا کے کلام پر جن فارسی شعرا کا اثر ہے اس کو بھی مؤلف نے نشان

ز د کیا ہے۔ اس سلسلے میں کہیں تو سودا کی وہ رائے ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے کلام میں ظاہر کی ہیں اور کہیں سابقین کی رائے کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ یقیناً مؤلف کی یہ رائے موازنہ کے بعد ہی ظاہر ہوئی ہوگی لیکن اس مقام پر مزید دلائل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو دلائل پیش کیے گئے ہیں وہ یہ باور کرانے کے لیے ناکافی ہیں کہ سودا کی شاعری متذکرہ فارسی شعرا سے متاثر ہے۔

قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے ''مجموعۂ نغز'' میں سودا کے تذکرے کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس سے قبل کسی تذکرہ نگار نے سودا کے تذکرے کا ذکر نہیں کیا اور آج تک اس تذکرے کا کوئی نسخہ دریافت بھی نہیں ہوا۔ قاضی عبدالودود بھی اس تذکرے کے وجودِ خارجی کے قائل نہیں تھے۔ اسی طرح محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں سودا کی ایک نثری تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ میر کی مثنوی ''شعلۂ عشق'' کا نثری ترجمہ ہے۔ سودا کی یہ تحریر بھی آج تک دریافت نہ ہوسکی اور اس کا وجود بھی مشکوک ہے۔ سودا کی ایک تنقیدی مثنوی ''سبیلِ ہدایت'' کے نام سے موجود ہے۔ اس مثنوی میں سودا نے میر تقی میرؔ کے مرثیہ گو کے مرتبے پر اعتراض کیے ہیں۔ خلیق انجم نے اس مثنوی کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جس سے اس کی مکمل نوعیت معلوم ہوجاتی ہے۔ اس مثنوی پر سودا نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس دیباچے کا تفصیلی حال کتاب میں نہیں ہے۔ ایک رسالہ عبرت الغافلین کے نام سے بھی لکھا ہے۔ اس رسالے میں مرزا فاخر مکیں کے اشعار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فاخر مکیں کے کلام میں معائب بہ کثرت موجود ہیں۔ سودا کا رسالہ ان کی تنقیدی بصیرت کو نمایاں کرتا ہے۔ 'سودا کی تصانیف' کے باب میں اس رسالے کا بھی مختصراً ذکر ہے۔ سودا کے معرکوں کا اس رسالے میں قدرے مفصل ذکر آیا ہے۔ لیکن اس ذکر سے صرف اس کتاب کا پس منظر اور موضوع واضح ہوتا ہے۔ مؤلف نے اس کے مقام و مرتبے کے تعین کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔

خلیق انجم نے سودا کی شاعری کا کافی مفصل جائزہ لیا ہے۔ سودا کے کلام کو تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی یہ نہایت کامیاب کوشش ہے۔ مؤلف نے سودا کے مقام و مرتبے کے تعین میں متوازن طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ اپنی ہر بات کو وہ دلیل سے استحکام بخشتے ہیں، گفتگو فلسفیانہ مباحث سے بوجھل معلوم نہیں ہوتی۔ سودا کا اصلی جوہر ان کے قصائد اور ہجویہ کلام میں

کھلتا ہے۔ قصائد اور ہجو کو تہذیبی مباحث سے کاٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ خلیق انجم نے بھی سودا کی عظمت کا راز ان کے قصائد اور ہجو گوئی کو قرار دیا ہے۔ لیکن غزل کو جو نشاط آمیز لہجہ سودا نے عطا کیا وہ انھیں اردو غزل کے صفِ اول کے نہ سہی اہم شعرا میں ضرور کھڑا کر دیتا ہے۔ خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''سودا ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں اگر ان کی متاعِ فنِ غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو اہم غزل گو شاعروں میں ہوتا [کذا] اور بس۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں اور صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اردو میں خارجیت، زورِ بیان اور نشاط آمیز لہجہ انھیں کی دین ہے۔''

(مرزا محمد رفیع سودا، خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، 2003، ص154)

خلیق انجم نے سودا کو جس بڑے سیاق میں دیکھا ہے۔ وہ واقعہ نہ سہی ایک امتیاز ضرور ہے۔ خلیق انجم نے جس طرح تمام ضروری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ متون کو کھنگالا اور اس کے بعد تحقیقی رایوں پر جو اضافہ کیا ہے وہ قابلِ فخر ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ تقلید بھی ہے۔ آل احمد سرور کی یہ رائے ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابلِ قدر تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے'' یقیناً کسی جانب داری یا مروت کی زائیدہ نہیں بلکہ اس تصنیف کے ہر گوشے کے غائر مطالعے سے برآمد ہوتی ہے۔

ساجد ذکی فہمی

'غالب کے خطوط' اور خلیق انجم

خلیق احمد خاں، ادبی نام خلیق انجم (1933-2016) کا شمار اردو ادب کے ان نامور ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت ناقد، محقق اور مترجم کا فرض نبھایا۔ لیکن بطور محقق وہ زیادہ مشہور ہوئے جیسا کہ اپنی خودنوشت میں رقم طراز ہیں:

> ''میں پہلے تنقید کے میدان میں آیا تھا لیکن قدرت کو میرا نقاد ہونا منظور نہ تھا۔ بعد میں تحقیق کو اپنا میدان بنایا۔ مجھے اطمینان ہے کہ خدا نے مجھے جتنی صلاحیتیں دی تھیں میں نے ان کا پورا استعمال کیا ہے اور میں نے قلم کے تقدس کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔''

قلم کے تقدس کے احترام کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کی تقریباً اسّی (80) کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہاں تمام کتابوں پر تبصرہ یا محاکمہ منظور نہیں فقط خطوطِ غالب کی تحقیق و ترتیب کا احاطہ مقصود ہے۔ ایسا نہیں کہ مکاتیبِ غالب کی ترتیب، تدوین یا تحقیق کے حوالے سے خلیق انجم نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ان سے پہلے کئی محققین نے اس جانب پیش قدمی کی جن میں ممتاز علی خاں، امتیاز علی خاں عرشی اور غلام رسول مہر وغیرہ کا نام بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔ خود غالب کے عہد میں ان کے خطوط کا مجموعہ ''عودِ ہندی'' چھپ کر منظر عام پر آچکا تھا۔ اس مجموعے کے چھپنے کے بعد اس کی طلب اس قدر بڑھی کہ اس کے بے شمار نسخے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ چند خطوط نصاب کا حصہ قرار پائے، حتیٰ کہ ان خطوط کو جدید اردو نثر کا مثالی نمونہ قرار دیا جانے لگا۔

لیکن آہستہ آہستہ ان خطوط میں متن کی غلطیاں اس قدر راہ پا گئیں کہ بعض مکاتیب کے اصل متون کہیں کھو کر رہ گئے۔ مکاتیب میں درآئی ان غلطیوں کی تصحیح کا سلسلہ بھی بدستور جاری رہا لیکن خلیق انجم نے مکاتیبِ غالب کی ترتیب، تدوین اور تحقیق کے تئیں جو سائنٹفک طریقۂ کار اختیار کیا وہ ان سے پہلے مفقود تھا۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی ''غالب'' خلیق انجم کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ غالب پر ان کا مضمون ''غالب کی مختلف قیام گاہیں'' ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون 1968 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے مجلّہ اردوئے معلیٰ کے غالب نمبر کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے 1961 میں انھوں نے ''غالب کی نادر تحریریں'' کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کیا تھا، جس میں ایسے خطوط شامل تھے جو ''عودِ ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' کے بجائے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ غالب سے ذہنی اور قلبی مناسبت کی بنا پر انھوں نے خطوطِ غالب کی ترتیب وتحقیق کا بیڑا اٹھایا اور کم وبیش بارہ برس کی کڑی محنت وریاضت کے بعد پانچ جلدوں میں ''غالب کے خطوط'' کے عنوان سے عودِ ہندی، اردوے معلیٰ، مکاتیبِ غالب، نادراتِ غالب، غالب کی نادر تحریریں اور دیگر رسائل وجرائد میں شائع شدہ تقریباً تمام خطوط یکجا کر دیا۔ خطوط کو ترتیب دیتے وقت انھوں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ انھیں جہاں کہیں بھی غالب کے خطوط غالب کے خط میں ملے انھیں متن کے ساتھ شائع کر دیا۔ مکاتیبِ غالب کے تئیں خلیق انجم کی کاوش کو سراہتے ہوئے ظ. انصاری ''غالب کے خطوط پر خلیق انجم کا قابلِ قدر کام'' میں لکھتے ہیں:

> ''غالب خود اپنی تصانیف کی اشاعت پر جتنی دیدہ ریزی، احتیاط اور نفاست سے کام لیتے تھے، وہی یہاں بھی صرف ہوئی ہے۔ یعنی یہ مجموعہ واقعی غالب کے شایانِ شان ہے گویا ایک قبا ہے جو اس جامہ زیب استاد کے بدن پر راست آئی ہے۔
>
> شروع میں 220 صفحے کا مقدمہ جس کے کئی حصے میں تنقیدی اور علمی متن کے اصول جو رائج ہیں، جو متروک ہوئے، جو کام میں لائے گئے، پھر خطوطِ غالب کے آج تک کے سارے ایڈیشنوں کی تنقید، پھر ان خطوط کی خطوط نگاری کے پس منظر میں قدر و قیمت اور خصوصیات، پھر انڈکس اور متعلقہ وضاحتیں۔ اس طرح یہ مقدمہ بجائے خود ایک علمی تحقیقی

مقالے کا وزن رکھتا ہے۔''

(خلیق انجم کثیر الجہات شخصیت، مرتبہ: انیس دہلوی، سہ ماہی ایوان ادب کا خصوصی نمبر، 2000، ص88-187)

درج بالا اقتباس کے ذریعے ظ. انصاری نے خلیق انجم کو جس انداز سے خراج پیش کیا ہے وہ یقیناً اس کے مستحق تھے۔ اقتباس کے دوسرے پیرا میں طریقۂ کار کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام اسی طرح ہونا تھا۔ بہرحال اب آیئے ہم یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خطوطِ غالب کی ترتیب وتدوین یا تحقیق وتحشیہ کے لیے کن اصول و ضوابط یا کس قسم کے لائحۂ عمل کو اختیار کیا گیا۔

اس قسم کے کاموں میں سب سے پہلا مرحلہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ تصحیحِ متن کا ہے۔ تحقیق کے میدان میں یہ مرحلہ اس قدر صبر آزما اور دقت طلب ہوتا ہے کہ تحقیق سے ذہنی مناسبت نہ رکھنے والے محققین اس سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر اصل متن کہیں دور جا پڑتا ہے اور تحقیق کا سفر پہلی ہی منزل میں کھوٹا ہوجاتا ہے۔ خلیق انجم نے ان تمام ذرائع اور وسائل کو اختیار کیا جن سے خطوطِ غالب کی تلاش، تصحیح وترتیب کا کام باوزن اور معتبر ہوسکتا تھا۔ یعنی متن کے تصحیح کے لیے انھوں نے نسخۂ اساس ان نسخوں کو بنایا جو غالب کے ہاتھ کا لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ''عودِ ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' کے پہلے اڈیشن میں شائع شدہ خطوط کو بھی بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ چوں کہ ''عودِ ہندی'' کے بالمقابل ''اردوے معلیٰ'' میں طباعت کی غلطیاں قدرے کم تھیں اس لیے جو خطوط ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' میں مشترک تھے وہاں انھوں نے ''اردوے معلیٰ'' کے متن کو ترجیح دی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ اولین نسخے تھے تو پھر ان میں اختلافات یا تصحیح کی گنجائش کیوں کر پیدا ہوگئی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں مصنف جب کچھ تحریر کرتا ہے تو بعض دفعہ کوئی لفظ دوبارہ لکھ دیتا ہے یا لکھنے سے رہ جاتا ہے یا املا میں غلطی راہ پا جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں محقق کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ قیاسی طور پر اس متن تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہے تو یقیناً اس کی تحقیق قابلِ ستائش ہے۔ خلیق انجم نے خطوطِ غالب کے متن میں مختلف جگہوں پر اسی قسم کی قیاسی تصحیح کی ہے اور اس سے متعلق تفصیلات حاشیے میں درج کردی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان مکاتیب کی تیاری میں تقریباً بارہ برس کی طویل مدت صرف

ہوئی اور یہ ہونی ہی تھی، کیوں کہ خلیق انجم نے جس طرز پر ان مکاتیب کی تصحیح و ترتیب کا کام شروع کیا تھا وہ دقت طلب کے ساتھ دیر طلب بھی تھا۔ انھوں نے خطوطِ غالب کی تیاری کے لیے ان تمام نسخوں سے استفادہ کیا جو اس وقت تک منظر عام پر آ چکے تھے۔ مثلاً عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ کے مختلف نسخے، مکاتیبِ غالب (مولانا امتیاز علی خاں عرشی)، ادبی خطوط (مرزا عسکری)، خطوطِ غالب (مہیش پرشاد)، نادراتِ غالب (آفاق حسین آفاق)، خطوطِ غالب (غلام رسول مہر)، خطوطِ غالب (مہیش پرشاد، بہ نظر ثانی مالک رام) ان تمام نسخوں کا ایک دوسرے سے تقابل اور صحیح متن کی بازیافت واقعی خلیق انجم ہی کا حصہ تھا۔ ان نسخوں میں متن کی جو غلطیاں موجود تھیں اس کی طرف خلیق انجم نے واضح اشارے بھی کیے۔ مثال کے طور پر غلام رسول مہر کا مرتب کردہ ''خطوطِ غالب'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جن لوگوں نے مولانا مہر کی دوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے، وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مولانا ایک جیّد عالم تھے لیکن نہ جانے کیوں غالب کے خطوط کی ترتیب میں انھوں نے بہت لاپروائی بلکہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مولانا نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے 'خطوطِ غالب' کے عام نسخے لے کر کاتب کو دے دیے اور کتابت پڑھنے کا کام دوسروں سے لیا۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک غالب کے خطوط کا کوئی مجموعہ اتنا غلط نہیں چھپا، جتنا کہ 'خطوطِ غالب' ہے۔ متن کی حالت یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جس میں متن کی آٹھ دس سے کم غلطیاں ہوں۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ نواب حسین مرزا کے نام غالب کے چار خط 'اردوئے معلیٰ' میں شامل تھے۔ دو مزید خطوں کے عکس بعد میں شائع ہوئے۔ مولانا نے چھوؤں خط اپنے مجموعے میں شامل کر لیے جن خطوط کے عکس ان کے پیشِ نظر تھے، ان میں سے ایک کے متن میں تیس اور دوسرے کے متن میں نو غلطیاں ہیں، اس لیے اس مجموعے پر مزید تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔''

(غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ: خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، 2011، ص 53-52)

اس طرح کی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن کی طرف خلیق انجم نے واضح اشارے کیے ہیں۔ بہرحال ''غالب کے خطوط'' ترتیب دیتے وقت انھوں نے جس بات کا خاص خیال رکھا وہ املا کی تبدیلی کا تھا۔ یعنی غالب کے زمانے میں جو املا رائج تھے اس کے برعکس جدید املا کا استعمال روا رکھا گیا، تاکہ جن قارئین کے لیے یہ خطوط ترتیب دیے جا رہے تھے ان تک باتیں باآسانی پہنچ سکیں۔ لکھتے ہیں:

> ''متنی نقاد متن کے لیے اپنے عہد کی املا کا استعمال کرتا ہے یا اس املا کا جس میں مصنف نے متن لکھا تھا۔ میں اس حق میں ہوں کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے، کیوں کہ اول تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کرتے ہیں اور دوسرے متنی نقاد کا مقصد متن کی بازیافت ہے، املا کی بازیافت ہرگز نہیں۔'' (غالب کے خطوط، جلد اول، ص۔19)

یہ بات صد فیصد درست ہے کہ متن (املا) جب موجودہ عہد کے قارئین کے مطابق ہوگا تو قارئین اس کے بین السطور سے واقف ہوسکیں گے اور مرتب اپنے مقصد میں کامیاب۔ غالب نے جس زمانے میں خطوط نگاری کا سلسلہ شروع کیا تھا اس وقت سے لے کر آج تک ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران املا میں بے شمار تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال میں پہلے کوئی فرق نہ تھا، غالب نے بھی اپنے خطوط میں اسی طرز کو اپنایا ہے۔ الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان بہت زیادہ تھا مثلاً نوابصاحب، بیگمصاحبہ، جوابمیں، غزلونکو وغیرہ اس کا بھی خط میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اعراب بالحروف اوس، اون، اوترنا وغیرہ، اسی طرح ہکاری آواز والے الفاظ جیسے بہوکا (بھوکا)، بہاری (بھاری)، کہانا (کھانا)، گہر (گھر) وغیرہ کا چلن عام تھا۔ علاوہ ازاں نون غنہ اور نون ساکن کے مابین کوئی فرق نہ تھا یعنی متن میں نون غنہ ہو یا نون ساکن، لکھتے نون ہی تھے مثلاً ہون، مین، وہان، لوگون وغیرہ۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں خلیق انجم نے پیش کی ہیں جو مضمون کی طوالت کے باعث حذف کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خلیق انجم نے مقدمے میں غالب کے تعلق سے جہاں دیگر تفصیلات کا ذکر کیا ہے وہیں اس بات کی بھی نشان دہی کی ہے کہ ان کی تحریروں میں فارسی اور انگریزی کے الفاظ کس طرح استعمال میں آئے۔ اس قسم کے الفاظ کی نشان دہی کرتے ہوئے ان سے غیر دانستہ طور پر بعض

غلطیاں سرزد ہوگئیں، جس کی طرف ظ۔انصاری نے بھی اشارہ کیا ہے۔درجِ ذیل میں خلیق انجم کے مقدمے سے چند ایسی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جہاں خلیق انجم سے سہو ہوا ہے:

''بابو صاحب کے واسطے میرا 'دل بہت جلا'، 'میرا دل بہت جلا'، 'دلم سوخت' کا ترجمہ ہے ——— بنام سید بدرالدین احمد فقیر''

(غالب کے خطوط، جلد اول، ص۔81)

یہاں خلیق انجم سے غلطی صادر ہوئی ہے کیوں کہ ''دل بہت جلا''، ''دلم سوخت'' کا ترجمہ نہیں بلکہ یہ ٹھیٹھ دہلوی لفظ ہے۔

''اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے، تو میں مارہرہ کو آتا ہوں۔ ''نقش قبول کرنا''، ''نقش قبول کردن'' کا ترجمہ ہے۔

بنام چودھری عبدالغفور سرور''

(غالب کے خطوط، جلد اول، ص۔81)

''نقش قبول کرنا'' قبول کردن سے نہیں بلکہ ''نقش پذیرفتن'' سے اخذ کیا گیا ہے:

''تمھارے تنہا اور بے مربی رہ جانے کا میں نے بہت 'غم کھایا'۔ 'غم خوردن' کا ترجمہ ہے۔ ——— بہاری لال مشتاق''

(غالب کے خطوط، جلد اول، ص۔81)

غم کھانے کا استعمال بھی غالب نے فارسی کے غم خوردن سے لیا ہے۔ جب کہ دکنی ادب میں اس کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں۔

بہرحال اس کے بعد خطوط میں استعمال کیے گئے انگریزی الفاظ کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی گئی ہے۔ غالب نے کس کے نام کتنے خطوط لکھے اس کا بھی اندراج موجود ہے۔ بعدازاں 128 صفحات پر غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ، اردو مکتوب نگاری کا آغاز، مکتوب نگاری کا فن اور بالخصوص غالب کی مکتوب نگاری وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کا مقدمہ ایک مکمل اور مبسوط کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی خلیق انجم کی مرتب کردہ کتاب ''غالب کے خطوط'' (پانچ جلدیں) انھیں غالب کے اہم ترین محقق کے طور پر پیش کرتی رہے گی۔

○○○

ضیاءاللہ انور

خلیق انجم: خاکہ نگار اور محقق کی جنگ

(’مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا‘ کے حوالے سے)

سرزمینِ دہلی نے اپنی کوکھ میں کتنے اور کیسے گہر پاروں کو سمیٹ رکھا ہے۔ حالیہ دنوں میں اردو کے نامور ادیب، محقق، مدون، متنی تنقید کے خالق، مترجم اور مبصر خلیق انجم بھی دہلی کی خاک میں جا ملے۔ خلیق صاحب نے کئی جہتوں پہ زندگی بسر کی ہے۔ اردو ادب میں ان کی بنیادی حیثیت ایک محقق کی ہے۔ ان کی متنی تنقید، خطوطِ غالب کی تدوین اور سوداؔ پر کی گئی تحقیق ادب میں انھیں ہمیشگی بخشتی ہیں۔ ادب کے مین اسٹریم سے ذرا ہٹ کر دیکھیں تو خلیق انجم کی خاکہ نویسی پر بھی نظر جاتی ہے۔

خلیق صاحب نے کئی ایک خاکے بھی لکھے ہیں۔ ’’مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا‘‘ ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جسے کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ اس میں سترہ شخصیات کے خاکے ہیں۔ یہ تمام شخصیات نہایت معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ان میں دہلی والے بھی ہیں اور باہر والے بھی۔ ادب کی ان برگزیدہ شخصیات کو خلیق صاحب نے جیسا دیکھا، سنا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر جیسا پایا ہو بہ ہو ویسا ہی پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے کہیں ملمع سازی کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی واقعات میں کتر بیونت کی ہے۔ واقعات کی جزئیات اور ان کی تفصیلات کے سبب خاکے کا فن مجروح ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خلیق صاحب کا

تحقیقی ذہن یہاں بھی کارفرما نظر آتا ہے جو خاکہ نگار کو آگے آنے نہیں دیتا ہے۔ وہ تحقیق کی روش پر چلتے ہوئے کسی بات یا واقعے کی پردہ پوشی نہیں کرتے۔ بایں ہمہ اس کے توسط سے ان شخصیات کی ظاہری و باطنی دنیا، ان کی فکری جہت واضح صورت میں ہماری نظروں کے سامنے آتو جاتی ہیں لیکن خاکہ خاکہ نہیں رہ پاتا سوانحی مضمون بن جاتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی اس پہلو پر اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> ''واقعات و حالات اور اشخاص کے بیان میں انھوں نے بالعموم تخیل سے زیادہ اپنے مشاہدے اور تجربے سے کام لیا ہے۔ تخیل کہیں در آیا بھی تو اس طرح کہ اسے ذرا بھی بے قابو نہیں ہونے دیا، اسی لیے یہ خاکے سوانحی مضامین کا انداز بھی رکھتے ہیں اور انھیں ادبی تاریخ کے ایک حصے کے طور پر جگہ مل سکتی ہے''۔ (مقدمہ 'مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا'، ص16)

سوانحی مضامین اور ادبی تاریخ خلیق صاحب کے ان خاکوں کے متعلق شمیم حنفی کی یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔ دراصل شخصی خاکوں میں کسی شخص کی زندگی کے چند واقعات کی مدد سے اس کی ایک تصویر سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں اس شخص کے خاندانی پس منظر اور بچپن کی باتیں درج کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ نہ ہی واقعات اور ملاقات کی بے جا تفصیل۔ ان کا سروکار خاکہ کے بجائے اس شخص کے سوانحی مضامین اور ادبی تاریخ سے جڑتا ہے۔ بایں ہمہ شمیم صاحب نے خلیق انجم کے ان خاکوں کو سوانحی مضامین اور ادبی تاریخ کا نام بھی دیا ہے۔ خلیق انجم کے کئی ایک خاکوں میں یہ نقص پایا جاتا ہے۔ بیگم حمیدہ سلطان کے خاکے میں یہ نقص سب سے زیادہ کھلتا ہے۔ بیگم حمیدہ سلطان جسے خلیق صاحب حمیدہ آپا کہتے ہیں۔ دہلی کی ایک باوقار اور باثروت خاتون تھیں۔ ان کی اردو دوستی اور اردو سے محبت کی ایک مثال علی منزل تھی جسے انھوں نے حکومتِ وقت سے حاصل کیا تھا۔ خلیق صاحب اپنے اس خاکہ (جو خاکہ نہیں سوانحی مضمون ہے) میں بات دلّی کی عظمت سے شروع کرتے ہیں اور بیگم حمیدہ کے خاندانی عظمت و شرافت پر ختم کر دیتے ہیں۔ درمیان میں ایک دو جگہ ان کی ادبی زندگی پر بات کی گئی ہے۔ ان کے دو ناولوں اور ایک تحقیقی مقالہ ''خاندانِ لوہارو کے شعرا'' کا ذکر کیا گیا ہے بس اللہ اللہ خیر صلا۔ اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ ''حمیدہ آپا ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے اعلا خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اسی لیے وہ انتہائی شریف، مہذب، دیانت دار اور خدا ترس ہیں''

(’مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا‘،ص:290)۔خاکہ کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ ایسے واقعات ہوں جن سے شخصیت کے بھید کھلتے ہوں۔کچھ ایسے عناصر کی نشان دہی کی جائے جو اس شخصیت میں کلید کی حیثیت رکھتے ہوں۔خلیق صاحب کے اس خاکے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اس بنیاد پر اسے خاکہ کے بجائے سوانحی مضمون کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تھوڑا توقف کے ساتھ خاکہ کے متعلق شمیم حنفی صاحب ہی کی ایک دو بات درج کرتا چلوں تا کہ خاکہ نگاری کی ایک واضح صورت ہمارے سامنے آجائے۔شمیم حنفی صاحب نے اپنی مرتبہ کتاب ’آزادی کے بعد دہلی میں خاکہ نگاری‘ کے مقدمے میں خاکہ نگاری کے فن کے متعلق یوں لکھا ہے:

> ’’خاکہ نگاری نہ تو سوانحی مضمون ہے، نہ زندگی کے کسی شعبے میں موضوع بننے والی شخصیت کے کارناموں کی تفصیل...خاکہ نگاری تاریخ اور تخیل سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ لکھنے والا جب کسی شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو واقعات،سوانح،خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور قیاسات سے بھی مدد لیتا ہے‘‘۔(آزادی کے بعد دہلی میں خاکہ نگاری،مرتبہ شمیم حنفی،ص:10)

> ’’کسی شخصیت کے ایسے عناصر جو مرکزی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہوں یا اس سے وابستہ ایسے واقعات جن سے شخصیت کے بھید کھلتے ہوں،خاکہ نگار کا بنیادی سروکار انہی سے ہوتا ہے۔(ایضا،ص:11)

خلیق صاحب اپنے خاکوں میں ان اصول کی پابندی کرتے نظر نہیں آتے۔ان کا اپنا انداز ہے۔ وہ اپنے انداز میں خاکہ لکھتے ہیں جس میں تخیل کی آمیزش نہیں۔عبارت آرائی،مبالغہ آمیزی اور کسی قسم کا لفظی بناؤ سنگار نہیں۔سیدھے سادے انداز اور عام فہم زبان میں وہ خاکہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔لیکن فنی نقطۂ نظر سے اس پر ان کی گرفت کی جاسکتی ہے۔خاکہ کی خوبیاں اپنی جگہ لیکن فنی خوبیوں کو نظر انداز کرنا خاکہ کے فن پر چوٹ کرنے کی مانند ہے جس سے خاکہ کا فن مجروح ہوتا ہے۔بایں ہمہ ان کے خاکوں کی ایک بڑی خامی سطور بالا میں درج کی گئی۔ان کے خاکوں کی ایک اور بات جو قاری کو کھلتی ہے وہ ان کی ذات ہے۔خلیق صاحب کی ذات کم وبیش

ہر ایک خاکے میں دکھائی دیتی ہے اور خاکہ نگار ہر ایک شخصیت کے ساتھ اپنی شخصیت کی پرتیں بھی کھولتا جاتا ہے جس کی وجہ سے بھی خاکہ کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شمیم صاحب نے زیرِ بحث کتاب کے مقدمے میں درج کیا ہے:

''شخصی خاکوں پر مشتمل اس کتاب میں جن لوگوں کی شبیہ دکھائی دیتی ہے، اور مضامین کی فہرست میں جن لوگوں کے نام شامل ہیں، ان میں ایک اور نام کا اضافہ کر لیجیے، جو بظاہر کسی خاکہ کا موضوع نہیں ہے۔ یہ نام اس کتاب کے مصنف خلیق انجم کا ہے''۔ (ص۔13)

اس طرزِ نگارش کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ خلیق صاحب کا تعلق ان شخصیات سے براہِ راست رہا تھا اور متعدد بار ملاقاتیں بھی رہیں۔ بایں ہمہ وہ ان ملاقاتوں کو اس کے مکمل سیاق وسباق میں پیش کرتے ہیں جو ان کے خاکوں کا نقص بن جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاکہ ان ملاقاتوں کے ذریعے ہی آگے بڑھتا ہے، لیکن خلیق صاحب کے یہاں یہ ملاقاتیں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ خاکہ نگاری کے فن کو مجروح کرتی ہیں۔ امتیاز علی خاں عرشی پر لکھا ہوا خاکہ پڑھتے وقت ہمیں اس کمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر ہی ہمیں اندازہ ہوتا ہیکہ یہ عرشی کے بجائے اپنی روداد بیان کر رہے ہیں۔ لیکن آگے چل کر سنبھالا لیتے ہیں باوجود اس کے وہ ایک دو جگہ مات بھی کھا جاتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی اور پی ایچ ڈی کے متعلق ان کا اپنا تفصیلی بیان بے جا معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ اسے نہ بیان کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا، ایسی صورت میں خاکہ زیادہ مربوط ہو جاتا اور خاکہ کے فن پر بھی پورا اترتا۔ خلیق انجم کے خاکوں کا رنگ زیادہ تر وہاں ابھرا ہے جہاں اہلِ دہلی کا ذکر آیا ہے۔ دراصل دہلی والوں کے جو خاکے انھوں نے لکھے ہیں خاکہ نگاری کا اصل رنگ وہیں کھلتا ہے (بجز بیگم حمیدہ سلطان کے)۔ دہلی اور اہلِ دہلی سے ان کی نسبت ذاتی اور جذباتی دونوں رہی ہے۔ وہ خود دہلی کے تھے۔ دہلی کی ادبی شخصیات اور ادبی محفلوں سے انھوں نے خوب استفادہ کیا تھا۔ اس بستی کے دکھ، درد اور مسئلوں، بکھیڑوں میں وہ شامل رہے ہیں۔ دہلی کے صبح وشام سے ان کی اپنی شخصیت اور ذہنی ارتقا کی کہانی وابستہ ہے۔ ان کی تحریروں کے واسطے سے ہمیں دلّی کے ادبی، لسانی اور سماجی کلچر کا چہرہ نظر آتا ہے اور اس کلچر کے تعمیر کرنے والے عالموں اور عامیوں کا بھی۔ ان چہروں سے تعارف کا مطلب ہے ایک پوری تہذیب سے متعارف ہونا۔ اس کتاب کا حرفِ آغاز اس تہذیب اور دہلی کی کہانی کا ایک عمدہ نمونہ

ہے۔ تقسیم کا سانحہ اور نقلِ مکانی کا سلسلہ اور لٹتی دہلی کی تہذیب، تقسیم کے بعد اس تہذیب کا سمٹنا اور چنڈو خانہ یعنی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی چائے کی دکان جو ادیبوں کا مرکز تھی کا اجڑنا اس تہذیبی روایت کا مدھم پڑنا تھا۔ دہلی کی بپتا اور وہاں کی ادبی شخصیات کو خلیق صاحب نے اپنے خاکوں میں زندہ کر دیا ہے۔ استاد رسا دہلوی اور زتشی زار دہلوی کا خاکہ اس کی اچھی مثال ہے۔ استاد رسا دہلوی کا خاکہ لکھتے ہوئے انھوں نے دہلی کی اردو تہذیب کو جس انداز سے بیان کیا ہے، اس پس منظر میں استاد رسا دہلوی کا خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے:

> ''چھریرا بدن، لمبا قد، فوجی جوانوں کی طرح سیدھی کمر، سر پر خشخاشی بال، گھٹا ہوا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی جس پر بیچوں بیچ نماز کا سیاہ گٹا، لمبی ناک، لبیں ترشی ہوئی، اچھی خاصی نوک دار لمبی سفید داڑھی جس میں دو چار سیاہ بال بھی ہیں۔ پان بہت کھاتے ہیں، اس لیے ہونٹوں کے دونوں کنارے پان کی پیک سے سرخ رہتے ہیں''۔ (ص:234)

خلیق انجم کی ان آڑی ترچھی لکیروں سے استاد رسا کا ظاہری خدوخال نظر میں پھر جاتا ہے۔ مزید آگے کے واقعات اور حالات سے ان کی شخصیت بھی قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی کا خاکہ بھی اس نوعیت کا ایک اچھا خاکہ ہے۔ اس خاکے کی اچھی بات یہ ہے کہ زتشی زار دہلوی کی نستعلیق اور انسان دوست شخصیت کے پس منظر میں دہلی کی گنگا جمنی تہذیب جسے اردو تہذیب کہتے ہیں نظروں میں پھر جاتی ہے اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ پنڈت زتشی کی شخصیت دھندلا رہی ہو۔ خلیق صاحب نے زتشی زار کی شخصیت اور دہلی کی اردو تہذیب کو اس انداز سے ایک دوسرے میں گھلا ملا دیا ہے کہ ان کے خاکے میں قدیم دلی کی تہذیب چلتی پھرتی نظر آتی ہے:

> ''تربھون ناتھ زار زتشی صاحب دہلی کی تہذیب و تمدن کے اعلا ترین نمونہ تھے۔ انتہائی مہذب، شریف، نیک، کم گو... بہت دھیمے لہجے میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتے تھے... لباس دہلی کے شرفا کا چوڑی دار پایجامہ، شیروانی۔ شیروانی ہی کے رنگ کی ٹوپی، جے پوری جوتیاں، سفید جرابیں، ہاتھ میں ایک خوب صورت اور نازک سی چھڑی''۔ (ص۔55)

''زار صاحب جس مکان میں رہتے تھے۔ وہ بالکل مشرقی طرز پر بنا ہوا ہے بلکہ اس کا طرزِ تعمیر ہندو مسلم کلچر کی یادگار ہے''۔ (ص۔57)

''ایک تو وہ دلی والے اور سونے پر سہاگہ داغ کے شاگرد، اس لیے زبان اور محاورے کے معاملے میں ان کا فرمایا ہوا مستند تھا''۔ (ص۔58)

اور بالآخر خلیق صاحب کا یہ انداز:

''صدیوں کی پروردہ قدیم دلی کی مشترکہ ہندو مسلم تہذیب، کبیر، نانک اور چشتی کی انسان دوستی اور کشادہ ذہنی، دلی کی وضع داری اور رواداری، شرافت اور انسانیت، علم و فضل، دہلی کی ٹکسالی زبان اور داغ دہلوی کی دبستانِ شاعری کا 6 اکتوبر 1965 کو چار بج کر چالیس منٹ پر انتقال ہو گیا یعنی پنڈت تربھون ناتھ زار زتشی دہلوی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے''۔ (ص۔53)

موخرالذکر اقتباس میں ہمیں خلیق صاحب کا تخلیقی ذہن کارفرما نظر آتا ہے کہ کس خلاقی سے انھوں نے زار صاحب اور دہلوی تہذیب کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا ہے۔ یہ ایک اچھے خاکہ نگار کی خوبی ہے اور ایک اچھے خاکے کا علامیہ ہے کہ اس شخصیت کے ساتھ اس کی تہذیب، اس کا عہد بھی قارئین کو دکھائی دے جائے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خلیق صاحب کے خاکوں میں یہ انداز کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔

واقعات کا تفصیلی ذکر جیسا کہ کہا گیا خلیق صاحب کے محقق ہونے کی دین ہے اور ان کی تحریروں کا خاصہ بھی ہے۔ ان کا تحقیقی ذہن ہر ایک جا متحرک نظر آتا ہے، جو تحقیق و تدوین کی راہ میں تو کارآمد ہے لیکن اس سے خاکہ نگاری کے فن کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ان کا یہی تحقیقی ذہن ان کے اندر کے خاکہ نگار کو ابھرنے نہیں دیتا ہے۔

○○○

نثار احمد فاروقی

خلیق انجمن

شاید پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے مجھے جے پور میں ایک غیر مسلم دوست ملے جو کبھی دہلی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور اُس زمانے میں اُن سے ہماری ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا 'خلیق انجمن' کا کیا حال ہے؟ میں نے انھیں بتایا کہ اُن کا نام خلیق انجم ہے۔ مگر اب خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے صحیح کہا تھا 'نقوش' کے ایڈیٹر محمد طفیل خلیق انجم کو خلیق انجمن ہی کہا کرتے تھے۔ خلیق انجم اب خلیق انجمن ہی بن چکے ہیں۔ میرا ان سے ربط و تعلق 1955 یا 1956 سے ہے۔ یعنی تقریباً 48-47 سال ہو گئے اس مدت میں عمر کا بہترین حصہ نبٹ گیا۔ یہ مدت کسی کو جاننے پہچاننے اور جانچنے پرکھنے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ میں نے خلیق انجم کو ہر حال میں دیکھا ہے۔ وہ علی گڑھ سے بی اے کر کے آئے تھے۔ اس زمانے میں مسلمان نوجوانوں کے لیے کسی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمت کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ (اور اب بھی کون سا دیکھا جا سکتا ہے؟) جس کے پاس کوئی سند سرٹیفکٹ ہوتا تھا وہ پاکستان کا رخ کرتا تھا۔ خلیق نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں لیکن پاکستان جانے کا خیال کبھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔ خلیق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود بین اور جھوٹے پندار میں مبتلا رہنے والے نہیں، جس کام کو وہ کرنا چاہیں اسے چھوٹا اور حقیر نہیں سمجھتے اور ہر کام کے بارے میں وہ اپنے اندر اعتماد پیدا کر لیتے ہیں۔ انھوں نے بیکار بیٹھنا تو سیکھا ہی نہیں، ہمیشہ خود کو مصروف رکھا اور جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اسے انجام تک پہنچا کر چھوڑا۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد انھوں نے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہنا گوارا نہیں کیا اور خانقاہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی مسجد کی پشت پر ایک چھوٹی سی دکان میں بجلی کے پنکھوں کی مرمت شروع کر دی۔ خلیق کی زندگی کا بڑا المیہ تھا کہ وہ شاید 7-6 سال کے ہی تھے، جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کے ذہن میں اب اپنے والد کی صورت بھی زیادہ روشن نہیں

ہے۔ بقول بسمل سعیدی:

ان کی صورت کا تصور ہے اب اتنا مبہم جیسے دیکھا نہ ہو آنکھوں نے سنا ہو اُن کو

وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور پانچ بہنیں تھیں۔ ایک بیوہ ماں تھیں۔ اُس کٹھن دور میں ایک ایسے بڑے کنبے کو پالنا خود ہی بہت بڑا مجاہدہ تھا مگر خلیق کی والدہ ایک مثالی خاتون تھیں انھوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو بڑھایا اور ایک اسکول میں پہلے استانی اور پھر ہیڈ مسٹریس ہو گئیں۔ پھر نہایت سلیقے اور تدبیر و تدبر سے نہ صرف اپنے گھر کو چلایا بلکہ اپنی اولاد کو بھی اعلا ترین تعلیم دلائی اسی طرح بچیوں کی شادیاں کیں اور اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتی تھیں کیوں کہ وہ اُن کے دکھ درد کو اپنے ذاتی تجربے سے محسوس کر سکتی تھیں۔ کسی بھی انسان کی شخصیت اور سیرت، مزاج اور اخلاق کا سانچا بنانے میں مختلف لوگوں کا خاموش حصہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پڑوسی اور محلے قبیلے والے بھی براہِ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوتے ہیں، مگر سب سے زیادہ گہرا اور پائیدار اثر ماں کی تربیت ہی کا ہوتا ہے۔ خلیق بار بار اس کا ذکر کرتے ہیں کہ اُن کے مزاج میں جو خود اعتمادی ہے وہ ان کی والدہ مرحومہ کا دیا ہوا درس ہے ورنہ آزمائش کے ان دشوار مرحلوں میں اگر ان کی والدۂ مرحومہ ہمت اور صبر سے، اعتماد اور ثابت قدمی سے کام نہ لیتیں تو خلیق بھی ایک افسردہ، مایوس اور کم حوصلہ انسان بن گئے ہوتے اور وہ اُن کامیابیوں کو ہرگز نہیں پا سکتے تھے جو انھوں نے صرف اپنی انتھک محنت اور مجاہدے سے حاصل کیں۔

خلیق ابھی شاید 18-17 سال کے ہی تھے کہ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ سے ایک ماہانہ رسالہ بھی 'جھلک' کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس کے مالک تو علی گڑھ کے کوئی صاحب تھے جن کا ایک پریس بھی تھا مگر خلیق انجم نے اس کی ادارت سنبھال رکھی تھی۔ پھر وہ دہلی آئے تو یہاں جو کام بھی ملا اس سے اپنے جسم و جان کا رشتہ بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ حاصل کرتے رہے۔ اس وقت اردو ایم اے کورس صرف دہلی کالج میں تھا، طالب علم اکا دکا ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں دلی اسکول آف اکنومکس کی طرف سے گریٹر دہلی سروے ہو رہا تھا۔ خلیق اور اسلم پرویز اس سروے میں Field Investigator ہو گئے اور انھیں خاصا معاوضہ ملنے لگا۔ دو ڈھائی سال بعد یہ سروے ختم ہو گیا۔

خلیق کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ وہ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے ملیں گے اور جو کام کریں گے اُسے پورے اعتماد اور خوش دلی سے انجام دیں گے۔ دوسری صفت یہ کہ وہ قنوطی اور یاس پسند نہیں، انھوں نے ہر مرحلے کو ہنستے ہنساتے طے کیا ہے۔ مجھے ان کے خانگی حالات کا اپنے طور پر علم ہے ورنہ اتنی طویل مدت میں کبھی خلیق نے اپنے ماضی یا حال کی کسی پریشانی اور تکلیف کا

مجھ سے کیا کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا، جو بھی افتاد پڑی اُسے خود ہی برداشت کیا ہے۔

ایم اے کرنے کے بعد وہ کروڑی مل کالج اور پھر رام جس کالج میں پارٹ ٹائم لیکچرر ہو گئے تھے۔ اُس وقت کروڑی مل کالج میں اردو لیکچرر کی پوسٹ ختم کی جا چکی تھی اور یہ شعبہ بند ہونے والا تھا، مگر اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ تھے جو بعد میں دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پھر کیرالا اور گجرات کے گونر بھی ہوئے، وہ اردو کے پریمی تھے۔ انھوں نے خلیق سے کہا کہ تم لائبریری سائنس کی ڈگری لے لو اگر اردو لیکچرر کا تقرر نہ ہو سکا تو تمھیں کالج کا لائبریرین بنا دیا جائے گا۔ خلیق نے لائبریری سائنس میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے اچھے نمبروں سے لائبریری سائنس کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور ساتھ میں کچھ کماتے بھی رہے۔ اُس سے اگلے سال انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے لنگوسٹکس میں ڈپلوما کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔ میں نے کبھی اُن سے زمانے کی شکایت سنی، نہ انھیں دکھی پایا، نہ اُن کے اعتماد میں کوئی شکست و ریخت دیکھی۔ اس طرح کے حالات میں پلنے والوں کا رویّہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے:

دنیا نے حادثات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

مگر خلیق محنت کرتے رہے، ہنستے اور ہنساتے رہے۔ اب وہ کروڑی مل کالج میں مستقل لیکچرر ہو چکے تھے اور وہاں جو شعبہ بند ہو گیا تھا اُسے انھوں نے نئی زندگی بخش دی۔ نئے کورس شروع کیے، نئے تقرر ہوئے اور یہاں کا اردو شعبہ دیکھتے دیکھتے قابلِ رشک بن گیا۔ اس کالج میں کئی سمینار اور مشاعرے بھی ہوئے۔ فراق پر دو دن کا سمینار منعقد ہوا۔ دو دن تک غالب کا جشن منایا گیا۔ خلیق انجم اب ریسرچ کر رہے تھے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا موضوع تھا ''مرزا مظہر جان جاناں اور اُن کی شاعری'' یہ مقالہ بھی انھوں نے بہت انہماک اور سخت محنت سے دو ہی سال میں تیار کر لیا۔ اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک کا ترجمان رسالہ 'شاہراہ' دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اُس نے ایک ناولٹ نمبر نکالنے کا اعلان کیا، خلیق نے اُس کے لیے ایک تامل ناول 'سلا پتی کارم' کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد روسی زبان کے ناول 'تاراس بلبا' کا ترجمہ بھی کر ڈالا، جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس نمبر کے لیے میں نے گجراتی زبان میں پنالال پٹیل کے ناول 'بیٹی کی وداع' کا ترجمہ کیا تھا۔ خلیق انجم نے اُسی زمانے میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کا بھی فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ مکتبہ برہان دہلی سے شائع ہوا تھا۔ خلیق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سیکھنے سے نہیں شرماتے اور اپنی ہمہ دانی یا علم و فضل کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ آج بھی جب کہ وہ برِّصغیر کے ایک معروف و ممتاز اہلِ قلم ہیں، انھیں کسی لفظ میں شبہ ہو یا کوئی مسئلہ وضاحت سے سمجھنا

چاہتے ہوں تو وہ مجھے یا کسی دوست کو ٹیلی فون کریں گے اور اپنی دشواری بیان کریں گے۔ اگر کبھی میں انجمن کے دفتر میں ہوں اور وہ کسی موضوع پر کوئی مضمون یا اپنی کسی کتاب کا کوئی حصہ لکھ رہے ہوتے ہیں تو لکھے ہوئے کاغذ میرے سامنے ڈال دیں گے اور بہت بے تکلفی سے کہیں گے: لو ذرا اس پر ایک نظر ڈال لو، میں پڑھنا شروع کروں گا تو ذرا سا جھنجھلا کر کہیں گے: ''یار، یوں نہیں، قلم ہاتھ میں لے کر پڑھو اور جہاں چاہو ترمیم کر دو۔'' یہ بہت بڑی صفت ہے جو ایک محقق میں ہونی چاہیے اور کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کا ترجمہ کرنے کے زمانے میں وہ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ فلور پر باقاعدہ بیٹھتے تھے اور جتنا ترجمہ کرتے تھے اُس کے ایک ایک لفظ پر میرے ساتھ بیٹھ کر بحث کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ مرزا سودا پر بھی کچھ مواد جمع کر رہے تھے اور یہ کتاب بھی انھوں نے بہت جلد تیار کر لی۔ کتاب بہت ضخیم تھی اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی مالی حالت اس وقت بہت اچھی نہیں تھی۔ انھوں نے اس وقت کے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری پروفیسر آلِ احمد سرور کو اس کا مسودہ بھیج دیا۔ سرور صاحب کو یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ انھوں نے انجمن کی ادبی کمیٹی سے اُس کی طباعت منظور کرالی اور خلیق سے کہا کہ وہ اپنی نگرانی میں دلی سے شائع کرالیں۔ خلیق نے اتنی ضخیم کتاب تین مہینے میں چھپوالی۔ اس سے پہلے وہ ایک اور کام کر چکے تھے جس کا میں تذکرہ کرنا بھول گیا۔ جب وہ ایم اے کر چکے اور یہ آثار پیدا ہوئے کہ انھیں کسی کالج میں لیکچرر کی جگہ مل جائے گی تو انھوں نے سوچا کہ کوئی مطبوعہ کتاب بھی ہونی چاہیے۔ اس وقت ان کے کچھ مضامین تو چھپے ہوئے تھے، کتاب کوئی نہیں تھی، خلیق نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کسی چھوٹی سی کتاب کو ایڈٹ کر دو اور اس پر ایک مقدمہ لکھ دو۔ یہ کام جلدی ہو جائے گا۔ میں نے 'معراج العاشقین' کا نام تجویز کیا جو حضرت گیسو درازؒ سے منسوب ہے مگر اب ڈاکٹر حفیظ قتیل اور دوسرے دکنی ادب کے عالموں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا حضرت گیسو درازؒ سے انتساب درست نہیں۔ اس وقت تک اسے ان کی تصنیف ہی سمجھا جاتا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی اسے شائع کر چکے تھے۔ خلیق نے اس پر کام کرنا شروع کر دیا اور یہ مکتبہ شاہراہ سے چھپنے لگی مگر اسی دوران میں ایک فنکار نے اسے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ مجھے یہ ناگوار ہوا اور میں نے اُن صاحب سے خاصی تکرار بھی کی مگر کچھ دنوں کے بعد دیکھا کہ خلیق کی پھر اُن سے دوستی ہو گئی۔ بس اس پوری مدت میں یہی ایک واقعہ ایسا تھا جس نے میرے دل میں ان کی طرف سے رنجش پیدا کر دی تھی، ورنہ وہ جب بھی ملے ہیں ان سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے 'مخطوطہ شناسی' پر ایک کورس شروع کیا۔ مشکل یہ تھی کہ مخطوطہ شناسی پر اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جسے نصاب میں شامل کیا جا سکے۔ اس موضوع پر سب

سے پہلے خلیق نے 'متنی تنقید' کے نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے بعد تو کچھ اور کام بھی ہوئے ہیں مگر تقدم کی فضیلت خلیق ہی کو حاصل رہی۔

1968 میں مرزا غالب کی وفات کو سو برس پورے ہو رہے تھے۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے مجلّہ 'اردوئے معلیٰ' کا غالب نمبر شائع کرنے کی تیاری تھی۔ خلیق کیسے پیچھے رہتے۔ مجھ سے پوچھا کہ کس موضوع پر لکھا جائے۔ میں نے یوں ہی کچھ سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا کہ مرزا غالب کی مختلف قیام گاہوں کو اپنے مضمون کا موضوع بنا لو۔ جنات اگر کسی کے تابع ہو جائیں تو بس انھیں ایک اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خلیق بھی جنات کی طرح کام کرتے ہیں۔ مضمون لکھنا شروع کیا تو آگرے سے دہلی تک غالب کی ساری قیام گاہوں کی تاریخ مرتب کر کے رکھ دی۔ ایک دن میں نے برسبیلِ تذکرہ کہا کہ غالب کے بہت سے خطوط جو عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں نہیں ہیں اور بعد میں دریافت ہوتے رہے ہیں وہ اِدھر اُدھر مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں ان کو اگر جمع کیا جائے تو غالب کے خطوط کا ایک نیا مجموعہ تیار ہو جائے گا۔ لیجیے جنات کو اشارہ مل گیا اور کچھ دن کے بعد نئی کتاب 'غالب کی نادر تحریریں' وجود میں آ گئی۔ اب تو انھوں نے غالب کے سارے خطوط چار جلدوں میں بہت محنت سے مرتب کر دیے ہیں جو غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے شائع ہوئے ہیں اور پاکستان میں بھی طبع ہو چکے ہیں۔ اب وہ موضوعاتی اور توقیتی اشاریے کے انداز میں اس کی پانچویں جلد بھی تیار کر چکے ہیں۔ جو حال ہی میں شائع ہو گئی ہے۔

خلیق انجم دلی اردو اکیڈمی کے ممبر ہو گئے تھے تو وہاں بھی نشر و اشاعت کے کام میں ایک دم تیزی آ گئی تھی اور اس کا سبب یہ بھی تھا کہ اکادمی کے بانی سکریٹری شریف الحسن نقوی جیسے فعال اور قدر دان شخص تھے اور پھر خلیق اکیڈمی کی 'تحقیقی و اشاعتی' کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہو گئے تھے۔ خلیق نے اکادمی کے لیے بھی کئی کتابیں مرتب کیں اور ایک پروجیکٹ تو ایسا لیا کہ شاید ہی کوئی شخص اُسے تنہا انجام دینے کی ہمت کر سکتا تھا۔ سرسید احمد خان کی کتاب 'آثار الصنادید' کے نئے اڈیشن کی تیاری بھی خلیق کا بہت قابلِ تعریف کام ہے اسے انھوں نے تین جلدوں میں مرتب کیا، میں نے خلیق سے کہا تھا کہ جن عمارتوں کا اس کتاب میں بیان ہوا ہے ان کی موجودہ زمانے کی تصاویر بھی شامل کی جانی چاہئیں تا کہ اب سے سو دو سو برس بعد آنے والے بھی یہ دیکھ سکیں کہ 'آثار الصنادید' کے پہلے اڈیشن کی اشاعت (1847) سے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد دلی کی ان عمارتوں کا حال اور حلیہ کیا ہو گیا تھا۔ خلیق انجم نے کیمرہ اٹھایا اور دلی کا گشت کرنے نکل پڑے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

عہدِ وسطیٰ میں لکھے جانے والی فارسی تاریخوں میں دہلی کے آثارِ قدیمہ کا ذکر ہے۔ خلیق نے

پچیس فارسی تاریخوں سے آثارِ قدیمہ کے حالات نکال کر اُن کا اردو میں ترجمہ کیا اور پھر اسے مرتب کر کے دہلی کے 'آثارِ قدیمہ' کے نام سے شائع کیا۔ اُن کی کتاب 'دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

چند سال پہلے انھیں مرزا غالب کے مزار کی حفاظت کا خیال آیا تھا تو اس کے لیے تدبیر کر کے احاطے پر پھاٹک لگوایا اور اس کو مقفل کر دیا گیا اب اس کا غلط استعمال پہلے سے یقیناً کم ہو رہا ہے۔ پچھلے دو برسوں میں اس سلسلے میں سپریم کورٹ تک پہنچے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق کے مقبرے کی بازیافت اور تعمیر کا بیڑہ اٹھایا اور اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑا۔

خلیق کی زندگی محنت اور سخت جدوجہد سے بھری پڑی ہے اور وہ ہماری نوجوان نسل کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ اُن کا تین بار ایکسی ڈنٹ ہوا اور ہر بار سخت چوٹ لگی، ہڈیاں ٹوٹیں، پلاسٹر بندھے، مدت تک ہسپتال میں رہنا ہوا، تیسری بار تو ٹانگ میں راڈ بھی ڈالی گئی اور طویل مدت تک ورزش کرائی جاتی رہی، مگر خلیق کی ہمت میں اس سے کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ کچھ دنوں تک گھر سے ٹیلی فون کر کے انجمن کا کام کاج چلاتے رہے اور جب ذرا چلنے کی اجازت مل گئی تو پھر دفتر میں موجود۔

اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ اُن کا رویّہ دوستانہ و برادرانہ رہتا ہے، ہر ایک کی پریشانی کو سمجھتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس کی مدد بھی کرتے ہیں، اس لیے ان کا اسٹاف بھی خوش دلی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے۔

خلیق انجم جب علی گڑھ سے انجمن کا دفتر اٹھا کر لائے تھے اُس وقت سب کا تاثر یہ تھا کہ انجمن ختم ہو جائے گی۔ اردو گھر کی موجودہ عمارت بھی نامکمل تھی۔ تعمیر کے لیے کثیر رقم درکار تھی اور یہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

خلیق انجم نے صفر کے درجے سے انجمن کو اٹھایا۔ ان معنوں میں کہ اردو گھر کی تعمیر پوری کرنا آسان کام نہ تھا اور علی گڑھ سے جمے جمائے دفتر کو اکھاڑ دینا بھی بہت سے مسائل پیدا کر سکتا تھا مگر وہی ان کی ہمت اور حوصلہ سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ انھیں اپنا کیریئر بنانے میں اور انجمن کو فعال و خودکفیل بنانے میں بہت سی اہم شخصیات کا تعاون بھی ملا ان میں مرزا محمود بیگ مرحوم (سابق پرنسپل دہلی کالج)، اور ڈاکٹر سروپ سنگھ (سابق گورنر گجرات) اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم نے ان کا تعلیمی کیریئر بنانے میں مدد کی تو کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم، جناب مالک رام مرحوم، پنڈت آنند نرائن ملا، سید حامد صاحب اور جگن ناتھ آزاد صاحب جیسے حضرات نے انجمن کے فروغ اور استحکام میں ان کی پوری مدد اور ہمت افزائی کی۔

خلیق انجم کروڑی مل کالج میں سینئر لیکچرر اور صدر شعبۂ اردو تھے، ان کی سروس اتنی ہو چکی تھی

اور تحقیق وتصنیف کا کام بھی معیار ومقدار میں ایسے اعلا درجے کا تھا کہ وہ کچھ ہی دنوں کے بعد پروفیسر اور دہلی یونیورسٹی کے صدرِ شعبہ ہوجاتے مگر خلیق نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے اپنی لیکچررشپ سے بھی استعفیٰ دے دیا حالاں کہ اس سودے میں اُس وقت تو گھاٹا ہی نظر آرہا تھا لیکن خدا کو منظور تھا کہ وہ انجمن جیسے عظیم ادارے کے سربراہ ہوکر تاریخِ ادبِ اردو کا حصہ بنیں۔

خلیق انجم اس کرسی پر بیٹھے ہیں جس پر کبھی علامہ شبلی نعمانی اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق رونق افروز ہوا کرتے تھے یہ اعزاز کچھ کم نہیں۔ان بزرگوں نے وسائل کم تھے مگر بہت لگن اور ایثار کے ساتھ انجمن کا کام کیا۔بابائے اردو نے تو اپنی زندگی ہی اس کے لیے وقف کردی تھی۔ خلیق انجم نے انجمن کو توانا اور خوش حال بنایا اور اس کے دائرۂ کار میں وسعت پیدا کی۔آج بابائے اردو کی کرسی بڑے احترام کے ساتھ ایک 'نادر تاریخی تحفے' کے طور پر خلیق انجم کے اپنے دفتر میں رکھی ہوئی ہے۔ایک آڈیٹوریم بھی ہے جسے انھوں نے 'بابائے اردو عبدالحق آڈیٹوریم' نام دیا ہے۔ اب انجمن میں ایک بہت بڑا کمپیوٹر سینٹر بھی ہے جس میں طلبہ کو کمپیوٹر سکھایا بھی جاتا ہے۔انجمن اردو جرنلزم کا بھی ایک کورس چلا رہی ہے۔ایک بڑا سیل ڈپو ہے جس سے انجمن کو اتنی آمدنی ہوجاتی ہے کہ اُسے اب کسی کے سامنے ہاتھ پسارنے کی ضرورت نہیں۔انجمن میں باقاعدہ جلسے، سمینار، لیکچرز، باہر سے آنے والے مہمانوں کے استقبالیے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں، اب سہ ماہی مجلّہ 'اردو ادب' بھی ڈاکٹر اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہورہا ہے، کتابیں بھی چھپ رہی ہیں، یہ سب کچھ ابھی تک تو خلیق کی مسلسل محنت اور ہمت سے ہوا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان کے بعد انجمن کو کون سنبھالے گا؟ انھوں نے اپنا جانشین تیار کرنے کی فکر نہیں کی۔کسی ادارے کو ایک ہی شخصیت کی محنت سے استحکام مل جائے تو اس کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ سکنڈ لائن ڈیفنس مضبوط بنائی جائے۔خلیق انجم کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ نظر کے سامنے کوئی ایسا باصلاحیت نوجوان نہیں تھا، لیکن اس میں بدگمانی کا عنصر بھی ہے وہ آسانی سے دامِ فریب میں نہیں آتے، اس لیے معاملات میں تاریک پہلو کو زیادہ غور سے دیکھتے ہیں۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ خلیق کا کام ایسا نہیں ہے کہ ایک مضمون میں اُس کا تعارف کرایا جاسکے اور مضمون بھی وہ جو مدیرِ مجلّہ کے تقاضوں کے دباؤ میں کسی ربط وترتیب کا لحاظ کیے بغیر عجلت میں لکھا گیا ہو۔ان کے کاموں کا بھرپور جائزہ لینے کے لیے کسی باصلاحیت طالبِ علم کو ڈاکٹریٹ کا موضوع بنانا چاہیے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کی بھرپور تاریخ لکھی جائے اس میں بھی دورِ حاضر کا بیان ہوگا تو خلیق انجم ہی چھائے رہیں گے۔ ●●

(خلیق انجم: کثیر الجہات شخصیت، مرتّبہ انیس دہلوی، 2000)

کمال احمد صدیقی

غالبؔ کی تحریر کے بارے میں ایک نیا گوشہ

(’خطوطِ غالب‘ مرتبہ: خلیق انجم کی روشنی میں)

غالبؔ، بلاشبہ، اپنے عہد ہی کے نہیں، اب تک کے سب سے زیادہ اہم شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت کا محل متداول اور غیر متداول کلامِ غالب ہے یا ان کے خطوط۔ حالیؔ کی یادگارِ غالب اور خطوطِ غالب مہیا نہ ہوتے تو غالبؔ پر اتنی کتابیں بھی نہ ہوتیں۔

غالب شروع میں اس بات پر راضی نہیں تھے کہ ان کے خطوں کو جمع کر کے چھاپا جائے اور یہ بات بھی ان کے خطوں ہی سے ثابت ہے۔ انھی خطوں میں انھوں نے اپنے کچھ شعروں کی تشریح بھی کی ہے۔ بعض موضوعات پر مختلف خطوں میں ان کے متضاد بیانات بھی ہیں۔ صرف عبدالصمد ہی کے بارے میں نہیں بلکہ آگرہ میں قیام کی مدت، اور شعر گوئی کی ابتدا کے بارے میں بھی۔ غالب کی سوانح اور ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط بہت اہم ماخذ ہیں، لیکن اس ماخذ سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔

غالب کے خطوط مختلف مجموعوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے جعلی کلام کی طرح، ان کے جعلی خطوط بھی تصنیف فرمائے گئے، اور ایک یونیورسٹی کے نصاب میں ایک جعلی خط بھی شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، سودا اور مرزا مظہر جانِ جاناں، (’جانجاناں‘) اور ’متنی تنقید‘ جیسے وقیع کام کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن اب جو ’خطوطِ غالب‘ انھوں نے مرتب کیے ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ متن کی تدوین جیسی انھوں نے کی ہے، اس سے پہلے خطوطِ غالب کے سلسلے میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے۔ انھوں نے قیافے سے نہیں ذہن سے کام لیا ہے۔ پہلی جلد کا مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی اہم کام حواشی کا ہے۔ ایک ایک لفظ مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے میں چک کیا گیا ہے، جو

واقعی بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے دوسروں کی طرح اوروں کے کام پر ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، بلکہ فراخدلی سے حوالہ بھی دیا ہے اس سے ان کے قد میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ ایک جگہ بہت بڑی غلطی سے بچ گئے، اور اس کی طرف میں اشارہ اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ غالب کے سلسلے میں ہماری 'تحقیق' ایک ہی طرح کے نکات اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں بیان کرنے کے دائرے میں محصور ہوگئی ہے۔ جلد سوم میں ص1305 پر نواب کلب علی خاں کے نام 'بہ خطِ غیر' لکھوایا ہوا یہ خط ہے۔

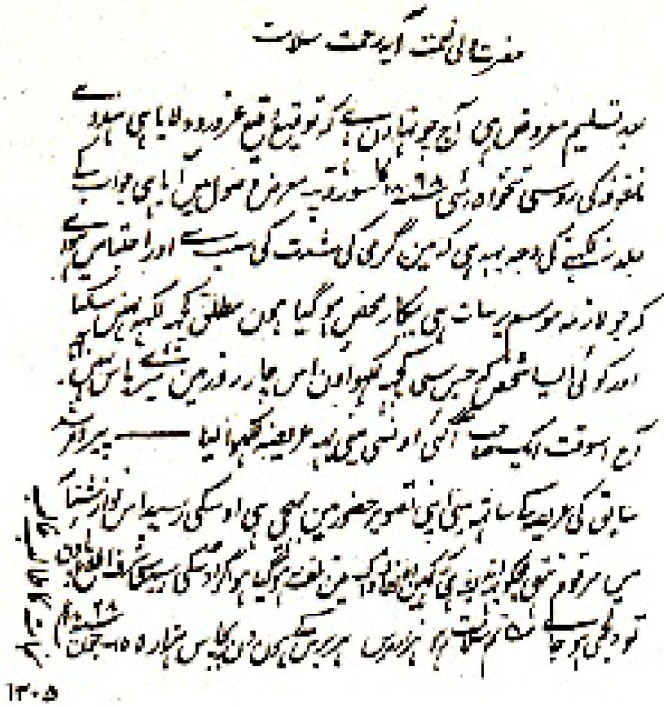

کتاب میں ص1256 پر یہ خط نمبر 68 کے تحت درج ہے۔ حواشی کے تحت ص1403 پر اظہار ہے:

''عرشی صاحب نے اس خط کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ
غالب نے خود یہ خط نہیں لکھا، کسی اور سے لکھوایا ہے لکھنے والے نے
دل جمعی کو دل جمی لکھا ہے۔''

کمال عرض کرتا ہے کہ یہ خطِ نستعلیق میں خود غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور 'دل جمی' کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا ہے: عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام۔

اس خط کا عکس کوئی بیس برس پہلے پرتھوی چندر کے 'مرقعِ غالب' میں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ کتاب بھی آفسیٹ سے چھپی تھی، لیکن حروف اتنے شارپ نہیں تھے۔ شاید نگیٹو شیشے پر بنایا گیا ہوگا۔ مکاتیبِ غالب (مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی) میں بھی متن اور ان کا اظہار کہ یہ خط کسی اور سے لکھوایا گیا ہے، دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب میں اس خط کا عکس دیکھا تو یہ غالب کی تحریر لگا۔ حروف، دائروں، جوڑوں اور اسلوبِ نگارش کا تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ واقعی غالب کی تحریر ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا نستعلیق خط کتنا اچھا تھا۔ اے کاش غالب نے اپنا کلام خود اس خط میں لکھا ہوتا۔ پاکستان میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور جمیل جالبی اور ہندستان میں حیرت ہے کہ خلیق انجم نے متنی تنقید پر اہم کام کیا ہے لیکن اس نکتے پر اُن کی نظر بھی نہیں گئی۔

مخطوطہ شناسی کا دعوا میں بھی نہیں کرتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور انصاراللہ نظر اس فن پر عبور رکھتے ہیں۔ تفصیل سے تو میں الگ اس کے بارے میں لکھوں گا۔ یہاں چند اشارے کروں گا:

(1) القاب کے ساتھ سلامت بنا کر لکھا گیا ہے، لیکن آخری سطر میں یہ لفظ انھوں نے اپنے مانوس اسلوب میں لکھا ہے (حالاں کہ 8 جنوری کے خط میں ص39، سطر 11 میں بھی سلامت ایسا ہی ہے)۔

(2) شروع کے دائرے بنا کر لکھے ہیں، لیکن آخر میں پھر اپنے اسلوب میں آ گئے ہیں۔

(3) کے میں کاف کا مرکز، اور مے کا زاویہ وہی ہے جو ان کے مانوس اور مخصوص طرزِ نگارش میں ہے۔

(4) نون کے نقطوں کا مقام وہی ہے، جو ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔

(5) کچہ اور لکہہ جیسے الفاظ بالکل ویسے ہی ہیں، جو ان کی اور تحریروں میں ہیں۔

(6) یائے معروف بھی اسی طرح کئی جگہ ہے، جیسے وہ عام طور سے لکھتے تھے۔

(7) 'کیا' جیسے وہ لکھتے تھے، اس پر سے کاف کا مرکز ہٹا دیں، تو اس خط کا 'لیا' ہو بہو ہو جاتا ہے۔

یہ چند اشارے ہیں۔ تفصیل سے اس کے بارے میں پھر عرض کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کیے ہوئے 'خطوطِ غالب' کے حوالے سے جہاں درست متن سامنے آیا ہے۔ وہاں ایک یہ نہایت اہم بات بھی سامنے آئی ہے اور یہ ایک خوش گوار اتفاق ہے کہ اس کی دریافت کی سعادت میرے حصے میں آئی۔

(ماہنامہ 'کتاب نما' کا خصوصی شمارہ، مرتّبہ: ایم. حبیب خاں، جولائی 1995)

عبدالمغنی

متنی تنقید اور خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو دنیا میں ڈاکٹر خلیق انجم کی شہرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر کچھ پردہ سا پڑ گیا ہے، گرچہ حال میں غالبیات کے ایک محقق کی حیثیت سے مکاتیبِ غالب کی ترتیب کے بعد ناقدوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہونے لگی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد ایسے تحقیقی وتنقیدی کام پچھلے بیس پچیس سال میں کیے ہیں جن کا اعتراف تاریخِ ادب پر ایک قرض ہے۔ 'مرزا محمد رفیع سودا'، 'مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط'، 'غالب کی نادر تحریریں' اور 'معراج العاشقین مع دکنی کلام' ڈاکٹر انجم کی وقیع کاوشیں ہیں جو 1967 میں ان کی عالمانہ وفاضلانہ تصنیف 'متنی تنقید' کی اشاعت سے قبل ہی سامنے آچکی تھیں۔ یہ سب مل کر ایک ایسے محقق و ناقد کا کردار پیش کرتی ہیں جو اپنی دیدہ ریزی اور دیدہ وری کی بدولت اپنا ایک علمی مقام بناتا ہے۔ اس مقام کی مزید وضاحت دلی کے آثار قدیمہ پر ڈاکٹر انجم کے ان تحقیقی مقالات سے ہوتی ہے جو چھپ کر اہل نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے موضوع پر ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

تنقیدِ متن پر اردو میں اصولی بحثیں بہت کم کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد محققینِ ادب کے عملی کارناموں کے باوجود متن کی تنقید کے اصولوں اور طریقوں کی واقفیت عام نہیں ہے۔ حالاں کہ پچھلی چوتھائی صدی میں خاص کر یونیورسٹیوں کے اندر متون کی ترتیب کے کام بہ کثرت ہوئے ہیں۔ ریسرچ اب اردو کی اعلا تعلیم کا ایک لازمی جز ہو گیا ہے اور آئے دن پی ایچ.ڈی اور ڈی لٹ کے لیے لکھے ہوئے مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس وسیع ریسرچ

ورک میں متن کی ایڈیٹنگ کا حصہ بہت نمایاں ہے۔اس کے علاوہ کسی قسم کا تحقیقی موضوع ہو اس کا حق اس وقت ادا ہوسکتا ہے جب صحیح متن کو مدنظر رکھا گیا ہو، اس لیے کہ جن تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کے فہم اور تجزیے کے صحیح و معتبر ہونے کے لیے ان کی عبارت کی درستی ضروری ہے۔ ورنہ ناقص عبارت کی بنیاد پر جو نتائج نکالے جائیں گے ناقص اور نا قابلِ قبول ہوں گے۔ علمی کاموں کی اصلیت، حقیقت، اہمیت اور افادیت متن و عبارت کے صحیح ہونے پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف 'متنی تنقید' اردو میں لکھی ہوئی ایسی پہلی کتاب ہے جو تصحیحِ متن کے طریقوں پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔اس سے ادب کے معیار کا تعین بھی ہوتا ہے اور اس کی تشریح و توضیح کے وہ پیمانے مقرر ہوتے ہیں جن سے ذوق و شعور کی پرورش اور ترقی کا سامان ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ متن کی تصحیح دراصل تحقیق کا وہ بنیادی کام ہے جس پر تنقید کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو متنی تنقید بہ یک وقت تحقیق و تنقید دونوں میدانوں میں شامل ہے اور علم و ادب کے ان دونوں دائروں کا ارتقا اسی پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسے کلیدی موضوع پر بحث آسان نہیں۔اس میں چند مشکلات ہیں۔اس سلسلے میں دو اہم ترین مسائل کی نشاندہی کافی ہوگی۔اول یہ کہ موضوع کی تمام جہتوں اور ان کے مضمرات کا احاطہ بہت دشوار ہے جس کے لیے نہایت باریک بینی کے ساتھ حقائق کا مفصل تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دوم یہ کہ اس تجزیے میں تکنیکی امور کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ کم ہی لوگ اس کے مطالعے کی طرف راغب ہوتے ہیں اور عام قارئین کے لیے اس کا قابلِ مطالعہ ہونا بھی مشکوک ہوتا ہے، اس لیے کہ اصطلاحی الفاظ اور اعداد و شمار کی فراوانی وضاحتِ بیان میں حائل ہوسکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر خلیق انجم ان دونوں مسائل سے اس کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ مباحث بسا اوقات قصے کی طرح دل چسپ ہوگئے ہیں، خاص کر متن کی تحریف و تصحیح کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے تجسس کو پیہم بیدار رکھتی ہیں اور اس کے ذہن پر ایسے ایسے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس کی دل چسپی مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے موضوع کے پورے مواد کی فراہمی کے ساتھ ہی اس پر کافی غور و فکر کر کے اس کے سارے پیچ کھول دیے، اس کے علاوہ انھوں نے بہت ہی سادہ و سلیس اندازِ بیان سے کام لے کر ہر قسم کے قاری کو اعتماد میں لیا۔ یہ اندازِ بے تکلفی انشائیے کا ہے جس میں جا بجا لطیف مزاح کی چاشنی کے باوجود کہیں ابتذال

نہیں ہے۔ایک مشکل اور سنجیدہ علمی موضوع کی یہ تسہیل وتفہیم مصنف کی واقفیت اور مہارت کا ثبوت ہے۔

دراصل 'متنی تنقید' میں ڈاکٹر خلیق انجم کا اسلوبِ تحریر ایک ایسے شخص کا ہے جو ایک خاص فن کی گویا بنیاد رکھ رہا ہے اور اس نے اس کے ہر ہر پہلو کی چھان بین کر لی ہے۔لہٰذا وہ پورے اعتماد اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے نتائجِ افکار پیش کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے کچھ نئی آگہی حاصل کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے دیگر علماء کے ساتھ تبادلۂ خیال نہیں کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعلقہ موضوع پر کسی بھی جہت سے اظہارِ خیال کرنے والے اپنے پیش رووں کے متعدد حوالے دیے ہیں اور بعض اوقات ان کی رایوں پر محاکمہ بھی کیا ہے۔استفادے اور افادے کا یہ طریقہ تخلیقی حد تک نتیجہ خیز ہے، جس میں مناسب موقع سارے ضروری نکات کی تفتیش کر کے انھیں ایک نئے انداز سے بہت سوچ سمجھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب مصنف کے اپنے تجربات وتصورات کا خلاصہ ہے، جس کی اصلیت بجائے خود ایک علمی کارنامہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انجم نے تنقیدِ متن کے متعلق موجود حقائق وافکار کی ایک نئی تدوین کی ہے اور اپنے مطالعات کا حاصل ایک خاص تنظیم سے پیش کیا ہے۔وہ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بحث اس منظّم طریقے سے کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر متعلقہ مواد کا ایک مربوط ہیولا تیار ہو جاتا ہے اور قاری بہت آسانی کے ساتھ ایک تکنیکی مضمون کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ لطف اٹھاتا ہے، اس لیے کہ مصنف صراحت کے ساتھ تدریجی طور پر تمام تفصیلات ایک رواں دواں انداز سے سامنے لاتا ہے، وہ اس سلسلے میں نہ تو بے جا طوالت سے کام لیتا ہے۔نہ پریشان کن اختصار سے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بھاری بھرکم اصطلاحات کے چکر سے نکل کر سادہ وعام فہم لفظوں میں اپنا مافی الضمیر صاف صاف بیان کر دیتا ہے گرچہ منطقی استدلال اور نکتہ سنجی اس کی ہر تشریح سے عیاں ہے۔ یہ ایک اچھا تدریسی اسلوب بھی ہے، جس میں تجزیے کی قوت ترکیب کی صلاحیت سے ہم آہنگ ہے اور دونوں علمی طریقوں کا ارتباط تصنیف کی جامعیت وثروت کا باعث ہوتا ہے۔اس نظم وضبط کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر باب کو اس کی جزئیات میں تقسیم کر کے ہر ہر جز پر روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے 'متن کی تصحیح' پر مشتمل باب کے اجزا یہ دیے گئے ہیں:

''بنیادی نسخہ، موازنے کا طریقہ، اختلافاتِ نسخ کے مسائل، متنوں کی مختلف قرأتیں، اردو رسمِ خط کی دشواریاں، متن کی تصحیح، قیاسی تصحیح''۔

ان اجزا میں قیاسی تصحیح پر بحث کرتے ہوئے اس کے پانچ مدارج بتائے گئے ہیں، پھر سب مدارج کا الگ الگ بیان ہے۔ گرچہ قیاسی تصحیح کی تشریح ایک مستقل باب میں اسی عنوان سے کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ موضوع تصحیحِ متن کے دیگر امور سے ممتاز اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح 'اعلا تنقید کے باب کو متعدد اجزا میں تقسیم کرکے ہر جز پر الگ الگ بحث کی گئی ہے، مثلاً متن مستند ہے یا غیر مستند، سرقہ، مصنّفین کے ناموں کی مماثلت، مذہبی اختلافات، عوام کی عقیدت، مصنف کی شہرت کا ناجائز فائدہ وغیرہ۔

ڈاکٹر انجم اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسے حقائق کی نشان دہی بحسن وخوبی کرتے ہیں جن کی ادبی تنقید میں بڑی اہمیت ہے، جب کہ جدید تنقید کا ایک حلقہ عصرِ حاضر میں ان کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ماضی اور کلاسیکی ادب پر ڈاکٹر انجم کا یہ اظہارِ خیال ان کی علمی بصیرت اور ادبی آگہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے:

> ''مہذب قوم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کے پاس اپنے بزرگوں کی ذہنی اور فکری سفر کے ارتقا کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی ہے۔ ہمارے حال کو فکر کی جن شمعوں نے روشن کیا ہے ان میں کوئی شمع ایسی نہیں جس کا رشتہ ماضی سے نہ ہو۔ کوئی سائنس اور کوئی فن ایسا نہیں جو ماضی کی پروا کیے بغیر ترقی کر سکے۔ وقت کے تیز اور تند دھارے ہر چیز کو مٹاتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان ازل سے ان دھاروں پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جن ایجادوں کے ذریعے انسان نے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے ان میں تحریر سرفہرست ہے۔ کتابوں اور مختلف اشیا پر لکھی گئی تحریروں ہی سے ہم ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ الہامی کتابوں کے بعد اگر کوئی چیز مقدس ہے تو بزرگوں کے وہ فکری کارنامے ہیں جو کتابوں کی صورت میں ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔''
>
> (ص12)

تمہیدِ کتاب کے بعد جملے 'مقدمہ' کے طور پر کہے گئے ہیں اور ان کے مطالعے سے اس

وسیع تناظر کا پتا چلتا ہے جس میں کتاب کے مباحث واقع ہوئے ہیں۔اس تناظر کی مزید توضیع اور موضوع کی تعین کے سلسلے میں مقدمے کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

''تنقید ادبی ہو یا متنی، دونوں سائنس ہیں۔ دونوں کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ ادبی تنقید کے اصول زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، جب کہ متنی تنقید کے اصول نہیں بدلتے، البتہ اسے زیادہ سے زیادہ سائنٹفک بنانے کے لیے مزید اصولوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ان دونوں کی راہیں کبھی بالکل ایک اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ دونوں کا مقصد سچائی کی تلاش ہے۔دونوں اپنے مواد کی تشریح اور تجزیہ کرتے ہیں۔''

(ص14)

ادبی اور متنی تنقیدوں کی حدود کا یہ تعین جہاں ان کے باہمی امتیازات کی وضاحت کرتا ہے وہاں ان کی مشابہتوں کی صراحت بھی، گرچہ اس تشریح میں بعض امور کی مزید تفصیل مطلوب ہوسکتی ہے، مثلاً ادبی تنقید کے اصول میں زمانی تغیر کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ تنقیدِ ادب کے کچھ مستقل اصول نہیں ہیں، اس لیے کہ فکر وفن دونوں کے بنیادی تصورات معین ہونے کے بعد مستقل ہوجاتے ہیں اور اصول موضوع کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ بات صحیح ہے کہ متنی تنقید ادبی تنقید کی بہ نسبت زیادہ معروضی ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق بڑی حد تک تکنیکی امور سے ہے۔

اعلا تنقید کے باب میں متن کی آزمائش کے طریقے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر انجم نے لفظیات کی تنقید کا یہ اہم نکتہ پیش کیا ہے:

''متنی نقاد کو اپنی زبان کے ارتقا کا پورا علم ہونا چاہیے۔مرزا مظہر کے اسکول کے شاعر کی زبان اور مفہوم دونوں دور ایہام گویاں کے شاعروں سے مختلف ہوں گے، ہر زبان میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے جن کے بارے میں قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کا استعمال کب شروع ہوا یا کس زمانے میں ان کا مفہوم یا تلفظ بدل گیا۔'' (ص136)

ڈاکٹر خلیق انجم نے متن وعبارت کی تنقید پر اپنا وسیع کارنامہ 1967 میں پیش کیا۔ یہی وقت اردو ادب میں جدیدیت کے اس رجحان کے آغاز کا تھا جس کے جلو میں اسلوبیاتی تنقید کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس رجحان نے لفظیات کا ایک چکر چلایا، نیز ہیئتِ فن میں تجربوں پر زور دیا۔ اس طرح انفرادیت کی وہ ہنگامہ آرائی ہوئی جس میں روایت کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اگر غور کیا جائے تو 'متنی تنقید' کے مباحث میں ڈاکٹر انجم نے عبارتِ کلام کے جن مسائل سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں جو علمی حقائق اور تنقیدی نکات انھوں نے پیش کیے ہیں وہ وضاحتی کتابیات اور اسلوبیاتی تنقید دونوں کو روشنی دکھاتے اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں جس طرح شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' میں ایک صنفِ شاعری کا فنی مطالعہ اور محی الدین قادری زور نے اسالیبِ نثر کا تجزیہ کر کے ادب کے اسلوبیاتی جائزے کی نہ صرف راہ ہموار کی تھی بلکہ شاہراہ تعمیر کی تھی، اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے 'متنی تنقید' لکھ کر اسی کشادہ راستے پر ایک سنگِ میل نصب کیا، جس کا نشان جدید ترین یا جدید تنقید کی بے اعتدالیوں کے سبب گم ہوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کتاب کی تازہ اشاعت ہو اور اس کا مطالعہ ایک نئے تناظر میں کیا جائے، تاکہ اسلوبیات و لفظیات کے علم برداروں کو ادبی و تنقیدی مسائل کی سنجیدگی و پیچیدگی کا احساس و عرفان ہو اور نئے لکھنے والوں کی استقامت کا سامان۔ اس طرح انفرادی تجربات کے شائقین اجتماعی روایات کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔ حال کا رشتہ ماضی سے استوار ہوگا۔ مسلمہ تہذیبی قدروں سے وابستگی کی افادیت واضح سے واضح تر ہوگی، کلاسکیت اور رومانیت کی ہم آہنگی سے وہ فکری و فنی توازن میسر آئے گا جس کی بنا پر ہی اخلاقیات و جمالیات کے امتزاج سے اعلا ادب کی تخلیق و ترقی کے لیے فضا سازگار ہوتی ہے۔

(ماہنامہ 'کتاب نما' کا خصوصی شمارہ، مرتّبہ: ایم. حبیب خاں، جولائی 1995)

○○○

جاوید رحمانی

مرزا محمد رفیع سوداؔ اور خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم ہمارے ان محققین میں سے ایک ہیں جن کے ادبی ذوق کی تعمیر میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشیؔ اور خواجہ احمد فاروقی جیسے محققین نے حصہ لیا۔ اس طرح اردو میں تحقیق کی داغ بیل جن ہاتھوں نے ڈالی ان سے راست اثر پذیری کا شرف انھیں حاصل ہے۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ کافی وسیع اور متنوع ہے اور وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'غالب کے خطوط' اور 'مرزا محمد رفیع سودا' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر کتاب کے بارے میں آل احمد سرورؔ نے لکھا ہے: ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق وتنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابلِ قدر تصنیف کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے''۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ مقالہ ڈگری کے لیے نہیں لکھا گیا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا ''سیاسی وسماجی حالات'' ہے جس میں سوداؔ کی شخصیت پروان چڑھی۔ اگرچہ اسے سوانح کا جداگانہ عنوان بھی دیا گیا ہے جس کی بنیاد پر تین حصّے قرار پائیں گے تاہم میں نے صرف دو حصے اس لیے کہا ہے کہ سوداؔ کی سوانح اس عہد کی سیاست و معاشرت سے اس قدر مربوط ہے کہ اسے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مصنف نے کتاب میں اپنے تاریخی شعور و بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ مغلوں کے زوال کو اکثر ان کی نااہلی وعیاشی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ خلیق انجم نے ان کی نااہلی اور کسی قدر عیاشی کو زوال کا زائیدہ بتایا ہے اور اس زوال کو مغلوں کے اقتصادی نظام کی خرابی کا نتیجہ بتایا ہے۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں۔

اسی طرح مغلوں کی بیخ کنی کے سلسلے میں انگریزوں اور بیرونی حملہ آوروں کا ذکر تو اکثر کیا جاتا ہے لیکن مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی یورشوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے صاف لکھا ہے کہ ''ان میں مرہٹے، جاٹ، سکھ اور انگریز سب ہی شامل تھے''۔ بلکہ میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ ان یورشوں کے پیچھے ایک سستی قسم کی مذہبی عصبیت اور الگاؤپن کا جذبہ بھی کام کر رہا تھا۔ اگرچہ بظاہر مذہبی ہم آہنگی کی گونج بھی سنائی دیتی تھی۔ آزادی کے بعد تو اس مذہبی عصبیت اور الگاؤپن کے جذبے میں اس حد تک شدت آ گئی کہ ہماری فلموں میں جو گیت مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کے اعتراف کے دعوے کے ساتھ لکھے گئے ان میں ایسے بند بھی ملتے ہیں:

دیکھو ملک مراٹھوں کا یہ یہاں شواجی ڈولا تھا
مغلوں کی طاقت کو جس نے تلواروں پہ تولا تھا
ہر پربت سے آگ جلی تھی ہر پتھر اک شعلہ تھا
بول ہر ہر مہادیو کی بچہ بچہ بولا تھا
شیر شواجی نے رکھی تھی لاج ہماری شان کی
اس مٹی سے تلک کرو یہ دھرتی ہے بلیدان کی

اس سے خالص فرقہ واریت کا زہر اور کیا اور کس طرح سارے ہندستان کے ذہنوں میں گھولا جا سکتا تھا؟ 2014 کے ہندستان کی ابتدائی جھلکیاں کیا اس رویے میں واضح نہیں ہیں؟ کتاب کے اس حصے میں مصنف نے اردو، فارسی اور انگریزی تاریخی و ادبی مطبوعہ نیز قلمی ماخذ سے نہ صرف یہ کہ مدد لی ہے بلکہ ان کا سلیقے سے تجزیہ بھی کیا ہے۔ سوداؔ کی سوانح تقریباً 70 صفحات پر مشتمل ہے۔

سوداؔ کی تاریخِ ولادت کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کو شیخ چاند سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے تمام دستیاب مواد کا تجزیہ کر کے 1118ھ کو مناسب قرار دیا ہے۔ شیخ چاند نے 1106ھ کو سوداؔ کا سالِ ولادت بتایا تھا مگر اس باب میں مزید تحقیق کی ضرورت پر بھی زور دیا تھا۔ حنیف نقوی نے خلیق انجم سے اختلاف کرتے ہوئے سعادت خاں ناصر اور علی ابراہیم خاں خلیل کے بیانات کی روشنی میں 1125ھ کو سودا کا سالِ ولادت ٹھہرایا ہے۔ خلیق انجم نے سوداؔ کا نام بھی مرزا محمد رفیع درست قرار دیا ہے۔ شیخ چاند نے سوداؔ کے صرف ایک استاد شاہ حاتم کا ذکر کیا تھا۔

خلیق انجم نے ان پر تین ناموں کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ثابت کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً سوداؔ، خان آرزو، سلمان قلی خاں وداد شاہ حاتم اور نظام الدین احمد صانع سے بھی اصلاحیں لیتے رہے ہیں۔ اگرچہ ان میں حاتم واحد شخص ہیں جن کی استادی شبہات سے بالاتر ہے۔ سوداؔ کی سوانح عمری انھوں نے بالکل سائنٹفک انداز میں ترتیب دی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اردو کا پہلا مقالہ جو مکمل سائنٹفک انداز میں لکھا گیا وہ بھی سوداؔ پر ہی تھا جو 1936 میں شیخ چاند نے مولوی عبدالحق کی نگرانی میں لکھا تھا۔

دوسرا حصہ جس کا عنوان تنقید ہے، اردو شاعری کے ارتقا کا ایک واضح تصور پیش کرتا ہے جس پر مصنف کی ترمیمات نے اسے اور بھی اہم بنا دیا ہے مثلاً اس کتاب کے پہلے اڈیشن میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''سوداؔ ایک عظیم شاعر تھے لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا'' (ص163)۔ اس اڈیشن میں لکھا کہ ''اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اہم غزل گو شعرا میں ہوتا اور بس۔'' گو اس میں پہلے سی چبھن نہیں تاہم اتفاق اس سے بھی مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں ''ان (سوداؔ) کی شوخ، چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی، سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سوداؔ کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجے میں نرمی اور گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے'' (ص155)۔

مجھے اس بیان کے کچھ حصوں سے اختلاف ہے، انسانی جذبات کی بے شمار قسمیں ہیں جن میں کچھ فوراً اثر کرتے ہیں تو کچھ دیر میں، کچھ زیادہ تو کچھ کم اور کچھ ہمیں اپیل نہیں کرتے تو جو اپیل نہیں کرتے ان میں صداقت اور خلوص نہ ہو یہ کہنا درست نہیں۔ یہ اضافی قدر ہے جو کئی چیزوں سے عبارت ہے مثلاً ہمارے ذہنی میلانات، ہماری تربیت، روایت اور انفرادی و اجتماعی مفروضے وغیرہ۔ اگر سوداؔ کی غزل ہمیں اپیل نہیں کرتی تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان کے ہاں جذبات کی صداقت و معصومیت اور خلوص نہیں اور اس کی بنا پر انھیں کم رتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غالبؔ گو معتقدِ میر سہی لیکن ان کی شاعری کا خمیر سوداؔ کی غزل سے اٹھا ہے۔ غالبؔ کی غزل کا غیر عشقیہ لہجہ سوداؔ اور دردؔ کے رنگِ سخن کی بالیدہ شکل ہے اور کسی شاعر کے لیے یہ کم بڑا

اعزاز نہیں۔ پھر سوداؔ کے ہاں کچھ شعر ایسے بھی مل جاتے ہیں جو سوداؔ کی شخصیت میں ان پرچھائیوں کی موجودگی کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں اور رشید حسن خاں نے اس کا جواز اس طرح فراہم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''انھوں نے اندازِ میر کو سرسبز کرنے کی بھی کوشش کی ہے'' (کلیاتِ سودا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)۔ لیکن میری حقیر رائے میں یہ غلط ہے۔ میرا خیال ہے کہ سودا خاص غزلیہ لہجے میں بھی شعر کہہ سکتے تھے لیکن چوں کہ یہ رنگ میر سے مخصوص ہونے لگا تھا اس لیے سوداؔ نے عمداً اس سے گریز کیا اور یہ رنگ اختیار کیا جو غزل کو بظاہر راس نہیں آ سکا۔ اس لیے کہ اس کی کوئی باضابطہ روایت پہلے سے موجود نہیں تھی تاہم اسی روایت نے ہمیں غالبؔ جیسا شاعر دیا، اس لیے سوداؔ کو دوسرے درجے کا غزل گو کہنا یا میرؔ کے مقابلے میں کمتر درجہ دینا درست نہیں۔ ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا تھا۔ ہمارے نقادوں کی تن آسانی نے ان میں سے محض ایک کو لازمۂ شاعری سمجھ لیا حالاں کہ اس رویّے کی زد ہماری شاعری کے بڑے حصے پر پڑتی ہے حتیٰ کہ اسی حصے میں انھوں نے سوداؔ کی داخلیت تصورِ حسن و عشق، محبوب، تصوف، واعظ و زاہد، بے ثباتی، قناعت، احساسِ تشنگی، غم پرستی، زورِ بیان، نشاط آمیزی، سادگیِ بیان، مشکل زمینیں، ایہام گوئی، مزاح و ظرافت، قطعات، عریانیت، تمثیل نگاری، خیال بندی، حسنِ تعلیل اور تشبیہات و استعارات کا بھی بھرپور جائزہ لیا جن میں تمثیل نگاری، خیال بندی، حسنِ تعلیل اور تشبیہات و استعارات کا مطالعہ کافی اہم ہے۔ کچھ سے جزوی اختلاف ممکن ہے مثلاً ایہام گوئی کے مطالعے میں پہلے جملے کی بنیاد تحریک ایہام گوئی کے مفروضے پر رکھی گئی ہے ایہام گوئی کو تحریک لکھنا اب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مفروضے کی شدت سے مخالفت کی ہے جو درست ہے۔ اگرچہ اس کا ذمے دار انھوں نے پروفیسر نقادوں کو بتایا ہے جو محلِ نظر ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ گو فاروقی صاحب نے حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھا لیکن ان سے کوئی ساٹھ سال پہلے پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس مفروضے کو رد کر دیا تھا۔ یہ دوسری بحث ہے کہ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' ہم میں سے کتنے لوگوں نے پڑھی ہے کہ اس سے ہمارے حسنِ ظن کو ٹھیس جو پہنچتی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ ''ایہام گوئی کو ادبی تحریک کہنا کم نظری ہے۔ ایہام ایک طرز ہے تحریک نہیں۔ تذکروں میں کسی ادبی تحریک کا ذکر نہیں'' (اردو تنقید پر ایک نظر، ص31)۔ بہرحال اب ایہام گوئی کو تحریک کے طور پر دیکھنے سے احتراز کیا جانے لگا ہے، لہٰذا یہاں بھی تھوڑی تبدیلی ضروری تھی۔ اس حصے کا شاہکار

وہ مطالعہ ہے جس میں قصیدہ نگاری اور ادبی معرکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سوداؔ کے جملہ محاسن سمٹ آئے ہیں اور مصنف نے زبردست تنقیدی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ 'سوداؔ کے شاگرد' کے عنوان سے سوداؔ کے 26 شاگردوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو کافی اہم ہے۔ اس باب کی تمہید میں استادی شاگردی کے ادارے کی جملہ خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ ''اٹھارہویں صدی میں خان آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں دو اہم فارسی شاعر ہیں۔ ان دونوں کی تربیت نے بڑے بڑے اردو استاد پیدا کیے''۔ اس کی صحت میں کلام نہیں۔ امیر خسرو نے دیباچۂ 'غرۃ الکمال' میں استادی و شاگردی کے مدارج پر جس طرح گفتگو کی ہے اور ان کی خصوصیات پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اس کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی میں استادی و شاگردی کا ادارہ نہیں تھا یا کم حیثیت رکھتا تھا۔ خلیق انجم نے اس کتاب میں کلیاتِ سوداؔ کے دستیاب نسخوں کا سائنٹفک انداز میں مطالعہ بھی پیش کیا ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی ابھی تک کلیاتِ سوداؔ کا کوئی معتبر اڈیشن نہیں ملتا۔

مجلس ترقی ادب پاکستان نے غالباً 1987 میں کلیاتِ سودا (چار جلدوں میں) شائع کیا تھا۔ کلیاتِ سودا کا یہ اڈیشن نسبتاً بہتر ہے۔ یہ محمد شمس الدین صدیقی کے تحقیقی مقالے کا حصہ ہے جس پر لندن یونیورسٹی سے 1967 میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ بھی دل چسپ اتفاق ہے کہ خلیق انجم کی کتاب مرزا محمد رفیع سودا کا پہلا اڈیشن بھی انجمن ترقی اردو (ہند) سے 1967 میں ہی شائع ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ سوداؔ پر جس قدر مواد دستیاب ہو سکا ہے اس سے کام لے کر اس سے اچھی کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔ □□

(یہ تبصرہ ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2004 میں شائع ہوا تھا جس میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے)

انجمن ترقی اردو (ہند)

کا

ہفت روزہ اخبار

ہماری زبان

مدیر: اطہر فاروقی

شریکِ مدیر: محمد عارف خاں

یہ اردو زبان کی تحریک کا واحد ترجمان اور اردو ادب کا آئینہ دار ہے۔ اس میں صحافت کی چاشنی بھی ہے اور ادب کی لذت بھی۔ اس میں علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ 'ہماری زبان' اردو کی خبریں اور اردو تحریک سے عوام کو باخبر رکھنے کا واحد اخبار ہے جو نہایت سادہ اور سلیس زبان میں شائع ہوتا ہے۔

سالانہ قیمت: ۱۲۵/روپے

فی پرچہ: ۳/روپے

ٹوم اولٹر

نوشتہ بماند سیہ بر سفید

(قسط دوم)

میرے اردو تھیٹر کی طرف آنے میں ڈاکٹر محمد سعید عالم صاحب — المعروف بہ ایم سعید عالم صاحب — کا بڑا ہاتھ ہے۔ 2002 میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک پلے کا اسکرپٹ لے کر عالم صاحب میرے پاس بمبئی آئے تھے۔ اس وقت میں 'تری سنگا' نامی ایک پلے کر رہا تھا جس میں اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانیں استعمال کی گئی ہیں۔ سعید عالم صاحب یہ پلے دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ 'شطرنج کے کھلاڑی' فلم میں بھی میرے کام کو اردو داں حلقوں میں کافی پسند کیا گیا تھا، اسی لیے، شاید انھیں خیال ہوا کہ اس پلے کے لیے مجھ سے بات کی جائے۔ انھوں نے مجھے اسکرپٹ سنایا اور بات بن گئی۔ اس کے بعد 2002 سے لے کر 2016 تک کے چودہ برسوں میں صرف عالم صاحب کے ساتھ جو سات (7) پلے میں نے کیے ہیں ان میں کوئی ایسا پلے نہیں ہے جس کے کم سے کم 50 شو نہ ہوئے ہوں۔ زیادہ تر پلیز کے 50 سے زیادہ شو ہو چکے ہیں۔ ہم نے اردو پلے دنیا بھر کے تقریباً ان تمام ملکوں یا غیر ملکی شہروں میں کیے ہیں جہاں قابلِ ذکر اردو آبادی موجود ہے۔ تھیٹر میں ایکٹر ان معنوں میں بہت اہم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ایکٹنگ سے پلے کو ہدایت کار کے تصوّر سے کہیں آگے لے جا سکتا ہے۔ فلم میں ڈائرکٹر کے پاس یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی سین کو جتنی مرتبہ چاہے اتنی مرتبہ شوٹ کرے مگر تھیٹر میں ایک دفعہ پلے شروع ہونے کے بعد ہدایت کار بے بس ہو جاتا ہے۔

میں اردو، ہندی یا انگریزی تھیٹر کا نام نہیں لینا چاہتا کیوں کہ بہ حیثیت آرٹسٹ میرے لیے کسی زبان کے تھیٹر میں کوئی فرق نہیں۔ میں تھیٹر کرتا ہوں خواہ وہ کسی زبان میں ہو۔ سعید عالم

صاحب جو لکھتے ہیں اب اس کی اردو اس لیے قدرے مشکل معلوم ہوتی ہے کہ اردو کے الفاظ اب بہت تیزی کے ساتھ چلن سے باہر ہو رہے ہیں اور جو لوگ اردو جانتے ہیں وہ تھیٹر نہیں دیکھتے۔ تھیٹر میں آرٹسٹ اپنی ایکٹنگ سے بہت کچھ دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اچھا ایکٹر زبان کی حیثیت کو کم اور ایکٹنگ کے ذریعے تاثرات کی جو دنیا خلق کرتا ہے وہ الفاظ پر سبقت لے جاتی ہے اور ایکٹر مجموعی طور پر ایک ایسا پُر لطف اور موثر ماحول پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے کسی پلے میں ناظرین کی دل چسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ جیسے 'لال قلعے کا آخری مشاعرہ' آپ دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ اس میں بڑے بڑے شعرا اپنا کلام تو پیش کر ہی رہے ہیں لیکن ظریفانہ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس پلے کا فرحت علی بیگ کی کتاب ''دہلی کی آخری شمع'' سے تو زیادہ تعلّق نہیں مگر اس میں ''آبِ حیات'' سے بہت استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''مولانا آزاد'' میں مولانا گاندھی جی کے سیاق وسباق میں گفتگو کرتے ہوئے چائے کی تاریخ کی بات شروع کر دیتے ہیں جس کی اساس چوں کہ داستانوں اور دل چسپ قصّوں پر ہے، اس لیے، نہایت پُر لطف ہے۔ ابھی یہ گفتگو اختتام پذیر نہیں ہوتی کہ مولانا جناح صاحب اور مذہب کے متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

عالم صاحب کے — پیروز (Pierrot's Troupe) ٹروپ — سے وابستہ آرٹسٹوں کی اکثریت کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ وہ اردو رسمِ خط سے بھی واقف نہیں ہیں مگر ان کے تلفظ کی ادائیگی سو فی صد درست اور اہلِ زبان کے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پونے میں 'مولانا آزاد' کا ایک شو کیا گیا جس میں زیادہ تر ناظرین مہاراشٹر اور گجرات کے تھے جو میرے خیال میں اُردو بالکل نہیں جانتے تھے لیکن پھر بھی ڈھائی گھنٹے تک وہ لوگ اپنی جگہوں پر خاموشی اور انہماک کے ساتھ پلے دیکھتے رہے۔

میں نے اور لوگوں کے ساتھ بھی اردو تھیٹر کیا ہے جیسے 'ساحر' کے بارے میں ہم نے ایک سیریز کی ہے جسے سہیل اختر صاحب نے تین الگ الگ موضوعات یعنی 'ساحر کی زندگی'، 'ساحر کی محبوبہ...' اور 'ساحر کی شاعری' کے عنوان سے لکھا ہے۔

میں ایک اور پلے 'غالب کے خط' میں بھی کام کرتا ہوں جس میں ہم غالب کا کوئی خط پڑھتے ہیں اور خط کے موضوع کی مناسبت سے غالب کی کسی غزل پر بھی بات ہوتی ہے۔

اسی طرح رنجیت ہوسکوٹے (Ranjit Hoskote) کے ساتھ میں نے ایک پلے کیا تھا۔ رنجیت معاصر ہندستان کے انگلش شاعروں میں ایک اہم نام ہے اور اورنگ زیب کے اوپر

انھوں نےRose کےعنوان سےایک مشہورنظم بھی لکھی ہے جس میں انھوں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ آخری عمر میں اورنگ زیب کواپنے ماضی کے افعال پرندامت تھی۔ رنجیت کے ساتھ کام کرنا ہمیشہ خوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔

رنجیت کے نام سے یادآیا کہ میں نے ڈوم موریس (Dom Moraes) جو ہندستان میں جدید انگریزی شاعری کے غالباً سب سے اہم شاعر تھے، کی نظموں کوایک سے زیادہ موقعوں پر پڑھا۔کم لوگوں کومعلوم ہوگا کہ بابری مسجد پرڈوم موریس کی نظم انگریزی میں ایک شاہ کار ہے۔ میں نے ایک ایسے موقعے پر بھی نظم خوانی کی جب ڈوم موریس خود وہاں موجود تھے۔اس وقت وہ سخت علیل تھے۔ان کے گلے میں کینسر ہوگیا تھا مگر بعد میں انھوں نے بتایا کہ میری نظم خوانی سے ان کے اندر حوصلہ آ گیا اورانھوں نے بھی اپنی کئی نظمیں اس موقعے پرسُنائیں۔ایک اورموقعے پر میں بھی اس جلسے میں موجود تھا جس میں ڈوم کواپنی نظمیں پڑھنی تھیں۔انھوں نے کسی سے کہا کہ ٹوم اولٹر کواسٹیج پر بلالیں۔ میں اسٹیج پرآیا اوران سے بھی درخواست کی وہ بھی اسٹیج پرتشریف لے آئیں۔اس موقعے پربھی میں نے اپنی آواز میں ان کی کئی نظمیں پڑھیں۔وہ بہت ہی حسین شام تھی۔ایک بار رنجیت کے کہنے پراورایک مرتبہ کسی فیسٹول میں بھی ڈوم موریس کی شاعری کی نظم خوانی بھی میں نے کی تھی۔

پرتھوی تھیٹر کے ساتھ — جہاں بہت ہی چھوٹا لیکن شاندار اسٹیج ہے— یہ لوگ الگ الگ قسم کی شامیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔رنجیت نے مجھے کئی بار وہاں بلایا تھا۔ایک بارکم ازکم دو ڈھائی گھنٹے تک شعروشاعری کی باتیں ہوتی رہیں۔یہیں رنجیت سے اجازت لے کرمیں نے ان کی نظم"Rose"، بھی پیش کی۔

مجھے انگریزی شاعری کے مطالعے کا بس شوق ہے اور چوں کہ میں انگریزی شاعری پڑھتا ہوں ، اس لیے، اس کے معاصر رُجحانات کی مجھے کچھ نہ کچھ خبر رہتی ہے۔ جہاں تک انگریزی شاعری کا سوال ہےتو ہندستان میں ڈوم موریس، رنجیت ہوسکوٹے اور یونس ڈیسوزا (Eunice D-Souza) کے علاوہ اوربھی کئی قابلِ ذکرشاعر ہیں مثلاً جیری پنٹو (Jerry Pinto)، اروندکرشن مہروترا،انجم حسن وغیرہ ہندستان میں انگریزی شاعری کے کافی اہم نام ہیں۔

مگرافسوس کی بات یہ ہے کہ اب ہندستان میں ادب کی فہم ہی نہیں ادب کے مطالعے کا رجحان بھی کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔فنونِ لطیفہ کی طرف بھی لوگوں کی دل چسپی میں بھی بہت کمی آئی ہے۔ اپنے تہذیبی ورثے سے عدمِ واقفیت میں بھی مجرمانہ حد تک اضافہ ہورہا ہے۔

ہندستان نے جس تیزی کے ساتھ تعلیم کے میدان میں ترقی کی ہے اور اس کا غیر معمولی پھیلاؤ خصوصاً 1991 کی نئی اقتصادی پالیسیوں کے ساتھ ہوا ہے، ویسے ویسے خصوصاً ادب اور تاریخ کی طرف ہمارا رویّہ مایوس کُن ہوتا چلا گیا ہے۔ تاریخ تو اب ہندستان میں ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے جس میں دائیں بازو کی سیاست کا فیصلہ کُن رول ہے۔ دائیں بازو کے سیاسی نظریات کے موید ین چاہتے ہیں کہ ہندستان اپنی تاریخ سے بالکل ناواقف ہو جائے اور پھر اس کی تہذیبی روایت سے بے خبری ان سیاسئین کو ہندستان کی تاریخ کے بارے میں گمراہیاں پھیلانے کا موقع اور نئی تاریخ گڑھنے کا موقع دے دے تاکہ وہ اپنے اس سیاسی ایجنڈے کو فروغ دے سکیں جس کا نفاذ تکثیری معاشرے میں ممکن ہی نہیں۔ ادب وفنونِ لطیفہ سے دل چسپی رکھنے والا طبقہ بھی ہندستان میں روز بہ روز مختصر ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب ہندستان کے زیادہ تر پرائیویٹ اسکولوں میں Humanities کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہی نہیں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ دسویں درجے تک لازمی مضامین کی فہرست میں شامل زبان وادب کی تدریس اس طرح نہیں کی جاتی کہ بچوں میں زبان کی صحیح فہم اور ادب کا ذوق پیدا ہو۔ Liberal Sciences کے فروغ کے تئیں بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر کے ہندستان اپنے موجودہ عبوری دور کے سفر کو نہایت کرب ناک بنا رہا ہے جس سے اس کے تہذیبی مستقبل کا مخدوش ہونا لازمی ہے۔ موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے فروغ میں بھی ہماری ادب سے عدمِ چسپی کا اہم رول ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلّف نہیں کہ تاریخ کے معاملے میں اب ہندستان کا مجموعی افسوس ناک رویّہ نری جہالت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس پر شاید پرانی نسل کو تعجب ہو مگر میرا سابقہ چوں کہ پلے کے ناظرین کے ذریعے نئی نسل سے روز ہی پڑتا ہے، اس لیے، ادب کے حوالے سے ان افسوس ناک حالات کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہے جو دائیں بازو کے سیاسی نظریات رکھنے والوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں حقیقت بن گئے ہیں۔ یہی حال ثقافت کا ہے۔ نوجوانوں میں ایسے لوگ اب کثرت سے مل جائیں گے جنھوں نے دلیپ کمار کا نام ہی نہ سُنا ہو۔ امین سیانی کے نام سے بھی نئی نسل واقف نہیں۔ ڈوم موریس نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ بمبئی میں گزارا۔ ان کی بیگم اور مشہور اداکارہ لیلا نائیڈو اپنے زمانے کی حسین ترین خاتون اور علم و ادب سے غیر معمولی دل چسپی رکھنے والی شخصیات میں شمار ہوتی تھیں مگر اب یہ نام بمبئی کے لیے بالکل اجنبی ہے جب کہ ابھی ان کے انتقال کو مشکل سے آٹھ برس ہی ہوئے ہیں۔ جب ہم Marx My Word کی بمبئی میں

ریہرسل کررہے تھے تو اس پلے میں کام کرنے والا ایک بھی آرٹسٹ ڈوم موریس یا لیلا نائیڈو سے واقف نہیں تھا جب کہ وہ تمام لوگ بمبئی میں پلے بڑھے اور وہیں کی ثقافتی دنیا کا حصہ ہیں۔ لیلا نائیڈو نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز رشی کیش مکرجی کی فلم 'انورادھا' سے کیا تھا جو ایک نسل کی فلم تھی۔ وہ اپنی فلموں کے بارے میں بہت محتاط تھیں اس لیے انھوں نے راج کپور کی چار فلموں میں کام کرنے سے اس لیے انکار کردیا کیوں کہ انھیں اندازہ تھا کہ وہاں ان کی اداکاری کے جوہر نہ کھل سکیں گے۔ شیام بینیگل کی ایک قطعی روایتی فلم 'تری کال' کے علاوہ پردیپ کرشنن کی ایک اور لیک سے بالکل ہی ہٹی ہوئی فلم 'الیکٹرک مون' (Electric Moon) اور مرچنٹ آئیوری کی Householder میں ششی کپور کے ساتھ بھی لیلا نے انگریزی فلم بینوں کے لیے اپنے کمالات دکھائے۔ انھیں Vogue میگزین نے دنیا کی پانچ حسین ترین عورتوں میں شامل کیا تھا۔ میری ان سے ایک طویل ملاقات 'تری کال' کی شوٹنگ کے زمانے میں ہوئی تھی۔

بمبئی میں تو اب نئی نسل کے لوگ سنیل گواسکر کو بھی صرف کرکٹ کمنٹیٹر ہی سمجھتے ہیں۔ اب اگر بمبئی کے پڑھے لکھے لوگ بھی ڈوم موریس اور لیلا نائیڈو کو نہیں جانتے ہیں اور سنیل گواسکر کو کرکٹ کمنٹیٹر سمجھتے ہیں تو یہ صورتِ حال ثقافت سے عاری ہماری ذہنی قلاشی کی آئینہ دار ہے جس کے لیے ہماری وہ قیادت ذمے دار ہے جسے ہم مذہب، علاقائیت اور ذات پات کے نام پر ووٹ دیتے ہیں۔ یعنی آج جو ہورہا ہے اس کے لیے براہِ راست ہم سے زیادہ قصوروار کوئی اور نہیں ہے۔

ساحر پر سہیل اختر کے ساتھ اور ایم.ایف حسین پر نادرہ ببّر کے ساتھ اور غالبؔ یا میرؔ کے اوپر میں نے دیگر لوگوں کے ساتھ بھی پلے کیے ہیں۔ ہم نے میتھلی شرن گپت اور مرزا غالب کی شاعری کے مشترکہ عناصر کے حوالے سے بھی پلے کرنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اس حد تک تخلیقی آزادی لی ہے جس حد تک Poetic license کے مسلّمہ اصولوں میں اس کی گنجائش تھی۔ میتھلی شرن گپت پر میں نے چندر موہن کے ساتھ کام کیا ہے اور ہندی تھیٹر کے ذریعے شاید ہی کبھی ہندستان میں اس طرح کی کوئی کوشش ہوئی ہو۔ عام ناظرین کی فہم کے لیے ہم یہ کرتے ہیں کہ اگر میتھلی شرن گپت کی کسی کویتا میں بچھڑنے کی بات ہورہی ہے تو ہم غالب کی غزلوں سے وہ اشعار لے لیتے ہیں جو ہجر سے متعلق ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہجر کے تصوّر کا جو ٹریٹمنٹ غالب کے یہاں ہے، وہ گپت کے یہاں نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر وہ موضوع جس پر غالبؔ نے خامہ فرسائی کی ہے، اس کا مقابلہ ہندستان کی کسی زبان کا کوئی شاعر نہیں کرسکتا مگر گپت ہمیں ہجر کے تصور کے

ایک مختلف رنگ سے متعارف کراتے ہیں۔ میں ایک اور پلے کرتا ہوں جس کو اردو نہیں بلکہ ہندستانی کہہ سکتے ہیں۔اس کا نام 'تیسویں شتابدی' ہے جس کو بادل سرکار نے بنگلہ میں لکھا تھا اور بجاج رام گوپال صاحب نے ٹرانسلیٹ کیا ہے۔ ایک اور پلے ہم کرتے ہیں جس کا عنوان انگریزی When God Said Cheers ہے لیکن پلے ہندستانی میں ہے اور اس میں شعرو شاعری بہت زیادہ ہے۔ 'تغلق' جس کو میں نے انگریزی میں کیا ہے، اس کو میں اردو میں بھی پرفورم کرنا چاہتا ہوں۔اسی طرح میری اپنی ذاتی کوشش یہ ہے کہ اردو شاعری کو ممکن حد تک ہندی اور انگریزی شاعری کے شائقین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں تک بھی موثر طریقے سے پہنچایا جائے جنھیں تاریخ کی جبر نے اردو رسمِ خط پڑھنے سے محروم کر دیا مگر وہ اردو شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، اس کے ذریعے اردو کی طاقت ور تہذیبی، ثقافتی اور ادبی روایتوں سے واقفیت میں ان کی دل چسپی ہے۔ ہم گاندھی جی پر بھی ہندی میں ایک پلے کرتے ہیں۔ اپنے تمام تر تضادات خصوصاً مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرنے کے اپنے مذمت آمیز رویّے کے باوجود گاندھی جی غضب کے آدمی تھے۔ وہ جب وہ 70 سال کے ہوئے تو انھوں نے سوچا کہ انھیں اردو سیکھنی چاہیے اور انھوں نے اردو سیکھنا شروع کر دیا۔ گویا اس طرح اگر میں شمار کرنا شروع کروں تو میرے اردو ڈراموں کی ایک لمبی فہرست ہے جس پر کسی اور وقت تفصیل کے ساتھ بات کروں گا۔

میرے دو پلے ایسے ہیں جن کے رول مجھ سے پہلے نصیرالدین شاہ کو اوفر کیے گئے تھے۔ ایک 'مولانا آزاد' جو سولو پلے ہے اور دوسرا 'بابر کی اولاد'۔ اول الذکر تو چوں کہ سولو پلے ہے، اس لیے، جو آرٹسٹ بھی اس رول کو کرتا، اسٹیج پر تمام وقت اسی کو موجود رہنا تھا۔ 'بابر کی اولاد' میں بہادر شاہ ظفر کا رول نصیر کے لیے تجویز ہوا تھا جو نہایت طاقت ور رول ہے مگر اس میں بھی مولانا آزاد کی طرح اتنے زیادہ ڈائیلاگ ہیں کہ نصیر کے پاس انھیں یاد کرنے کے لیے وقت نکالنا اس لیے ممکن نہ ہوا کہ انھیں یہ امید نہیں تھی کہ پلے کے دو تین سے زیادہ شوز ہو سکیں گے، اسی لیے، شاید انھیں پلے پر اتنی زیادہ محنت کرنے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔ یہی معاملہ مولانا آزاد کے ساتھ ہوا۔ یہ بات مجھے بعد میں اس وقت معلوم ہوئی جب میں اس پلے میں اپنا رول ادا کر چکا تھا۔ مولانا آزاد پلے کی کامیابی کے تین چار سال کے بعد کسی موقعے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ رول پہلے نصیرالدین شاہ کو دیا گیا تھا لیکن انھوں نے کہا کہ اگر میرے ساتھ کام کرنا ہے تو وقت لگے گا، کتنا وقت لگے گا یہ نہیں بتایا۔ یہ صورتِ حال کسی بھی ڈائرکٹر کے لیے مشکل ہوگی۔ البتہ جب میں نے

یہ پلے کیا تو ایک مرتبہ نصیر نے مجھ سے کہا: یار! ٹوم! تم اتنے لمبے ڈائیلاگ کیسے یاد کر لیتے ہو؟ اس کے علاوہ انھوں نے اس پلے کے بارے میں کبھی کوئی اور بات نہیں کی۔ 'بابر کی اولاد' میں ظفر کے کردار کے بارے میں مجھے بتایا کہ اس کردار پر بھی وہ ایک برس سے زیادہ غور کرتے رہے مگر آخر میں انھیں لگا کہ جس طرح کا یہ پلے ہے اس کے بھی دو تین سے زیادہ شو نہیں ہو سکیں گے۔ 'بابر کی اولاد' پر تو مظفر علی نے بھی ایک برس سے زیادہ غور کیا مگر سنا ہے کہ اسٹیج پر اس کا کیا فورمیٹ ہو، اس کو لے کر وہ آخر تک مذبذب ہی رہے اور آخر میں یہ پلے بھی ڈاکٹر ایم سعید عالم کی ہدایت میں نہایت کامیابی کے ساتھ ہوا اور گزشتہ چھے برس سے اس کے مسلسل شوز ہو رہے ہیں۔

'بابر کی اولاد' کے اردو اسکرپٹ پر اطہر فاروقی صاحب نے بھی بہت محنت کی تھی۔ وہ جب اس کا انگریزی سے اردو اور ہندی میں ترجمہ کر رہے تھے تبھی اس کے اسکرپٹ کو انھوں نے ایک ایسی شکل دے دی تھی جسے اردو یا ہندی میں سے کسی بھی زبان میں پرفورم کیا جا سکے۔ بابر کی اولاد کو انگریزی میں پرفورم کرنا آسان تھا کیوں کہ اسے لکھا ہی اس فورمیٹ میں گیا تھا جس میں وہ آسانی کے ساتھ انگریزی میں کھیلا جا سکے۔ پلے کا اردو قالب انگریزی پر اس لیے سبقت لے گیا کہ پلے کی زبان اردو قالب میں اس دور کے تہذیبی پس منظر — جو پلے کی اساس ہے — نہایت موثر انداز میں پیش کرتی تھی تو انگریزی میں ممکن ہی نہیں۔ اگر میں ایک فہرست بناؤں کہ میرے مقبول اور پسندیدہ پلے کون کون ہیں تو ان میں 'مولانا آزاد'، 'بابر کی اولاد' اور 'غالب' یہ تینوں اوّل نمبر کے پلے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ وہ ظفر جو 'بابر کی اولاد' میں ہے اور وہ ظفر جو 'لال قلعے کا آخری مشاعرہ' میں ہے دونوں میں بہت فرق ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ایک پلے کے دس شوز ہو جانے کے بعد ہی اس کا اصلی رنگ روپ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ 'بابر کی اولاد' اور 'مولانا آزاد' کے ساتھ یہی ہوا۔ مولانا آزاد کے تو اب تک 161 شوز ہو چکے ہیں اور بابر کی اولاد کے بھی تقریباً 50 شوز اردو میں ہم نے کیے ہیں، انگریزی شوز اس کے علاوہ ہیں۔ 'بابر کی اولاد' ہر اعتبار سے بہت بڑا پلے ہے، جس میں چوں کہ عام مغل بادشاہوں کے درد کی عکاسی کی گئی ہے، اس وجہ سے اس کے سیٹ بھی غیر معمولی ہیں اور کاسٹ بھی طویل۔

Marx My Word کا کچھ دن سے کوئی نیا شو ہوا ہی نہیں۔ لیکن پہلا شو جب ہم نے بمبئی میں کیا اور جو آخری شو ہم نے دلّی میں کیا تھا دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پلے کے پہلے شو کے اسپونسر یوسف حمید صاحب اس کی پہلی پرفورمنس دیکھ کر کافی مایوس ہوئے۔ افسوس کہ جب پلے بہت اچھا ہو گیا تو یوسف صاحب اسے اس لیے نہیں دیکھ سکے کہ اس کے آخری دو شوز

ہم نے دلّی میں کیے تھے اور ایک نہایت کامیاب شو بمبئی کے National Centre for Performing Arts کے سب سے بڑے آڈیٹوریم جمشید بھابھا تھیٹر میں کیا تھا جس میں تقریباً 1400 لوگوں نے یہ پلے دیکھا۔ دراصل پلے فیشن شوز نہیں ہوتے۔ وہ صرف ریہرسل کی سخت محنت سے اچھے تو ہو سکتے ہیں مگر انھیں چیزے دیگر است بنانے کے لیے ہدایت کار سے لے کر اہم کردار ادا کرنے والے آرٹسٹوں تک سب کے خلاّ قانہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھے پلیز پرفورم کرنے کے دوران جو ٹینشن اور دباؤ آرٹسٹوں پر ہوتا ہے، وہ صرف شو کرنے کے بعد ہی ختم ہو سکتا ہے۔

ہندستان میں اچھا اردو تھیٹر کم ہے اور صفّ اوّل کے اردو پلے تو بہت ہی کم کھیلے جاتے ہیں مگر ہندستان کا اچھا اردو تھیٹر دنیا کے کسی بھی تھیٹر سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ بمبئی میں مراٹھی اور گجراتی تھیٹر کی روایتیں بہت قدیم ہیں۔ بمبئی میں جب ان زبانوں کے پلے ہوتے ہیں تو ان کے شو پانچ پانچ دن تک مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ ان زبانوں میں تھیٹر کرنے والے لوگ ایسے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں جس میں لوگوں کی دل چسپی ہو۔ مجھے چھوٹی جگہوں پر جو اردو تھیٹر ہو رہا ہے، اس کا کچھ زیادہ علم نہیں اور اپنے محدود تجربے کی بنیاد پر میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب میں اردو کا کوئی پلے کرتا ہوں تو وہ لوگ بھی جنھیں اردو نہیں آتی مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمیں آپ کا پلے سمجھ میں آتا ہے جو نہایت اہم بات ہے۔ اردو اس ادبی زبان کے طور پر اب تیزی سے سکڑ رہی ہے جو معاشرے میں اردو کے ادب کا ذوق بیدار کر کے اسے اعلا اقدار سے روشناس کرائے۔ اس کے باجود جب اچھا اردو تھیٹر ہوتا ہے تو لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں جن میں یقیناً اکثریت اردو ادب اور ثقافت سے دل چسپی رکھنے والے غیر مسلم ناظرین کی اس لیے ہوتی ہے کیوں کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا اصطلاحی اردو والے تھیٹر دیکھنے نہیں جاتے۔

نصیرالدین شاہ بہت اچھا اردو تھیٹر کرتے ہیں۔ آج کل وہ مولانا آزاد پر گلزار صاحب کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پلے کر رہے ہیں۔ گلزار صاحب کے پلے باقاعدہ ہو رہے ہیں اور بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ بمبئی، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں گلزار صاحب سلیم عارف صاحب کے ساتھ بھی پلے کرتے ہیں جن کی بہت پذیرائی ہوتی ہے، اس لیے، اردو تھیٹر کا مستقبل تابندہ تو ہے مگر اس میں اس نئے خون کی ضرورت ہے جسے ادب کی فہم تو ہو مگر اس سے بھی زیادہ ضروری بات تھیٹر کے میڈیم سے اس کی واقفیت ہے۔ تھیٹر کرنا شاعری کرنے — خصوصاً غزل گوئی — یا اردو افسانہ لکھنے کے مقابلے میں ایک بالکل مختلف اور یقیناً مشکل تخلیقی عمل ہے۔ اس میں مہارت

کے اصول اور پیمانے بہت سخت ہیں۔ اردو تھیٹر کو بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہونا ہوگا اردو تھیٹر کرنے والوں کو دل چسپ موضوعات کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مردہ اور از کار رفتہ موضوعات سے اجتناب اردو تھیٹر کے لیے لازمی ہے۔ یہ بات عجیب وغریب ہے کہ اردو کے جو پلے اردو کی ادبی دنیا میں مشہور ہیں بلکہ بعض تو کلاسک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، وہ اسٹیج کی ٹکنیک کے اعتبار سے خاصے کمزور پلے ہیں جن میں سے اکثر کو اس شکل میں پرفورم کیا ہی نہیں جا سکتا جس شکل میں وہ اردو میں پڑھے یا نصاب کی ضرورت کے تحت کلاس روم میں پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے، اردو تھیٹر کرنے والوں کو اس ذہنیت سے نکلنا ہوگا کہ فلاں پلے اردو کے فلاں بڑے رائٹر نے لکھا ہے تو وہ اچھا ہی ہوگا۔ دراصل اچھا پلے صرف وہی لکھ سکتا ہے جو خود تھیٹر کرتا ہو اور جسے اسٹیج کی ضرورتوں سے پوری طرح واقفیت ہو۔ اردو تھیٹر کے موضوعات کو بھی وقت سے ہم آہنگ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً 'بابر کی اولاد' مغلیہ تاریخ کا موجودہ تناظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش ہے جو خصوصاً ان معاصر رویوں کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہے جنھوں نے فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ سیاست کے جن کو نئی نئی شکلیں دی ہیں۔ اس پلے میں مغلیہ تاریخ کا کماحقہٗ احاطہ کیا گیا ہے اور بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ان تمام حقائق کی معروضی ڈرامائی پیش کش اس پلے میں کی گئی ہے۔ پلے کا کمال مگر یہ بھی ہے کہ اسے آج کے سیاسی حالات کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ہندستانی زبانوں میں شاید بہت کم پلے ایسے ہوں گے جن میں تاریخ کو معاصر دنیا سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا گیا ہے کہ اگر ایک پہلو کو بھی نظر انداز کیا جائے تو پلے بے جان ہو جائے گا۔ ریزرویشن کی سیاست نے شناخت کی بحث کو نئے معنی دیے ہیں اور فرقہ واریت اور شناخت کے سوال پر کتنا ہی نیا خیال کیوں نہ ہو، حالات بہت جلد اسے از کار رفتہ کر دیتے ہیں مگر بابر کی اولاد اپنی پہلی نہایت کامیاب پرفورمنس کے چھے برس بعد بھی نہایت کامیابی سے کھیلا جاتا ہے اور اس کے شو آج بھی ہاؤس فل ہوتے ہیں جب کہ یہ سرتاسر سیاسی پلے ہے۔

'غالب' ہے تو ایک مخصوص زمانے تک محدود پلے لیکن اس میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں، وہ نہایت اہم ہیں مثلاً انگریزوں نے جو ظلم کیا، آرٹسٹ کی حیثیت سے غالبؔ کی زندگی میں کیا کیا نشیب وفراز آتے ہیں، ان سب کا تجزیہ تناظر میں کرنے کی کوشش ہم نے اس پلے میں کی ہے۔ غالب اور ان کے حالات ہر اس سچّے فن کار کو مختلف شکلوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نبرد آزما کرتے ہیں جو اپنے فن کی حد تک کسی قسم کی مفاہمت کرنے کو تیار نہیں۔

○○○

ظفر احمد صدیقی

اردو زبان کے امتیازات

(توسیعی خطبہ: پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ترتیب وتہذیب: اشفاق احمد عمر)

[یہ خطبہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ۲۰/مارچ ۲۰۱۵ء کو شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں زبانی پیش کیا تھا۔ یہ شعبۂ اردو کے سلسلۂ توسیعی خطبات کی ایک کڑی ہے۔ اس کے کنوینر ڈاکٹر مشیر احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو تھے۔ خاکسار اشفاق عمر نے اس کو ٹیپ کرلیا تھا۔ کاغذ پر منتقل کرنے کے بعد پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی نظر ثانی اور ڈاکٹر مشیر احمد کی اجازت کے ساتھ افادۂ عام کے خیال سے اسے شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ یہ کوشش مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔]

اے پیر حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میرے نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی ، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

علامہ اقبال کے ان اشعار کے سنانے کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر اردو کے طلبہ چاہے وہ

ریسرچ کے طلبہ ہوں یا ایم اے کے طلبہ ہوں یا ایم فل کے ہوں، وہ اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے طلبہ کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا پاتے ہیں۔ میں نے آج کا یہ جو موضوع رکھا (اردو زبان کے امتیازات) تو اس کا منشا یہ بتانا ہے کہ جس زبان کے آپ طالب علم ہیں وہ بہت ہی با ثروت زبان ہے۔ ہمارے ملک کے موجودہ حالات اور کچھ تقسیم کے پہلے کے حالات، کچھ تقسیم کے بعد کے حالات کے نتیجے میں یہ با ثروت زبان غربت زدہ زبان سمجھی جانے لگی۔ تو آپ لوگوں کو یہ بتانا ہے آج کی گفتگو میں کہ ہماری زبان نہایت ہی با ثروت، نہایت ہی طاقتور ہے۔ پھر ہمارے یہاں اردو میں ایک محاورہ استعمال ہوتا ہے (اپنے منھ میاں مٹھو بننا) تو ہم اپنی زبان کو جب یہ کہتے ہیں کہ بہت ہی با ثروت ہے، بہت ہی عمدہ ہے، پر شوکت ہے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم محض دعویٰ کر لیتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں سے ہم موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔ اور جاننا بھی چاہتے ہیں کہ صاحب ہماری زبان کے کیا امتیازات ہیں؟ کیا خوبیاں ہیں؟ تو اگر آپ کو دلائل کی روشنی میں اپنی زبان کی وقعت، اس کی قدر و قیمت کا علم ہو جائے تو آپ کے اندر اردو زبان سے وابستگی کی وجہ سے جو احساس کمتری ہے کہ صاحب ہم ایک بہت ہی غریب، پسماندہ زبان کے طالب علم ہیں، ریسرچ اسکالر ہیں، وہ کیفیت نکل جائے گی، وہ احساس دور ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ گفتگو آپ کے سامنے کی جا رہی ہے۔

یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ ہماری اردو زبان کا تعلق جدید ہند آریائی زبانوں کے سلسلے سے ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں سے مراد ملک کی وہ زبانیں ہیں جو جدید زبانیں کہلاتی ہیں (Modern indian languages) مثلاً بنگالی، پنجابی، تیلگو، مراٹھی، وغیرہ وغیرہ۔ اسی سلسلے کی ایک زبان اردو بھی ہے۔ لیکن ان تمام زبانوں کے مقابلے میں اردو کو بعض امتیازات حاصل ہیں۔ وہ امتیازات کیا ہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ہندستانی زبان ہے اور کسی زبان کے ہندستانی یا غیر ہندستانی ہونے اور اس کے خاندان یا اس کے شجرۂ نسب کا پتہ کیسے چلتا ہے؟ مثلاً بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ اردو ایک بدیسی زبان ہے۔ باہری زبان ہے۔ تو ہم اس کے مقابلے میں کیسے بتائیں کہ نہیں اردو ہندستانی زبان ہے۔ تو اس کا ایک اصول بتایا گیا ہے کہ زبان کے کچھ عناصر ایسے ہوتے ہیں جو بنیادی ہوتے ہیں۔ ایک سانچہ ہوتا ہے، ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں اوپر سے گوشت پوشت چڑھا دیا جاتا ہے تو ایسے ہی زبانوں کا ایک ڈھانچا اور سانچا بھی ہوتا ہے اور پھر اس کے اوپر دوسری زبان کا گوشت پوشت بھی چڑھ سکتا ہے۔ تو وہ سانچا اور ڈھانچا کیا ہے اور اس کا پتا کس طرح چلتا ہے؟ اس کا پتہ بنیادی طور پر تین چیزوں سے چلتا ہے۔

کسی زبان کے افعال اور کسی زبان کی ضمیریں اور کسی زبان کے اسمائے اشارہ اور اس کے جو حروف ربط ہوتے ہیں ان کا پتا چلایا جاتا ہے سب سے پہلے کہ اس کا تعلق کس سے ہے، تو اردو زبان کے جو افعال ہیں، آنا، جانا، سونا، کھانا، پینا، بیٹھنا؛ یہ نہ عربی ہیں نہ فارسی۔ دوسری بات جو اس کے اسمائے اشارہ ہیں یہ، وہ اور اسی طرح ضمیریں ہیں میں، تم، ہم یہ سب کے سب کسی غیر زبان کے نہیں ہیں۔ نہ عربی کے ہیں، نہ فارسی کے، نہ کسی اور غیر ملکی زبان کے ہیں۔ تو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اردو زبان بنیادی طور پر ہندستانی ہے کیوں کہ اس کے افعال ہندستانی، اس کی ضمیریں ہندستانی، اس کے اسمائے اشارہ ہندستانی۔ یہ پہلی بات ہوگئی کہ یہ ہندستانی زبان ہے۔

اب دوسری ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں جہاں تک اس کے امتیاز کا سوال ہے تو آپ سب ادب کے طالب علم ہیں اور تاریخ ادب کے طالب علم بھی ہیں آپ سب کو پڑھایا گیا ہے اردو زبان کے آغاز کے نظریات کے سلسلے میں کہ دہلی اور اس کے اطراف میں، (دہلی و پیرامنش کا لفظ استعمال کیا ہے امیر خسرو نے) جو زبان بولی جاتی تھی قدیم زمانے سے مثلاً سنسکرت، سنسکرت سے پھر پالی، پالی کے بعد اپ بھرنشیں۔ ان سے نکلی ہوئی جو زبان تھی جسے اب کھڑی بولی کہتے ہیں، مسلمانوں کے فتح دہلی کے بعد اطراف دہلی میں جب عربی و فارسی کے الفاظ، ترکی کے الفاظ کا داخلہ کھڑی بولی میں ہوا تو اس سے اردو زبان ممتاز ہوئی یا قائم ہوئی یا اس کی قدیم شکل بن گئی۔ تو دہلی اور اس کے اطراف کی زبان پر مسلمانوں کی آمد کے بعد جو تغیرات ہوئے اور تبدیلیاں ہوئیں ان کے ذریعے سے جو زبان وجود میں آئی بنیادی طور پر وہی ہماری قدیم اردو زبان ہے۔ پھر اس کے بعد اس میں عہد بہ عہد تغیرات ہوتے رہے دوسری زبانوں کے درمیان سے اس کے امتیاز کا جو سلسلہ قائم ہوا وہ گویا عربی و فارسی عناصر کے داخلے کے ذریعے سے ہوا۔ پھر اس کا عہد بہ عہد ارتقا ہوتا رہا۔

جو ہمارا دکنی دور ہے ولی تک وہ پورے تین سو سال کا ہے۔ اس تین سو سال کے عرصے میں اردو زبان نے مقامی عناصر کی طرف توجہ زیادہ دی اور اس سے اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی اور زبان کے ارتقا کی مختلف شکلیں وجود میں آتی رہیں۔ زبان ترقی کرتی رہی۔ اس میں ملا وجہی بھی پیدا ہوئے انھوں نے 'سب رس' لکھی، نصرتی پیدا ہوئے انھوں نے اپنے قصائد لکھے، اس کے علاوہ مثنویاں لکھیں وغیرہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ سے لے کر بلکہ مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر یہ پورا ادب تین سو سال کا ہے۔ اگر آپ قطب شاہی دور کے ادب کا مطالعہ کریں، عادل شاہی دور کے ادب کا مطالعہ کریں، بہمنی دور کے ادب کا مطالعہ کریں، تو ہمارے اردو ادب کی

پوری تاریخ چھ سو سال کی ہے۔اس چھ سو سال میں ولؔی تک کا جو زمانہ ہے دکنی دور کا وہ تین سو سال کا ہے اور اس کے بعد شمالی ہند کا جو دورِ اول ہے جس کو دورِ ایہام گویاں کہتے ہیں، آبرؔو اور ناجیؔ سے لے کر موجودہ 2015 تک یہ پورا عرصہ بھی تین سو سال کا ہے۔تو دکنی دور پورے تین سو سال پر محیط ہے جب کہ بقیہ شمالی ہند کا موجودہ دور تین سو سال پر محیط ہے۔

اپنی تاریخ کے ابتدائی تین سو سال تک اردو زبان نے ،اپنے ارتقا میں زیادہ سے زیادہ جو مقامی عناصر تھے، ہندستانی عناصر تھے اُن کے اوپر تکیہ کیا اور ان کے ذریعے اپنے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔مثال کے طور پر نصرتیؔ کے ایک قصیدہ کے دو چار شعر ہم آپ کو سناتے ہیں، اس نے علی عادل شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اس کی ایک جنگ میں فتح یابی کے موقعے پر، وہ اس میں کہتا ہے:

اے شہ تو ہم نامِ علی، شاہاں پو تیری سروری
دُلدُل فلک کا راج تج، کرتا زمانہ قنبری

تو اپنے طور پر اس کے اندر بھی شکوہ بیان پایا جاتا ہے۔اور اسی میں ایک شعر اور سنیے۔وہ کہتا ہے:

جاں تو کٹک لے،ٹک اٹک،سنمکھ ہٹک سوندل کیا
کھڑکاں کوں کھڑکاں لگ ادک،ہر اک کھڑک ہوئی کھر کھری

'جاں' کے معنی ہیں جہاں، 'تو کٹک لے' کے معنی ہیں،تم فوج لے کر، 'ٹک اٹک' یعنی تھوڑا سا ٹھہر کر، 'سنمکھ ہٹک' یعنی آمنا سامنا کرتے ہوئے ،للکارتے ہوئے۔'سوندل کیا' یعنی جنگ کی۔پورے مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ اے ممدوح جہاں کہیں بھی تم نے اپنی فوج لے کر اور تھوڑا سا جم کر اپنے فوجِ مقابل سے سوندل کیا یعنی اس سے مقابلہ کیا۔'کھڑکاں کوں کھڑکاں لگ ادک، تو تلواریں تلواروں سے خوب ٹکرائیں، 'ہر اک کھڑک ہوئی کھر کھری' یعنی جتنی تلواریں تھیں کند ہو گئیں۔جگہ جگہ سے ان میں دندانے پڑ گئے۔ایسی زبردست تم نے جنگ کی۔تو اس شعر کو سنانے کا مقصد یہ ہے کہ دیکھیے وہ مقامی الفاظ سے اپنے پورے مضمون کو ادا کرتا ہے۔اپنے ممدوح کی شجاعت، اس کی بہادری کا، بلکہ اس قصیدے کے سارے مضامین اور اس میں جتنے اس کے لیے استعارے استعمال کیے، جتنی تشبیہیں استعمال کیں ، جتنے مفردات استعمال کیے، مرکبات استعمال کیے وہ زیادہ تر مقامی ہیں چنانچہ اسی قصیدے میں آگے کہتا ہے:

دارا ستے کجرو اٹل تج داب تل دابے گئے

وہ کہتا ہے دارا جیسے کجرو، ٹیڑھی چال چلنے والے، اٹل نہ ٹلنے والے تمھارے دباؤ کے نیچے دب گئے۔

اوچار کر جب جگ میں توں ظاہر کیا اسکندری

یعنی جب تم نے دنیا میں اپنی قوت ظاہر کر کے اسکندری دکھائی ،یعنی اپنی بہادری دکھائی اپنی بادشاہت دکھلائی تو دارا جیسے کجر واٹل تمھارے داب کے تلے داب دیے گئے۔اسی قصیدے میں وہ یہ بھی کہتا ہے:

تجھ شہ جواں کے سامنے رستم تو یک نھواوہے
رکھتا ہے تس گرزِگراں تو جھنجھنے تے کمتری

ان مثالوں کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ دکنی دور میں ہماری جواردو زبان ہے،اس نے مقامی عناصر سے پورا پورا کسب فیض کیا اور جتنی اس کے اندر گنجائش تھی اس گنجائش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔زبان کے ارتقا میں بھی اور اس کے قیام میں بھی۔پھر مختلف اصناف کے اندر چاہے وہ مثنوی ہو، چاہے وہ قصیدہ ہو، چاہے وہ غزل ہو ہر صنف کے اندر اس زبان نے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کیں اور ہندی الاصل عناصر سے زیادہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔پھر اس کے بعد ولی سے اس زبان کا اگلا دور شروع ہوتا ہے۔ ولی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو فارسی عناصر کے ساتھ مربوط کر دیا۔ابھی جو آپ نے کلام سنا اسی طرح سے غزل اگر آپ پڑھیں قلی قطب شاہ کی تو وہ غزل بھی مقامی عناصر پر مشتمل ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

سکھی آج پیالہ انند کا پلا مجھ و یا قوت ادھراں کی مستی دلا مجھ

اس شعر میں وہ محبوب کے یاقوت ادھراں کا ذکر کرتا ہے،ادھر کے معنی ہوتے ہیں ہونٹ ،تو وہ کہتا ہے کہ تم مجھ کو یاقوت جیسے لبوں کی مستی دلا دو۔اور سکھی آج مجھے آنند کا پیالا پلا دو،خوشیوں کا جام پلا دو۔پھر بعد میں جب ولی نے اس زبان کو فارسی عناصر سے ہم آہنگ کر دیا تو میر نے اس طرح کہا:

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

تو سفر شروع ہوا تھا 'یاقوت ادھراں' سے اور ''یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ'' کے ذریعے اب زبان اگلے مرحلے میں داخل ہوگئی۔تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ پورے تین سو سال تک اردو زبان نے مقامی عناصر سے،مقامی تلمیحات سے، مقامی استعاروں سے اور مقامی مرکبات و مفردات سے پورا پورا استفادہ کیا اور جب مقامی عناصر سے پوری طرح کسبِ فیض کر چکی تو اس نے اب فارسی کی طرف اپنا ارتفاع کیا ۔چناں چہ فارسی عناصر کو، فارسی تلمیحات کو ،فارسی

استعاروں کو، فارسی تشبیہات کو اردو میں داخل کیا گیا۔ یہ لسانی اور تاریخی کارنامہ ولؔی نے انجام دیا۔ دکنی شعرا میں آپ ولؔی کا کلام پڑھیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زبان کا اب انداز تبدیل ہو گیا ہے:

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

اب 'یاقوت ادھراں' جیسی ترکیبیں نہیں آ رہی ہیں بلکہ ''روح بخشی ہے کام تجھ لب کا'' اور ''دم عیسٰی ہے نام تجھ لب کا'' میں فارسی ترکیبیں لائی جا رہی ہیں۔

رگ یاقوت کے قلم سے لکھیں خط پرستاں پیام تجھ لب کا

یعنی رگ یاقوت کے قلم سے خط پرست تمھارے لبوں کا پیام لکھ رہے ہیں۔ یاقوت ایک قیمتی پتھر ہے اور اس کی باریک نسیں رگِ یاقوت کہلاتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نزاکت اور لطافت کی وجہ سے تمھارے لب کا پیام لکھنے کے لیے رگ یاقوت کا قلم استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

رگ یاقوت کے قلم سے لکھیں خط پرستاں پیام تجھ لب کا

اس شعر میں لفظ یاقوت میں ایک خاص رعایت یہ ہے کہ بغداد میں جو عباسی خلیفہ تھا معتصم باللہ اس کے زمانے کا ایک بہت مشہور خطاط تھا جو یاقوت مستعصمی کہلاتا ہے تو یہاں اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہاں 'خط پرستاں'، 'پیام تج لب کا' اور 'لب' کے ساتھ 'خط پرستوں' کے ذکر کی مناسبت کیا ہے؟ اس کی مناسبت یہ ہے کہ 'خط' ہونٹ کے اوپر جمنے والے باریک روئیں کو بھی کہتے ہیں۔ تو تمھارے ہونٹوں کے اوپر اے میرے محبوب جو باریک باریک روئیں جمے ہوئے ہیں وہ اتنے خوبصورت ہیں کہ اس کو بھی خط سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور اس کے چاہنے والے یعنی عشاق گویا خط پرست ہیں، اسی لیے عاشقوں کو تمھارے لبوں کا پیام لکھنے کے لیے رگ یاقوت کے قلم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ رگ کا ذکر بعد میں غالبؔ نے بھی کیا ہے:

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

رگ باریک نسوں کو کہتے ہیں تو گویا محبوب کے ہونٹوں کے ذکر کی مناسبت سے، اس کی لطافت کی مناسبت سے، اس کی نزاکت کی مناسبت سے، شاعر یہ کہتا ہے کہ رگ یاقوت کے قلم سے لکھتے ہیں خط پرست لوگ تمھارے لبوں کے پیام کو۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

حکمت و منطق و معانی پر مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

اب لب سے چوں کہ منطق کا بھی تعلق ہے کیوں کہ وہ آلۂ نطق ہے اور حکمت کا بھی تعلق ہے

کیوں کہ حکیمانہ اور فلسفیانہ باتوں کا بیان لبوں سے ہوتا ہے اور معانی علم بلاغت کو کہتے ہیں جس کے تحت معنی، بیان، بدیع تینوں شامل ہیں اور مطلق بلاغت کو بھی علم معانی کہا جاتا ہے، اس لیے محبوب کے لبوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے لب کا کلام حکمت و منطق اور معانی و بیان گویا سب پر مشتمل ہے۔ تو اس مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کہاں نصرتی کا آپ نے کلام سنا اور کہاں اس کے بعد ولی کے دور تک پہنچتے پہنچتے اس زبان نے اپنا رشتہ فارسی سے استوار کر لیا۔

ہندستان کی تمام جو زبانیں جن کو ہم نے جدید ہند آریائی زبانیں کہا ہے، ان کے مقابلے میں اردو کا امتیاز یہ ہے کہ دوسری زبانیں اپنے دائرے میں ہی محدود رہ گئیں وہ تین سو سال بعد بھی اس دائرے سے باہر نہیں نکلیں اور اردو نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اپنی جڑوں سے پورے تین سو سال تک زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرنے کے بعد اس نے اپنا رشتہ فارسی سے جوڑ لیا۔ جس طرح مختلف پودوں کی قلم ہوتی ہے اور ایک پودے کو دوسرے پودے سے جوڑتے ہیں جس سے اس میں نیا ذائقہ، نئی لطافت، نیا مزا پیدا ہو جاتا ہے تو ایسے ہی اردو زبان کا امتیاز یہیں سے قائم ہو گیا۔ اگر اردو اپنے اسی دائرے میں محدود رہ جاتی جیسے دوسری زبانیں مراٹھی ہے، تیلگو ہے، پنجابی ہے، بنگالی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس کی ساری لطافت مقامی عناصر تک ہی محدود رہ جاتی، لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ یہ غیر معمولی کارنامہ تاریخی طور پر اردو زبان نے یا یوں کہیے کہ اردو زبان کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں نے، اس کے شعرا نے، اس کے ادبا نے، اس کے اہل قلم نے اور اس کے بولنے والوں نے یہ انجام دیا کہ فارسی کے ساتھ اردو کو پیوست کر دیا۔ فارسی کے ساتھ اردو کی قلم لگا دی اور جب فارسی سے اس کا رشتہ قائم ہو گیا تو چھے سو سال کی فارسی قصیدہ کی تاریخ، ایسے ہی فارسی غزل کی تاریخ، فارسی مثنویات کی تاریخ اور اس کے علاوہ جو دوسری اصناف ہیں ان کی تاریخ اردو شاعری سے پیوست ہو گئی اور اردو شاعری سے پیوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں فارسی طرز کی غزلیں اور مثنویاں کہی جانے لگیں۔ اسی طرح اردو میں فارسی طرز کے قصائد کہے جانے لگے۔ ابھی آپ نے نصرتی کے قصیدہ کا شعر سنا:

اے شہ تو ہم نامِ علی شاہاں پو تیری سروری
دُلدُل فلک کا راج تج کرتا زمانہ قنبری

اور اب سودا کا انداز دیکھیے، سودا کیا کہتے ہیں:

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاج دار
کھینچے ہے پھر خزاں پہ صفِ لشکر بہار

کہتے ہیں ، یوں زبانیِ پیکِ صبا یہ حکم
پہنچا حضور سے طرفِ باغِ روزگار
مرکب جو شاخسار کے ہیں اُن پہ اب شتاب
پہنچیں سوار ہو کے جوانانِ برگ و بار
ہیں بخشی و وزیر جو مرّیخ و ماہتاب
اُن کو یہ امر ہے کہ امیرانِ نامدار!
مُنہ کھول دو خزائنِ گل اَشرفی کا تم
پکڑو قلم کو ، ہاتھ رکھو پیادہ و سوار

جیسے ہی فارسی سے یہ زبان پیوست ہوئی اس کا لہجہ تبدیل ہوگیا۔اس کا انداز بدل گیا،تو نصرتی کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہے۔باقر آگاہ نے اپنی ایک مثنوی کے دیباچے میں لکھا ہے اور وہ سودا کے معاصر تھے کہ بڑا افسوس ہے کہ ہمارے زمانے میں سودا کو بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے اور نصرتی کو اس کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا ہے حالانکہ نصرتی کے یہاں بھی شکوہ بیان، زور بیان اور تخیل کی پیچیدگی موجود ہے لیکن افسوس کہ بس اس کی زبان ذرا سی پرانی ہے، دکنی ہے، اس لیے سودا کو اس پر فوقیت دی جاتی ہے۔ وہ خیال ان کا درست تھا، لیکن ان کے سامنے یہ بات پوری طرح سے منکشف نہیں تھی کہ فارسی سے پیوست ہوجانے کی وجہ سے اور فارسی عناصر کو اپنے اندر داخل کر لینے کی وجہ سے سودا کی زبان کے اندر جو لطافت پیدا ہوگئی اور اس کے اندر جو رعایتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ نصرتی کی زبان میں نہیں ہوسکتی تھیں اور یہ فطری بات ہے۔اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ اردو زبان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے دائرے کو، مقامیت تک محدود رکھنے کے بجائے فارسی سے ہم آمیز کر دیا اور فارسی سے ہم آمیز کر لینے کی وجہ سے اس کو بہت وسیع میدان نصیب ہوگیا، اسی لیے پھر بعد میں غالب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

گویا غالب کے دور تک آتے آتے یہ فارسی عناصر اس میں ایسے داخل ہوتے گئے، ہوتے گئے، ہوتے گئے کہ اب یہ نوبت آگئی کہ غالب یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ زبانِ ریختہ فارسی کے مقابل کیسے ہوسکتی ہے تو لاؤ میرا کلام اس کو سنا دو۔ گویا کہ تم یہ محسوس کروگے کہ اردو اب فارسی کے ہم پلّہ ہوگئی ہے۔اپنے قصیدوں میں بھی، اپنی مثنویوں میں بھی اور اپنی غزلیات میں بھی۔حاصلِ

کلام یہ کہ زبان کی شستگی ونفاست کا جو معیار اور سلیقہ فارسی زبان کو اس کی مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے، تمدن کی وجہ سے، تاریخ کی وجہ سے حاصل تھا اور زبان میں جو لطافت تھی اس کو اردو نے جذب کرلیا۔

خود فارسی کا حال کیا تھا؟ علامہ شبلی نے 'شعرالعجم' کے اندر فارسی زبان کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران اسلامی قلمرو میں داخل ہوگیا اور خلافتِ اسلامیہ کا حصہ بن گیا تو فارسی کی جو قدیم شکلیں تھیں، جس کو دری کہتے ہیں یا جس کو پہلوی کہتے ہیں۔ وہ پرانی زبان اور اس کا وہ پرانا ادب سب ختم ہوگیا اور عربی زبان وادب کا اس پر غلبہ ہوتا چلا گیا اور پھر فارسی زبان وادب کی جو تاریخ ہے اس تاریخ کے مطابق فارسی کے شعرا نے عربی سے اسی طرح کسب فیض کیا جیسے کہ اردو نے فارسی سے کسبِ فیض کیا۔ چناں چہ رودکی کے معاصر شعرا میں متنبّی اور ابوفراس ہمدانی کے نام آتے ہیں اور اس کے متقدمین میں ابوتمام، جریر، فرزدق اور اخطل وغیرہ آتے ہیں۔ دوسری طرف عنصری، دقیقی اور منوچہری یہ لوگ فارسی کے مشہور شعرا ہیں انھوں نے عربی شاعری کو سامنے رکھ کر غزلیات لکھیں، قصائد لکھے اور دوسری اصناف کے اندر طبع آزمائی کی۔ تو جدید فارسی جس کو اب ہم صرف فارسی کہتے ہیں اس نے عربی سے پورا پورا کسب فیض کیا تو اس طرح بالواسطہ اردو زبان نے دو زبانوں سے فیض اٹھالیا۔ ایک تو فارسی سے براہِ راست اور فارسی نے جو عربی کے عناصر اپنے اندر داخل کرلیے تھے ان عربی عناصر کو بھی اردو نے بواسطۂ فارسی اپنے اندر جذب کرلیا۔ تو اب دوہرا فائدہ اردو زبان کو حاصل ہوگیا۔

اردو زبان کے اندر فارسی کے واسطے سے جو عناصر آئے ہیں وہ مفردات ہوں یا مرکبات ہوں یا تشبیہات ہوں یا استعارات ہوں یا تلمیحات ہوں، ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق خود فارسی زبان وادب سے ہے اور کچھ وہ ہیں جو عربی سے فارسی کی طرف منتقل ہوئے ہیں تو فارسی سے پیوند کرنے کی وجہ سے اردو زبان کو دوہرا فائدہ حاصل ہوا۔ ایک تو بہت بڑا ذخیرۂ الفاظ اس کو مل گیا، اس ذخیرۂ الفاظ کا کچھ حصہ وہ ہے جو خود فارسی نے عربی سے حاصل کیا تھا اور کچھ وہ ہے جو اس کا اپنا ہے۔ اردو زبان کو یہ جو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا یہ ہندستان کی دوسری زبانوں کو حاصل نہیں ہوسکا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندستان کی دوسری زبانیں مثلاً بنگالی، پنجابی یا مثلاً مراٹھی ان زبانوں میں عربی وفارسی کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان میں بھی ہیں۔ ان کے جو ماہرین ہیں، ان کے جو جاننے والے ہیں، وہ کہتے ہیں ان زبانوں میں بھی فارسی کے اور عربی کے الفاظ موجود ہیں لیکن دو

فرق کے ساتھ ایک فرق تو یہ کہ اردو نے اپنا رسم خط عربی رسم خط کے متوازی رکھا اور عربی کے حروف تہجی کو بھی لے لیا پھر اس پر فارسی کے حروفِ تہجی کا اضافہ کر لیا پھر اس کے بعد ہمارے یہاں جو مقامی آوازیں تھیں جو فارسی اور عربی میں نہیں تھیں ان کے لیے الگ مخلوط حروف تہجی بنا لیے۔ مثلاً بھ، پھ، تھ، ڈھ وغیرہ۔ حاصل یہ ہے کہ اردو نے کئی طرف سے فائدہ اٹھایا۔ سب سے پہلے جو ہندستانی آوازیں تھیں ان کو لے لیا۔ پھر چ کی آواز عربی میں نہیں ہے فارسی میں ہے۔ پ کی آواز بھی فارسی میں ہے عربی میں نہیں ہے اس کو بھی لے لیا۔ پھر عربی کے جو حروفِ تہجی تھے وہ بھی لے لیے۔ تو عربی و فارسی کے حروفِ تہجی لے لینے کی وجہ سے عربی کے الفاظ یا فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں آئے وہ اپنی شناخت رکھتے ہیں، پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً ضعف جب ہم 'ض' سے لکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مادّہ ض، ع، ف ہے۔ ضعف، مضاعف، اضعاف یہ سب کے سب اسی مادّہ کے الفاظ ہیں جو ہمارے یہاں استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ جو دوسری ہندستانی زبانیں ہیں مثلاً مراٹھی یا پنجابی یا بنگالی، انھوں نے بھی عربی فارسی کے الفاظ لیے لیکن ان کو بگاڑ دیا اور رسم خط بھی باقی نہیں رکھا۔ اس لیے پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں یا فارسی کے ہیں۔ تغیر و تبدیلی اردو میں بھی ہوئی لیکن اس تغیر و تبدیلی کے باوجود وہ فارسی کے عناصر، فارسی کے الفاظ یا عربی کے الفاظ اپنی پوری شناخت رکھتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ بنگالی میں بولتے ہیں مجمدار، مجمدار کیا چیز تھی؟ یہ دراصل مجموعہ دار تھا، جیسے زمیں دار ہے، جاگیر دار ہے ایسے ہی بنگال کے علاقے میں مجموعہ دار ہوتا تھا۔ ایک خاص رقبے کا مالک، خطے کا مالک، ریاست کا مالک اب وہ تبدیل ہوتے ہوتے ہمارے زمانے میں مجمدار کہا جانے لگا۔ اب مجمدار سے ذہن منتقل نہیں ہوتا ہے کہ یہ ہے کیا؟ لیکن اردو میں عربی و فارسی کے بیشتر الفاظ اصل حروفِ تہجی کے باقی رکھنے کی وجہ سے اور املا کے باقی رکھنے کی وجہ سے شناخت میں آجاتے ہیں۔ ایسے ہی آپ سہسرام کا نام سنتے ہیں جہاں شیر شاہ سوری مدفون ہے وہاں اس نے اُس زمانے میں ایک بہت بڑا مسافر خانہ عام مسافروں کے لیے بنایا تھا اور اس کا نام تھا ''شاہ سرائے عام'' پھر شاہ سرائے عام سے وہ بدل کر کے 'شہسر ام' ہو گیا پھر سہسرام ہوا۔ اب موجودہ زمانے میں 'ساسارام' کہا جاتا ہے۔ تو ساسارام، سہسرام، شہسرام، شاہ سرائے عام یہ اس لفظ کی مختلف منزلیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اردو نے جو عناصر زیادہ تر فارسی سے یا عربی سے فارسی کے واسطے سے لیے ہیں تو ان میں بھی بیشتر کا چوں کہ املا محفوظ ہے اس لیے ہم کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ الفاظ کہاں سے آئے ہیں ان کی اساس کیا ہے، ان کا تعلق کس سے ہے۔ یہ بھی اردو زبان

کا ایسا امتیاز ہے جو ہندستان کی دوسری زبانوں کو نصیب نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جب ایک زبان میں کوئی لفظ کسی دوسری زبان سے آتا ہے تو اپنے ساتھ بعض نئے تصورات و احساسات بھی لاتا ہے۔ تو اردو کو فارسی کی تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور اصطلاحات وغیرہ کے ذریعے سے بہت سے ایسے تصورات واحساسات بھی حاصل ہو گئے جو ہندستان کی دوسری زبانوں کو نصیب نہیں۔ مثال کے طور پر ذوقؔ بہار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

سوال یہ ہے کہ صغریٰ کیا چیز ہے؟ کبریٰ کیا چیز ہے؟ نتیجہ کیا چیز ہے؟ یہ منطق کی اصطلاحیں ہیں۔ علم منطق کے اندر کسی نتیجہ کو نکالنے کے لیے سولہ شکلیں ہیں ان سولہ شکلوں میں سے ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک صغریٰ ہو، ایک کبریٰ ہو، ان دونوں سے نتیجہ نکالا جائے جیسے دنیا متحرک ہے اور ہر متحرک فانی ہے، لہٰذا دنیا فانی ہے۔ تو اس کا جو پہلا مقدمہ ہے۔ 'دنیا متحرک ہے' یہ ہے صغریٰ پھر اس کے بعد جو دوسرا مقدمہ ہے کہ 'ہر متحرک فانی ہے'، اس کو کہتے ہیں کبریٰ، اور پھر اس سے جو نتیجہ نکالا گیا 'لہٰذا دنیا فانی ہے' یہ ہے نتیجہ۔ تو اب یہ جو تینوں اصطلاحیں انھوں نے استعمال کی صغریٰ، کبریٰ اور نتیجہ تو یہ ظاہر ہے کہ یہ اردو کی اصطلاحیں نہیں تھیں۔ یہ اصطلاحیں تو عربی میں وجود میں آئیں۔ عربی میں علم منطق کی کتابوں کے اندر صغریٰ، کبریٰ اور نتیجہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر جو فارسی کی کتابیں ہیں علم منطق کی ان کے اندر بھی یہ ساری کی ساری اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں اس کے بعد اردو نے ان کو لے لیا تو یہ سارے تصورات اردو میں منتقل ہو گئے تو حاصل یہ کہ اردو میں عربی و فارسی لفظوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہی نہیں آیا بلکہ ہر لفظ اپنے ساتھ ساتھ احساسات، تعبیرات اور اس کے بہت سارے متعلقات لے کر داخل ہوا۔ تو اس پوری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان ہندستان کی دوسری آریائی زبانوں کے مقابلے میں اس لیے باثروت اور باقوت ہے کہ اس کے پاس تین طرح کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اول مقامی الفاظ، دوسرے فارسی کے الفاظ اور تیسری طرف عربی کے الفاظ۔ بیک وقت اس کے پاس تین تین زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ ہیں۔ لہٰذا وہ جب چاہے وہ عربی کا لفظ استعمال کر لے، جب چاہے فارسی کا استعمال کر لے اور جب چاہے اردو کا لفظ استعمال کر لے۔ تو وہ تمام زبانیں جن کے پاس ایک ہی طرح کا ذخیرہ ہے۔ اس کے مقابلے میں یقیناً اس زبان کی طاقت زیادہ ہوگی جس کے پاس تین تین طرح کے ذخیرۂ الفاظ موجود ہیں۔

یہ تو الفاظ کے حوالے سے بات تھی۔ الفاظ کے بعد ایک چیز ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں قواعد یا لسانی نقطۂ نظر۔ تو لسانی نقطۂ نظر سے بھی اردو نے ان دونوں زبانوں یعنی عربی و فارسی سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس سلسلے کی تمام چیزوں کو اس تھوڑے سے وقت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں آپ سے صرف چند باتیں بتائیں گے مثلاً واحد اور جمع کے بارے میں۔ اردو میں 'کتاب' کی جمع 'کتابیں' ہوتی ہیں اور صراحی کی جمع صراحیاں تو گویا ''ی'' اور ''ن'' کے ذریعے جمع بنا لیتے ہیں اور کبھی 'ی'، 'و' اور 'ن' کے ذریعے بھی جمع بنا لیتے ہیں مثلاً آدمیوں نے یہ کہا۔ لوگوں نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ۔ گویا جمع بنانے کا صرف یہی دو مقامی طریقہ اس کے پاس موجود تھا۔ بہت پہلے قدیم اردو میں دیکھیں تو ان سے بھی جمع بنتی ہے۔ لوگاں، عورتاں، مرداں تو جمع کا یہ بھی ایک طریقہ ہو گیا تو اب تین طریقے ہو گئے واحد سے جمع بنانے کے ''ا۔ن'' ''ی۔ن'' ''و۔ن'' ان تینوں طریقوں سے اردو میں جمع بنتی تھی۔ پھر جب فارسی سے اس نے اپنا رابطہ کر لیا تو فارسی میں 'ہا' لگا کے جمع بنتی ہے اور 'ا۔ن' سے بھی جمع بنتی ہے۔ اسپ کی جمع اسپاں، اسپ بہ معنی گھوڑا اور اسپاں بہ معنی گھوڑے۔ تو ''ا۔ن'' سے بھی جمع بنتی ہے اور ''ہ۔الف'' سے بھی جمع بنتی ہے مثلاً کتاب سے کتابہا اور باغ سے باغہا وغیرہ۔ اور اب اردو کے پاس اپنا مال تو تھا ہی 'ا۔ن'، 'و۔ن'، 'ی۔ن' اس نے فارسی سے بھی جمع لینا شروع کر دیا۔ مثلاً:

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں درخلوتِ شب ہا
سر تار نظر ہے رشتۂ تشبیہِ کوکب ہا

یہ غالبؔ کے ابتدائی دور کا غیر متداول کلام کا شعر ہے لیکن اس میں فارسی جمع کا استعمال تو کیا گیا ہے۔ مصرعِ اول میں 'شب' کی جمع ہے 'شبہا' اور مصرعِ ثانی ''سر تار نظر ہے رشتۂ تشبیہِ کوکب ہا'' میں کوکب کی جمع ہے کوکب ہا اس کے علاوہ اس شعر میں 'مہوش' کی جمع 'مہوشاں' بھی آئی ہے۔ اس فارسی طریقے سے بھی جمع بنانے کا اردو میں عام رواج ہے۔ اسی طرح خواجہ آتشؔ کا شعر ہے:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

اس میں ہزار کی جمع فارسی طرز پر ہزار ہا لائی گئی ہے۔

اس سے بھی اور آگے بڑھیے تو اردو کو ایک اور فائدہ حاصل ہے۔ عربی میں جمع کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس کو جمع سالم کہتے ہیں اور ایک قسم وہ ہوتی ہے جس کو جمع مکسّر کہتے ہیں۔ تو جمع سالم وہ ہے جس میں واحد کا وزن جمع میں سلامت رہے یعنی باقی رہے جیسے مُسلِمٌ کی جمع مُسلِمون، تو م، س، ل، ان سب پر جو حرکت ہے یعنی میم پر پیش اور ل پر زیر یہ جمع میں بھی

برقرار ہے۔اسی طرح مُسلِمۃٌ سے مُسلِماتٌ میں بھی واحد کا وزن برقرار ہے تو اس کو جمع سالم کہتے ہیں۔اس کے برعکس جمع میں جب واحد کے لفظ کا وزن ٹوٹ جائے تو اس کو جمعِ مکسّر کہتے ہیں۔جیسے کتاب کی جمع کُتُب۔'کتاب' جب واحد آپ نے کہا تو 'ک' پر زیر تھا۔اور جب کُتُب کہا تو 'ک' کے اوپر پیش آ گیا۔ایسی جمعوں کو جمع مکسّر کہتے ہیں۔تو اردو کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فارسی کی جمعیں تو لے ہی لیں، اس کے علاوہ عربی سے جمع مکسّر بھی اور جمع سالم بھی حاصل کر لیں۔اس طرح اس کے پاس اب جمعوں کا ذخیرہ بہت زیادہ ہو گیا۔آپ علامہ اقبال کا یہ شعر سنیے:

اے اَنْفُس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ ہے تری ذات

نَفْس کی جمع اَنْفُس، اُفُق کی جمع آفاق اور آیت کی جمع آیات۔ایک ہی مصرعے میں تین تین عربی جمعیں ہیں، پہلی دونوں جمع مکسّر ہیں اور تیسری جمع سالم ہے۔تو دوسری زبانوں کو تو جمع کا یہ طریقہ نصیب ہی نہیں لیکن اردو کو یہ سہولت ہے کہ فارسی طریقے سے بھی جمع بنا لے اور جب چاہے عربی طریقے کے مطابق جمع بنا لے۔علامہ اقبال نے نعت کا موضوع اختیار کرتے ہوئے شعر کہا ہے:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

رُسُل رسول کی جمع ہے اور سُبُل سبیل کی جمع: وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے/ غبار راہ کو بخشا فروغ وادیِ سینا۔تو دیکھیے کیا غیر معمولی طاقت ہے اردو کے پاس۔جتنی فارسی کی جمع تھیں سب اس کی، اور جتنی عربی میں جمع مستعمل ہیں سب اس کی، اور جتنی اردو کی جمع ہیں سب اس کی، تو بیک وقت اس کے پاس اتنی ثروت، اتنی طاقت ہے۔ظاہر ہے یہ بات دوسری زبانوں کو نصیب نہیں ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مثال لیجیے۔''صفت، موصوف'' صفت، موصوف کا عام طریقہ اردو میں یہ ہوتا ہے: اچھا لڑکا، اچھی لڑکی، اچھا خط، اچھی کتاب، یہ اردو کا عام طریقہ ہے۔اور اس عام طریقے میں یہ ہوتا ہے کہ صفت پہلے لائی جاتی ہے اچھی، اچھا، سیاہ سفید اور اس کا موصوف جو ہوتا ہے وہ بعد میں لایا جاتا ہے۔سفید گھر سفید کاغذ وغیرہ وغیرہ۔اور عربی کا جو طریقہ ہے یا فارسی کا اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے، برعکس یہ ہوتا ہے کہ موصوف پہلے آتا ہے اور صفت بعد میں آتی ہے۔جیسے کتاب نو، نئی کتاب، کتاب پہلے ہو گیا اور اس کی صفتِ نو یہ بعد میں آئی۔کتابِ جدید،

کتابِ قدیم ،تو اردو نے کیا کیا کہ اپنا جو صفت موصوف بنانے کا طریقہ تھا وہ تو ہے ہی اس کے پاس۔ وہ تو اس کا اپنا مال ہے۔ آگے بڑھ کر اس نے فارسی کے مرکبات توصیفی اور مرکبات اضافی بھی سب کے سب اپنے ذخیرے کے اندر شامل کر لیے۔ اب جب اس کا دل چاہے وہ فارسی انداز سے موصوف صفت بنالے اور جب چاہے اردو کے انداز سے بنالے۔

جو واحد جمع کی بات تھی اسی کے حوالے سے ایک بات اور ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے جسے عربی میں تثنیہ کہتے ہیں۔ تثنیہ کہتے ہیں دو کو۔ تو اردو میں عام طور پر واحد اور جمع کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تثنیہ کا استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن اردو نے یہاں پر بھی دانائی کا ثبوت دیا اور یہ کہا کہ نہیں جب ہم چاہیں گے تثنیہ بھی استعمال کر لیں گے۔ دوسری کسی جدید ہندستانی زبان کے پاس تثنیہ نہیں ہے اردو کے پاس وہ بھی ہے۔ جیسے والدین۔ تو والد اور والدہ دونوں کو ملا کے کہنے کے لیے تثنیہ استعمال ہوتا ہے تو اردو میں والدین بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح مکہ و مدینہ دونوں کو ملا کے کہا جاتا ہے حرمین شریفین۔ تو عربی کی طرح حرمین شریفین ہمارے یہاں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ والدین بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو جب چاہو تثنیہ بھی استعمال کر لو، عربی کے اس مال پر بھی اردو کا تصرف ہے۔ اردو کو اختیار ہے کہ اس کو بھی استعمال کر لے۔ شاہ مبارک آبروؔ کا شعر ملاحظہ ہو:

اُن بھواں سے لگے ہیں جس کے نین وہ کہاتا ہے حاجی الحرمین

اسی طرح میر انیسؔ کا مشہور شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں مولیٰ نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

پھر یہ جو صفت موصوف کی بات بتائی تو عربی میں صفت و موصوف کا ایک قاعدہ ہے کہ اگر موصوف غیر ذوی العقول میں ہے۔ غیر ذوالعقول سے مراد یہ کہ بے جان چیز ہے تو اس کی جو صفت لائی جاتی ہے وہ واحد مونث کی شکل میں لائی جاتی ہے۔ جیسے ارشادات عالیہ، ارشادات جمع اور عالیہ واحد مونث، فنون لطیفہ، فنون جمع اور لطیفہ واحد مونث۔ عربی کے اس قاعدے سے بھی اردو نے فائدہ اٹھا لیا کہا یہ بھی ہمارا مال ہے یہ بھی ہم استعمال کریں گے۔ چناں چہ ہمارے یہاں بھی اصطلاح یہ اصطلاح موجود ہے فنونِ لطیفہ کی، اور ایسے ہی بولتے ہیں 'علوم اسلامیہ' ہیں تو علوم اسلامیہ بھی ہمارا، فنون لطیفہ بھی ہمارا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے عربی میں کہ موصوف جمع ہو اور اس کی صفت بھی جمع لائی جائے یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ موصوف ذوالعقول میں سے ہو یعنی انسانوں کی طرح، جان دار چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔ اردو نے کہا یہ بھی ہم آپ سے لے لیں گے۔ جیسے ازواج مطہرات تو ازواج جمع اور مطہرات اس کی صفت تو اردو میں ازواج مطہرات بھی

استعمال ہوتا ہے اور فنون لطیفہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ علوم اسلامیہ بھی استعمال ہوتا ہے، علوم جدیدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ علوم قدیمہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو صفت موصوف کی جو شکلیں عربی میں رائج تھیں کہ موصوف جمع کے مقابل صفت بھی جمع یا موصوف جمع کے مقابل صفت واحد۔ اردو نے کہا یہ بھی ہمارا مال ہے اور وہ بھی ہمارا مال ہے کیوں کہ سب اردو میں استعمال ہوتا ہے موقع ومحل کے لحاظ سے۔ اس کے علاوہ جب چاہو خود اردو طریقے سے واحد جمع اور صفت موصوف بنالو۔

یہ تو ہم نے بس دو مثالیں دی ہیں۔ اسم فاعل میں اسم مفعول میں اسی طرح سے اسم ظرف میں جو قواعد کی مختلف اصطلاحیں ہیں ہر جگہ اردو کے پاس تین طرح کا مال موجود ہے۔

اول مقامی یعنی ہندستانی، دوسرے فارسی کا اور تیسرے عربی کا۔ تینوں کے تینوں اس کے بس میں ہیں۔ جیسے آپ بولتے ہیں 'مشرق'، آپ بولتے ہیں 'مغرب' یہ مشرق ومغرب اسم ظرف ہے۔ مشرق طلوع ہونے کی جگہ، مغرب غروب ہونے کی جگہ، منزل قیام کرنے کی جگہ، مسجد سجدہ کرنے کی جگہ، یہ سب عربی کے اسم ظرف تھے، اردو نے کہا سب ہمارا ہے۔ اردو میں مشرق استعمال ہوتا ہے، منزل بھی استعمال ہوتا ہے، مسجد بھی استعمال ہوتا ہے اور جب چاہیں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہ سونے کی جگہ ہے، تو مقامی لفظوں کو کسی نے چھینا نہیں ہے مقامی الفاظ تو ہمارے پاس تھے ہی اس کے علاوہ عربی وفارسی کا قواعد کے لحاظ سے تمام کا تمام ذخیرہ اردو کے پاس موجود ہے۔

ان سب کے بعد جو خصوصیت اردو کی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تعصب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب آپ عربی کے الفاظ مت استعمال کیجیے، یا ہندی الاصل الفاظ مت استعمال کیجیے۔ پوری چھوٹ ہے شاعر کو، ادیب کو، لکھنے والے کو، بولنے والے کو، سننے والے کو آپ جہاں جو لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھیں وہاں وہ لفظ استعمال کرلیں مثال کے طور پر علامہ اقبالؔ کی بہت مشہور غزل ہے:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

اسی میں آگے چل کر کے وہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اور اسی میں وہ کہتے ہیں:

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب وشوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

تو اب آپ یہ دیکھیے کہ اقبال کس طرح کے لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے اندر بہ کثرت مقامی الفاظ ہیں یعنی اس میں ہندستانی افعال بھی استعمال کر رہے ہیں اس کے علاوہ تن اور من بھی استعمال کر رہے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

بہ کثرت مقامی الفاظ سے بنائی ہوئی نہایت خوب صورت مترنم غزل موجود ہے:

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

بیشتر الفاظ مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں پھر بھی اس کے ترنم میں کوئی کمی نہیں۔ دوسری جانب غالبؔ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جو اکثر و بیشتر فعل آنے ہی نہیں دیتے۔ ابھی اقبال کی آپ نے مثال دیکھی زیادہ تر مقامی الفاظ، مقامی مفردات، مقامی افعال انھوں نے استعمال کیے اب غالب کو دیکھیے:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

پورا شعر آپ پڑھ لیجیے کوئی فعل نہیں آنے دیا۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
کوہ کن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کہیں کوئی فعل آنے ہی نہیں دیا، مقامی کوئی لفظ کوئی حرف ربط، ہے، میں، کو تک نہیں آنے دیا:

سامعِ زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن نہ سرو برگِ ستائش، نہ دماغ نفریں

حاصل یہ ہے کہ اردو زبان کے اندر ایسی ثروت ہے اور اس کے پاس الفاظ و اسالیبِ بیان کا ایسا ذخیرہ ہے کہ وہ جب چاہے اور جس رخ پر اسلوبِ بیان کو ڈھالنا چاہے ڈھال لے۔ ابھی گفتگو کے آغاز میں آپ نے اقبالؔ کے جو اشعار سنے:

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اسی زمین میں میرؔ کی بھی غزل موجود ہے:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
صد موسمِ گل ہم کو تہ و بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا
ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

آپ دیکھیے اسی زمین کو اقبالؔ نے بالکل الگ انداز میں استعمال کیا۔ یعنی اس کو نظم کے اندر ڈھال کے مسلسل خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کر لیا۔ اور اسی کو میرؔ نے استعمال کیا تو عشق اور ماورائے عشق ہر طرح کا مضمون باندھ دیا۔ لے سانس بھی آہستہ! اس کا کوئی جواب نہیں ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اسی طرح انسان کی زندگی، اس کے مال و متاع اور اس کے فخر و غرور سب پر یہ شعر بہترین تبصرہ ہے:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹاراہ میں یاں ہر سفری کا

اردو زبان کے پاس مختلف اسالیب بیان موجود ہیں۔نصرتی کا اسلوب بیان آپ نے سن لیا۔قلی قطب شاہ کا سن لیا، اس کے بعد میر کا اس کے بعد اقبال کا، یہ ثروت کسی زبان کو نصیب نہیں ہے۔اور یہ جو کہا گیا کہ آپ کی زبان سب سے زیادہ پرشوکت ہے اور پرقوت ہے، ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے، تعبیرات کے لحاظ سے اور اسلوب بیان کے لحاظ سے تو یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔بہ قول غالب:

بیاورید گرایں جابود زباں دانے غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یعنی کوئی زبان داں ہو تو اس کو بلاؤ اور اس سے پوچھو کہ اردو زبان کی ثروت کا مقابلہ، اس کے قواعد کی ثروت کا مقابلہ، اس کے ذخیرۂ الفاظ کی ثروت کا مقابلہ کسی دوسری مقامی زبان سے کرلے۔ ہرگز کسی کے پاس یہ ثروت نہیں ہے۔پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ جب ہم اردو زبان کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے مختلف شعرا اور ادبا کا ذکر کرتے ہیں تو شاعروں اور ادیبوں ہی کے ذریعے ہماری ثروت کا بھی پتا چلتا ہے۔تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کوئی غالب کسی دوسری زبان میں موجود ہے؟ اور غالب کا تو معاملہ یہ ہے کہ ہندستان ہی کیا ہندستان کے باہر کی زبان میں بھی کسی کو غالب نصیب نہیں ہے۔اور کسی باہر والے کو اقبال بھی نصیب نہیں ہے۔ بنگالی تمل، تیلگو، چھوڑیے فارسی میں بھی کوئی اقبال نہیں ہے اور عربی میں بھی نہیں ہے۔عربی کا ایک شاعر ہے شوقی، جس کا اقبال سے موازنہ کیا کرتے ہیں ۔یہ جدید دور کا مصر کا شاعر ہے لیکن اگر آپ شوقی کے کلام کو براہِ راست عربی میں پڑھیں تو آپ کہیں گے کہ علامہ اقبال کا جواب شوقی کے پاس بھی نہیں ہے اور حافظ بھی مصر کے جدید شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔علامہ اقبال کے معاصرین میں ہیں یا ان سے کچھ چھوٹے، وہ بھی اقبال کے ہم پلہ نہیں ہیں اور ہندستان کی زبانوں کو چھوڑیے خود فارسی میں بھی اقبال کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔جب اقبال کے کلام کو جدید دور میں باضابطہ فارسی میں ایران میں شائع کیا گیا تو وہ لوگ اقبال کے بارے میں کہتے ہوئے پائے گئے کہ اقبال جیسا شاعر پورے چھ سو سال یا سات سو سال کی تاریخ میں فارسی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے یہاں جس طرح ایک منظم فکر ہے، ایک فلسفہ ہے اور امت مسلمہ کے لحاظ سے ان کے یہاں کچھ خیالات ہیں، کچھ افکار و تصورات ہیں ایسی فکری دبازت اور تہہ داری کا حامل فارسی یا عربی کا کوئی شاعر اقبال کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ محض فکر سے کوئی بات نہیں بنتی جب تک فکر کو خوبصورت پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کی طاقت نہ ہو ۔اس سلسلے میں آپ کے سامنے ایک لطیفہ عرض کرتا ہوں ''ایک کوی سمّیلن ہورہا تھا میرے خسر محترم وہاں تشریف لے گئے ان کو بھی شعروشاعری کا شوق تھا تو انھوں نے کہا کہ کوی سمیلن کا نام سنا تو ہم بھی چلے گئے کہ سنیں بھائی کیا کہتے ہیں ،لیکن صاحب ہم بہت ہی بور ہوئے اور وہاں سے واپس چلے آئے پوچھا گیا کیوں؟ تو انھوں نے کہا کہ صاحب وہاں ایک کوی سنا رہا تھا: ''اونٹ کے منھ میں جیرا، دے کے بہلو لے باٹا، اور بکری کے منھ میں کو ہنڑا، دے کے انٹکئو لے باٹا'' وہ کوی صرف یہی کہنا چاہتا تھا کہ اس دور میں انصاف نہیں ۔چھوٹے سے جو چیز سنبھل نہیں سکتی وہ اسے دے دی گئی ہے گویا بکری کے منھ میں کو ہنڑا دیا گیا ہے اور اس کے برخلاف اونٹ کو زیرا دے دیا گیا ہے۔ تو کیا یہ تعبیر کسی ادبی تعبیر کا مقابلہ کرسکتی ہے؟ دیکھیے اقبالؔ کیا کہتے ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اس میں بھی شکوہ کیا گیا ہے کہ بندۂ مزدور پریشانیوں کے دور سے گزر رہا ہے لیکن یہ تعبیر دیکھیے ۔ شاعر اللہ تعالیٰ سے خطاب کررہا ہے۔اس میں اس کی بے بسی اور عاجزی بھی شامل ہے، اور ساتھ ساتھ شکوہ بھی شامل ہے چنانچہ کہتا ہے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں بھی
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

ترقُّع دیکھیے ،خیالات کی پیش کش دیکھیے ،الفاظ کی تابانی وروانی دیکھیے یہ کسی دوسری زبان کو نصیب نہیں ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے جو اردو زبان کے پاس موجود ہے تو اردو زبان کے جو امتیازات ہیں وہ یہ کہ اس کے پاس مقامی عناصر بھی ہیں، فارسی عناصر بھی ہیں، اس کے بعد عربی عناصر بھی ہیں اور کسی آدمی کے پاس مال بہت رکھا ہوا ہے گودام کے اندر لیکن اس کا استعمال کچھ نہیں ہے۔ وہ مال رکھنا بے کار ہوتا ہے۔صرف ذخیرہ نہیں ہے ہمارے یہاں۔ ہمارے شعرا میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ، تو صفِ اول کے شعرا ہیں، صفِ دوم اور سوم کے شعرا کا بھی کوئی مقابلہ نہیں دوسری زبانوں میں بلکہ دوسری زبانوں کو جگر مرادآبادی اور نشورؔ واحدی جیسا بھی کوئی شاعر نصیب نہیں۔

تو ہماری زبان کی جو ثروت ہے ہماری زبان کی جو تاریخ ہے یعنی ہماری نثر کی تاریخ، ہماری نظم کی تاریخ، ہماری مختلف اصناف سخن کی تاریخ دوسری زبانوں کے پاس اس کا بھی کوئی جواب موجود نہیں۔ یہی حال ہماری داستانوں کا ہے جن کی ۴۶ جلدیں تو زیور طبع سے آراستہ ہوسکیں اور باقی رام پور کے محافظ خانے کے اندر طویل تقطیع کی بیسیوں جلدیں غیر مطبوعہ پڑی رہ گئیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے داستانوں پر چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی صرف ان اردو داستانوں کا مطالعہ کرلے تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ہم سب یہاں اردو کے اساتذہ یا طلبہ ہیں اور ہم میں سے شاید ہی کسی کو توفیق ہوئی ہو دو چار کے استثنا کے ساتھ کہ اس نے ان داستانوں کا مطالعہ کیا ہو۔ تو وہ چیز جو ہمارے یہاں متروکات کے درجے میں ہے دوسری زبانیں اس کا بھی کوئی موازنہ اور مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

آپ لوگوں کے سامنے جو کچھ اب تک بیان کیا گیا یہ تو مقدمہ تھا یا تمہید تھی۔ اصل کہنا آپ طلبہ وطالبات سے یہ ہے کہ اپنی زبان کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اس کے ادب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں اور اپنے اندر بصیرت پیدا کریں۔ اپنے ادب کا مطالعہ کریں، اپنی دانشوری کے حقوق کو ادا کریں۔ ان سب کے بعد سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان جڑ سے کٹ رہی ہے۔ موجودہ سیاسی حالات کی وجہ سے نئی نسل میں داخل نہیں ہو رہی ہے، اس کے پڑھنے والے موجود نہیں ہیں، بہت بڑا ذخیرہ اور بہت بڑا ادب کا سرمایہ ہے لیکن پڑھے گا کون؟ تو اس تمہید کے بعد آپ کو مخاطب کر کے یہ کہنا تھا کہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ پہلے تو یہ ہے کہ اپنی زبان سے محبت کریں، اس کو مجبوری کے طور پر نہ پڑھیں کہ صاحب اب کہیں Addmission نہیں مل رہا تھا اردو ہی میں مل گیا تو اس طرح نہ پڑھیں بلکہ یہ کہیں کہ صاحب یہ ایک نہایت خوبصورت، نہایت طاقتور، نہایت باثروت، نہایت اعلیٰ درجے کی زبان ہے جس سے ہمارا رشتہ قائم ہوا ہے۔ اور اس کے امتیازات کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس سے محبت کریں، اس سے عشق کریں اور محبت و عشق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی بقا اور اس کے فروغ کی کوشش کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ ایک آدمی کیسے کوشش کرسکتا ہے؟ ہم میں سے ہر شخص یہ کوشش کرسکتا ہے۔ اپنے جو چھوٹے ہیں اپنے گھر کے، اپنے پڑوس کے، اپنے بھائی کے، اپنی بہن کے بچے ان کو ہم اردو کی طرف راغب کریں، ان کو بتائیں، ان کو پڑھائیں کیوں کہ ان کے ذہن میں یعنی نئی نسل کے ذہن میں اردو سے متعلق کچھ ہے ہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک اردو ایک غیر ضروری چیز ہے، بلکہ بے وقت کی راگنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ہم اردو کے طالب علم ہیں، ہم اردو سے محبت کرتے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک پر

فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے گردوپیش والوں کو اردو کے بارے میں بتائیں، اردو کو پھیلائیں اور اس کے فروغ کی کوشش کریں یہ ہے اصل چیز۔

آپ نے سنا ہوگا تبلیغی جماعت آتی ہے لوگ ان کا بیان سنتے ہیں اور آخر میں ان کے یہاں ہوتی ہے تشکیل کہ بھائی جماعت میں جانے کے لیے نام لکھائیے۔تو آج یہاں بھی تشکیل کرنا مقصود ہے۔آپ پہلے تو احساس کمتری دور کیجیے اور دوسری بات یہ ہے کہ اپنی زبان سے محبت کیجیے،اس کی قدر و قیمت کو سمجھیے اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ اس کے فروغ کے لیے کوشش کیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہر خاتون ایک خاندان کے برابر ہوتی ہے'' اور وہ خاندان کے افراد کی تربیت کا کام انجام دیتی ہے۔تو بچپن سے ہی بچوں کو اپنی زبان کی اہمیت بتائیے، سمجھائیے،اس کی طرف راغب کیجیے اور اس کی خادم بنیے۔

یاد رکھیے اردو زبان کے فروغ کے لیے مسلسل خدمت کی ضرورت ہے،ریاضت کی ضرورت ہے مجاہدے کی ضرورت ہے۔ہمارے ایک آنجہانی استاد تھے حکم چند نیّر وہ بتاتے تھے کہ پہلے عدالتوں کے اندر سارا کام اردو میں ہوتا تھا۔اس کے بعد جب ہندی کو عدالتوں میں داخل کیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ ہندی میں بھی دستاویز پیش کی جاسکتی ہے تو کوئی پیش کرتا ہی نہیں تھا۔بہت کم لوگ ہندی میں دستاویز لکھواتے تھے۔نیر صاحب نے بتایا کہ تب ہندی والوں نے ہر کچہری کے باہر چوکیاں لگائیں اور یہ کہا کہ ہم آپ کی دستاویز مفت میں لکھیں گے آپ ہم سے لکھوا لیجیے۔آپ وہاں اردو میں لکھواتے ہیں پیسے دے کے وکیل صاحب، منشی صاحب کو۔ آپ ہم سے لکھوا لیجیے ہندی میں ہم مفت لکھنے کے لیے تیار ہیں۔تو انھوں نے کہا کہ خاص طور پر جو شمالی ہند کا Area اور یوپی کا علاقہ تھا،وہاں تمام کی تمام کچہریوں میں بلا استثنا ان کے رضا کار بیٹھے رہتے تھے کہ مفت میں ہندی میں دستاویز لکھوا لیجیے۔تو اب آپ اردو والوں کو بھی اسی طرح رضا کارانہ خدمت انجام دینی ہوں گی کہ صاحب ہم اردو پڑھانے کے لیے تیار ہیں ہم اردو سکھانے کے لیے تیار ہیں،آیئے ہم سے سیکھ لیجیے، پڑھ لیجیے۔جس وقت آپ کہیے ہم آپ کو پڑھا دیں گے تبھی اردو کا حق ادا ہوگا۔اسی طرح اپنے گھر، اپنے محلے، اپنے پڑوس، اپنے بھائی، اپنے بھتیجے،اپنے بھانجے ان سب کے درمیان اردو کو پھیلانے کی ضرورت ہے ورنہ یہ زبان جڑ سے کٹ رہی ہے اردو کی ساری ثروت اپنی جگہ تسلیم۔لیکن اس کو آئندہ سانس کیسے نصیب ہوگی؟ اس کو زندگی کیسے ملے گی؟ بقا کیسے ملے گی؟ آپ لوگوں کو یہی سوچنا اور سمجھنا ہے اور یہی میری گفتگو کا ماحصل ہے۔ ●●

ہندی ادب سے

رام کمار ورما

ترجمہ: **شیو یا ترپاٹھی**

اورنگ زیب کی آخری رات

کردار:۔

عالمگیر اورنگ زیب	:	مغل بادشاہ
زینت النسا بیگم	:	اورنگ زیب کی بیٹی
کریم	:	ایک سپاہی
حکیم		
کاتب		

زماں ومکاں:۔ 18 فروری 1707، رات کے چار بجے، احمد نگر کا قلعہ

(بیجا پور اور گولکنڈہ کی شیعہ ریاستوں پر فتح کے بعد جب اورنگ زیب نے مراٹھوں کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کیا تو اسے اپنی ناکامی صاف نظر آنے لگی۔ اس نے جب چھترپتی شواجی کے بیٹے شنبھا جی ¼a-kkt½ کو اس کے خاندان کے افراد کے ساتھ گرفتار کرلیا اور اس کے سامنے اسلام قبول کرنے کی تجویز رکھی تو شنبھا جی نے نفرت سے اس تجویز کو ٹھکراتے ہوئے اورنگ زیب کے متعلق نہایت سخت اور تلخ الفاظ کا استعمال کیا۔ نتیجتاً شنبھا جی کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کردیا گیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی مراٹھوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سترہ برسوں تک زبردست جنگیں ہوتی رہیں۔ ادھر مغل فوج روز بروز عیش پرست ہوتی جارہی تھی، اس لیے، ہر لڑائی میں اسے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ 1706 میں اورنگ زیب نے دیکھا کہ اس کی فوج اب بہت زیادہ آرام طلب اور عیاش ہوگئی ہے۔ ملک کی مالی حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ لڑائی کا نقصان

''جزیہ'' سے بھی پورا نہیں ہو پا رہا ہے۔ جلال الدین اکبر کے وقت سے جمع آگرہ اور دہلی کے قلعوں کی تمام دولت دکن کی لڑائیوں میں ختم ہو چکی ہے۔ تین تین مہینوں سے سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی تنخواہ نہیں دی گئی ہے۔

ملک کی اس بری حالت کے ساتھ ہی اب اورنگ زیب خود بھی ضعیف ہو چکا ہے۔ پہلے جیسی طاقت اب اس کے جسم میں نہیں رہی۔ اس کا فتح کا خواب نا امیدی میں ضم ہو چلا ہے۔ اس کے خیالات اسے چین نہیں لینے دیتے۔ آخر میں نا امید ہو کر وہ احمد نگر چلا آیا ہے۔ اس وقت وہ احمد نگر کے قلعے میں بیمار پڑا ہے۔ اس کا جسم ٹوٹ چکا ہے۔ اسے بخار اور کھانسی ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۸۹ برس ہے۔ وہ ایک سادے سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ سرہانے سفید ریشم کا تکیہ ہے جس کے دونوں بازوؤں پر زری کی ہلکی پٹیاں ہیں۔ وہ ایک سفید ریشم کی چادر کمر تک اوڑھے ہوئے ہے۔ دبلا پتلا جسم، تراشی ہوئی سفید داڑھی، ناک لمبی مگر ضعف کے باعث کچھ جھکی ہوئی۔ وہ سفید لمبا کرتا پہنے ہوئے ہے۔ گردن میں موتیوں کا ایک لمبا ہار پڑا ہے جس کے بیچ میں ایک بڑا نیلم جڑا ہے۔ ہاتھ میں تسبیح ہے۔ عالمگیر کے چہرے کے تاثرات نہایت پشیمانی اور افسردگی سے پُر ہیں۔ اس کے دائیں طرف ایک آراستہ نیچے تخت پر اس کی بیٹی زینت النسا بیگم بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی عمر 40 برس کے قریب ہے۔ دیکھنے میں مہذب اور دلکش، وہ نیلے رنگ کی ریشمی شلوار اور پیازی رنگ کی اوڑھنی سے آراستہ ہے۔ گردن میں جواہرات کا ہار ہے اور کمر میں موتیوں کی پیٹی کسی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر خوف اور اندیشوں کی لکیریں نظر آ رہی ہیں۔

کمرے میں کوئی خاص سجاوٹ نہیں ہے مگر پورے ماحول میں ایک پاکیزگی ہے۔ پلنگ کے سرہانے دو شمع دانوں میں شمعیں روشن ہیں۔ دوسری طرف صرف ایک ہے تاکہ جس سے عالمگیر کی آنکھوں میں چکا چوندھ نہ ہو۔ پلنگ کی دائیں طرف زینت النسا کے تخت کے پاس ہی ایک بڑی کھڑکی ہے جس سے ہوا کا جھونکا آ رہا ہے، اس سے گھنے اندھیرے کے بیچ آسمان پر تارے دکھائی پڑ رہے ہیں۔ عالمگیر کے سامنے کونے کی طرف ایک زریں پنجڑے میں ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے جو کبھی کبھی اپنے پروں کو پھڑ پھڑا دیتا ہے۔ پلنگ سے کچھ ہٹ کر سرہانے کی طرف ایک تپائی ہے جس پر دوا کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس ایک اونچے اسٹینڈ پر لمبے منہ والی سونے کی صراحی ہے، جس میں عرقِ گلاب رکھا ہوا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک سونے کا پیالہ ایک ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ (پردہ اٹھنے پر عالمگیر کچھ لمحوں تک بے چینی سے کھانستا ہے، پھر ایک گہری اور بھاری سانس لے کر خلا میں دیکھتے ہوئے زینت سے کہتا ہے)۔

عالم: کھانسی...ایک لمحے کے لیے نہیں رکتی...کوئی دوا اسے نہیں روک سکتی زینت! کوئی دوا اسے نہیں روک سکتی...یہ موت کی آواز ہے۔اسے کون روک سکتا ہے؟(پھر کھانستا ہے)... موت کی آواز۔

زینت: (تسلی بخش آواز میں) نہیں جہاں پناہ! آپ کی کھانسی بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔حکیموں نے...

عالم: (بیچ میں ہی) حکیموں نے...حکیموں نے کچھ نہیں سمجھا۔کچھ نہیں سمجھا انھوں نے، یہ کھانسی کوئی مرض نہیں ہے بیٹی! یہ کھانسی سلطنت کے اکھڑنے کی آواز ہے جو ہمارے دم کے ساتھ اکھڑنا چاہتی ہے (منہ بگاڑ کر) اکھڑے، کہاں تک روکیں گے ہم؟ (کھانستا ہے) کتنے بلوائیوں کو نیست و نابود کیا، کتنے غدر روکے مگر...مگر یہ کھانسی نہیں رکتی! رکے بھی کیسے؟ (تھکی آواز میں) اب عالمگیر عالمگیر نہیں ہے!

زینت: نہیں جہاں پناہ! آج بھی ہندستان اور دکن آپ کے اشارے پر بنتا اور بگڑتا ہے! آپ کے تیور دیکھ کر افغانستان بھی گھٹنے ٹیکتا ہے۔راجپوت، جاٹ، مراٹھے اور سکھ آج بھی آپ سے لوہا نہیں لے سکتے۔

عالم: مگر شواجی لے سکتا تھا۔ہماری ذرا سی لاپرواہی کے باعث وہ ہاتھ سے نکل گیا۔اس کی وجہ سے زندگی بھر پریشان رہا۔مگر تھا بہادر اور دلیر...خیر، کافر بہ جہنم رفت، (کھانستا ہے) اس کا بیٹا شنبھا جی...(رک جاتا ہے اور گہری سانس لیتا ہے)۔

زینت: چھوڑیے ان باتوں کو جہاں پناہ! یہ باتیں اس وقت دل اور دماغ دونوں کو خراب کرنے والی ہیں۔آپ جیسے ہی اچھے ہوں گے...

عالم: (بیچ میں ہی) اب اچھے نہیں ہو سکتے زینت! چند لمحوں کی زندگی کون جانے کب خاموشی آجائے۔مگر بیٹی ہم نے ایک دن بھی آرام نہیں کیا۔(کھانستا ہے) ایک دن بھی نہیں۔ راجپوت جیسی قوم پر حکومت کرنا آسان نہیں ہے، سب سے بڑی محنت ہے۔مراٹھوں کی ہمت پست کرنا زندگی کا سب سے بڑا کرشمہ ہے۔وہ ہم نے کیا بیٹی، وہ ہم نے کیا۔مگر اب...اب ہم کمزور ہو گئے ہیں۔اب کچھ نہیں کر سکیں گے (ٹھنڈی سانس لے کر کلمہ پڑھتا ہے) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...

زینت: آپ سب کچھ کر سکیں گے جہاں پناہ! اچھا، اب آپ یہ کھانسی کی دوا لے لیجیے، (دوا دینے کے لیے اٹھتی ہے) حکیم صاحب دے گئے ہیں۔

عالم: (تیز آواز میں) کیا حکیم صاحب خود نہیں آئے؟

زینت: آئے تھے۔ کافی دیر تک آپ کا انتظار کرتے رہے۔ آپ ہوش میں نہیں تھے۔ وہ ذرا دیر کے لیے باہر چلے گئے ہیں۔ انھوں نے ابھی پھر آنے کو کہا ہے۔

عالم: جو دوا وہ دے گئے ہیں، وہ انھیں چکھائی گئی تھی؟

زینت: جی، میں نے بھی چکھی تھی۔ دوا میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔

عالم: یہ احمد نگر ہے بیٹی! شیعہ ریاست بیجاپور اور گولکنڈہ کے قریب۔ دشمنی دوستی میں چُھپ کر آتی ہے۔ زندگی میں یہ ہمیشہ یاد رکھو۔

زینت: آپ کا کہنا صحیح ہے، جہاں پناہ! مگر دوا میں نے خود چکھ کر دیکھی ہے۔

عالم: ہمارے سامنے نہیں چکھی گئی۔ زینت! مگر خیر، کوئی بات نہیں۔ دوا کھائیں گے... مگر ذرا دیر کے لیے آرام پھر وہی تکلیف۔ کیا کریں دوا کھا کر! (زور سے کھانستا ہے)... اچھا لاؤ، کھائیں تمہاری دوا۔ آبِ حیات سے بڑھ کر۔

(عالمگیر ہاتھ بڑھاتا ہے۔ زینت پیالے میں دوا ڈال کر دیتی ہے۔ عالمگیر اسے ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے۔ سوچتے ہوئے ایک دفعہ رکتا ہے، پھر ذرا سی پیتا ہے)۔

عالم: (گلا صاف کر) پی لی تمہاری دوا بیٹی! اس دوا میں ذائقے کے ساتھ ترشی بھی ہے۔ حکومت کا پیالہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

زینت: مگر آپ نے سب ترشی ذائقے میں تبدیل کر لی ہے۔

عالم: نہیں زینت مراٹھوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ہم قرآن پاک کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم مراٹھوں کا نام ونشان مٹانے میں اپنی ساری سلطنت کی بازی لگا دیتے، مگر... مگر اب وہ حوصلہ نہیں رہ گیا۔ کمزوری اور بڑھاپے نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔ (ٹھہر کر) ہمارے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ کاش، ہماری زندگی کے دن ابھی... ختم نہ ہوتے...

زینت: (جوش سے) ابھی آپ بہت دنوں تک سلامت رہیں گے، عالم پناہ!

عالم: (جذباتی ہو کر) آہ! ایک دفعہ پھر کہو زینت! ہم یہ بات پھر سے سننا چاہتے ہیں۔ اوف! اگر ہماری زندگی کے دن ابھی ختم نہ ہوتے! ہم ایک بار پھر شمشیر لے کر میدانِ جنگ میں جاتے، باغیوں سے کہتے... کم بختوں عالمگیر کمزور نہیں ہے۔ اس کی تیغ میں اب بھی چنگاریاں ہیں۔ زانو تہہ کر کے گناہوں کی معافی مانگو، نہیں کافروں! دوزخ میں داخل... ہو...!

زینت: آپ آرام کریں جہاں پناہ! ورنہ آپ کی طبیعت اور بھی خراب ہو جائے گی۔

عالم: اس سے زیادہ اور کیا خراب ہوگی، زینت! جب ہم موت کے دروازے پر کھڑے ہو کر دستک دے رہے ہیں۔ چاہے جب کھل جائے۔ اور عالمگیر کے لیے جلدی ہی کھلے گا، دیر نہیں ہوسکتی۔ موت بھی ڈرتی ہوگی کہ دیر ہو جانے سے عالمگیر کہیں سزا نہ دے۔ (کھانسی) زندگی بھر کی سزا! سزا! (رکتے ہوئے) اباجان...کو...بھی...آں جہانی شاہ جہاں کو...(سوچتا ہے)

زینت: عالم پناہ! تذکرے نہ اٹھائیں۔

عالم: (ابروؤں پر بل ڈال کر) کیوں نہ اٹھائیں؟ زندگی بھر گناہوں کا بوجھ اٹھایا تو مرتے وقت اس کا تذکرہ بھی نہ اٹھائیں؟ مگر زینت! تم نے صدہا بار اپنے دل کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ہم نے گناہ کہاں کیے؟ قرآن پاک کی رو سے، شرع کی رو سے اسلام کا نام دنیا میں بلند کرنے کے لیے... جہاد کے لیے، جو کام ہم نے کیے...کیا وہ گناہ ہے؟ اپنشد پڑھنے والے دارا سے سلطنت چھینی...کیا یہ گناہ ہے؟ نمونہ دربار الٰہی میں کیا مجھ سے گناہ ہوئے؟ عالم گیر...زندہ پیر!...مگر کوئی آواز کانوں میں کہتی ہے کہ عالمگیر! تو نے اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دیا ہے۔ تو نے اسلام کی ہدایتوں کو نہیں سمجھا۔ زینت! تو (تو پر زور) بتلا یہ آواز ٹھیک ہے؟ کیا ہم نے اسلام کے اصولوں کو غلط سمجھا؟

زینت: (سکون سے) آپ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، جہاں پناہ!

عالم: (خلا میں دیکھتے ہوئے) ہزاروں ستنامیوں کو قتل کیا۔ دارا، شجاع، مراد کو تختِ طاؤس کا حق نہیں دیا اور باپ کو سات برس تک...طویل سات برسوں تک...

زینت: مگر عالم پناہ، اگر غور سے دیکھا جائے تو شہنشاہ شاہجہاں کو نظر بند کرنا غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اپنی پیری میں وہ اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹوں کا مزار دیکھتے! کیا انھیں تکلیف نہ ہوتی؟ آپ نے انھیں اس تکلیف سے بچالیا!

عالم: مگر اس تکلیف کے پیدا کرنے کا ذمہ کس کا ہے؟ ہم نے ہی لاہور میں دارا کی قبر بنوائی۔ ہم نے ہی آگرے میں محمد کو بھیج کر اباجان کا محل قید خانے میں تبدیل کرایا...اس داستان کو تم جانتی ہو؟

زینت: جہاں پناہ! مجھ سے وہ دردناک داستان کیوں دُہروانا چاہتے ہیں! آپ آرام کیجیے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

عالم: تو ہم ہی وہ داستان کہیں گے جو ہم نے محمد سے سنی ہے۔ (خلا میں دیکھتے ہوئے) آدھی رات تھی...کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی...دوسری شمع شہنشاہ شاہ جہاں کی آنکھوں میں جھلملا رہی تھی۔ وہ پلنگ پر تصویر سنگ کی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی پتھرائی آنکھیں دور

دکھائی دینے والے تاج محل پر جمی ہوئی تھیں ...ہلکی چاندنی تھی ۔شہنشاہ نے جہاں آرا سے کہا، جہاں آرا، عالمگیر سے پوچھو، وہ ہماری طرح تاج محل کو قید نہیں کرے گا...؟

زینت: (گزارشی لہجے میں) جہاں پناہ!...

عالم: (اسی خوابیدہ انداز میں) بادشاہ کی زبان تالو سے سٹ گئی تھی ...گلا سوکھ رہا تھا۔گہری اور سرد سانس لے کر انھوں نے فرمایا۔ممتاز ہماری بیگم! تاج ہمیں پتھروں سے نہیں اشکوں سے تعمیر کرانا چاہیے تھا!...کاش یہ ممکن ہوسکتا!

زینت: (ہمدردی کے ساتھ) انھیں بہت تکلیف تھی، عالم پناہ! مگر اس وقت یہ سب سوچنا ٹھیک نہیں ہے۔رات زیادہ بیت رہی ہے۔

عالم: (چونک کر تسبیح پھیرتے ہوئے) کیا کہا؟ رات زیادہ بیت رہی ہے۔آج ہمارے لیے بھی شاید وہی موت کی رات ہے، مگر ہمارے سامنے کوئی تاج محل نہیں ہے۔(ٹھہر کر) ہم اس لائق ہیں بھی نہیں زینت! زندگی میں ہم نے کچھ نہیں کیا، صرف لڑائیاں ہی لڑی ہیں۔ انہی میں ہم نے فتح حاصل کی ہے، مگر آج...آج زندگی میں ہمیں شکست ہی ملی...بھاری شکست! ہم نے ابا جان کو قید نہیں کیا، اس آخری وقت میں اپنے چین وسکون کو ہی قید کیا! آج اتنے برسوں کے بعد ابا جان کی چیخنے کی صدا ہمارے کانوں میں آرہی ہے... پیاس سے ان کا حلق سوکھ رہا ہے۔ان کی آواز میں کتنا درد ہے...تم سن رہی ہو؟...نہیں! ان کی حسرت بھری نگاہوں کی ٹکّر سے تاج محل جیسے چور چور ہونے جارہا ہے۔

زینت: (تسلی دینے کے لہجے میں) جہاں پناہ! کہیں کچھ نہیں ہے۔آپ سونے کی کوشش کیجیے۔جو کچھ ہوا اسے بھول...

عالم: (بیچ میں ہی) نہیں بھول سکتے زینت! ہم نے اپنی سلطنت کی عمارت کی بنیاد میں روح دفن کر کے کھڑی کی ہے۔آج روح تڑپ کر کروٹ لینا چاہتی۔وہ چیخ رہی ہے۔تم اس کی آواز بھی نہیں سننا چاہتی؟

زینت: جہاں پناہ! خدا کو یاد کیجیے۔سونے کی کوشش کیجیے۔رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

عالم: زندگی اس سے زیادہ بیت چکی ہے! (اسٹیج کے پردے کی طرف انگلی اٹھا کر) دیکھتی ہو یہ اندھیرا؟ کتنا خوفناک؟ دنیا کو اپنے سیاہ پردے میں لپیٹے ہوئے ہے۔گویا یہ ہماری زندگی ہو! اس میں کبھی صبح نہیں ہوگی زینت! اگر ہوگی بھی تو وہ اس کے کالے سمندر میں ڈوب جائے گی۔اس تاریکی میں آفتاب بھی نمودار ہو تو وہ سیاہ ہو جائے گا! (رک کر) اوہ! کتنا

اندھیرا ہے خدا! ہم نے تیرا نام لے کر سلطنت پر قبضہ کیا، تیرا نام لے کر عورتوں اور بچوں کو قید کیا، وہ سب تیرے بچے! تیرے بندوں پر اعتبار نہیں کیا۔ تیرا نام لے کر...قرآن کی قسم کھا کر مراد.....بھائی مراد سے صلح کی اور پھر...اور پھر...اس کا خون! (کھانسی آتی ہے اور پھر ساکت ہو جاتا ہے)

زینت: (گھبرائی ہوئی آواز میں) جہاں پناہ...! جہاں پناہ! (پھر پکار کر) کریم! کریم! (سپاہی کریم کی آمد۔ وہ ادب سے سلام کرتا ہے)۔

زینت: (حکم دینے کے انداز میں) حکیم صاحب کو فوراً یہاں آنے کی اطلاع کرو۔ بادشاہ سلامت کی طبیعت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ فوراً جاؤ۔ حکیم صاحب امیروں کے دوسرے کمرے میں ہوں گے۔ فوراً۔

کریم: جو حکم (ادب کے ساتھ سلام کر کے جاتا ہے)۔

(زینت کے چہرے پر خوف کے آثار اور واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک پنکھے سے ہوا کرتی ہے۔ عالمگیر ہوش میں آتا ہے۔ دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھول کر زینت کو گھور کر دیکھتا ہے)۔

عالم: (لرزتی ہوئی آواز میں) کون...؟ ابا جان! (آنکھیں پھاڑ کر) تم؟ تم زینت ہو؟ ابا جان کہاں گئے؟ ابھی تو یہاں آئے تھے۔ (سوچتے ہوئے) زرد تھا ان کا چہرہ۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اتنے بڑے شہنشاہ کی آنکھوں میں آنسو؟ انھوں نے ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور کہا۔ شہنشاہ عالمگیر! ہمیں ہمارا بیٹا اورنگ زیب واپس کر دو... بادشاہی لباس میں ہمارا بیٹا کھو گیا ہے۔....اسے ہمیں واپس کر دو...! (کچھ ٹھہر کر) مگر زینت! وہ بیٹا کہاں ہے؟ اس نے تو اپنے ابا جان کو قید کیا ہے۔

(اسی وقت کمرے میں ٹنگا پرندہ اپنے پر پھڑ پھڑا اٹھتا ہے۔ عالمگیر اس کی طرف چونک کر دیکھتا ہے)

اور یہ پرندہ اپنے پر پھیلا کر ہم سے کچھ کہہ رہا ہے؟ کیا کہے گا؟ اسے بھی تو ہم نے سونے کے پنجڑے میں قید کیا ہے! (زینت کی جانب دیکھ کر گزارش کرتا ہے) زینت اس پنجڑے کا دروازہ کھول دو (زینت پنجڑے کا دروازہ کھولتی ہے) اسے نکالو! (زینت پرندہ کو پکڑ کر نکالتی ہے) اڑا دو اسے۔ (زینت اسے کھڑکی سے باہر اڑا دیتی ہے۔ عالمگیر اس کے اڑنے کی سمت میں کچھ دیر دیکھ کر سکون کی سانس لیتا ہے) آ...زا...د (کچھ رک کر) ہم ابا

جان کو بھی اس طرح آزاد نہیں کر سکے۔ ہندستان کے بادشاہ کو اس پرندے کی قسمت بھی نصیب نہیں ہوئی۔

زینت :مگر عالم پناہ! بادشاہ تو نہ جانے کب کے دنیا کی قید سے نکل کر آزاد ہو گئے۔اب کس بات کا ملال ہے۔آپ اپنی طبیعت سنبھالیے۔میں نے حکیم صاحب کو بلوایا ہے۔وہ آتے ہی ہوں گے۔

عالم: (زینت کی بات ان سنی کر کے) پرندے کی قسمت... بادشاہ کی قسمت نہیں ہو سکی!...اس اندھیرے میں اس پرندے کی قسمت جگی ہے۔وہ خوش ہو کر شور کر رہا ہے۔بچپن میں دارا بھی اسی طرح شور کرتا تھا۔(ٹھہر کر) کچھ ویسی ہی آواز آ رہی ہے۔(سنتے ہوئے) وہ دیکھو۔یہ آ رہی ہے۔(رک کر) مگر یہ آواز کیسی ہے! اس خوفناک اندھیرے میں یہ آواز جیسے منہ پھاڑ کر کھانے کو دوڑ رہی ہے۔یہ آئی! زینت، یہ آواز سنتی ہو؟

زینت:(تعجب سے) کیسی آواز؟ کون سی آواز جہاں پناہ؟

عالم: (آنکھیں پھاڑ کر) ارے، اتنے زور کی آواز آ رہی ہے اور تمہیں سنائی نہیں پڑتی؟ یہ دیکھو (سنتے ہوئے) پھر آئی! یہ ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی ہے زینت! (پکار کر) زینت! یہ آواز (چیخ کر) یہ خوفناک...آواز!

زینت :(تسلّی بخش لہجے میں) کوئی آواز نہیں ہے جہاں پناہ! آپ کی طبیعت میں گھبراہٹ ہے اسی وجہ سے ایسا خیال پیدا ہو رہا ہے۔(اعتماد کے ساتھ) کہیں کوئی آواز نہیں ہے۔آپ اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔

عالم: (گھبراہٹ سے کچھ اٹھ کر) نہیں، نہیں، یہ آواز برابر آ رہی ہے کوئی چیخ رہا ہے۔(اشارہ کر کے) یہ دیکھو اندھیرے میں یہ کون جھانک رہا ہے؟ کون؟ (زور سے) کون؟ (پکار کر) سپہ سالار؟

زینت:(پاس آ کر) کوئی نہیں ہے جہاں پناہ! سپہ سالار کی ضرورت نہیں ہے!

عالم: (خوف سے بھرائی ہوئی آواز میں) یہ کھڑکی کے پاس کون ہے؟ (اشارہ کرتے ہوئے) کراہتا، چیختا ہوا! اوہ، اس نے پھر چیخ بھری، ارے دارا!...(کانپتے ہوئے) دارا تم ہو؟ ہم نے تمہارا خون نہیں کیا! ہم نے نہیں کیا، دارا! حسین خاں زبردستی تمہارے کمرے میں گھس آیا۔ہم نے اسے حکم نہیں دیا تھا اور...اور...(کانپ کر) تمہارا سر کہاں ہے دارا؟ تمہارا سر کدھر گیا؟ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔پھر لڑکھڑاتے ہوئے) ہم تلاش کر لائیں گے۔ہم

ابھی تلاش کرلائیں گے۔(ہاتھ پھیلاتے ہوئے)تمہارا اتنا خوبصورت سر!...
(زینت اسے روک کر پھر پلنگ پر لٹادیتی ہے۔عالمگیر بے ہوش ہوجاتا ہے)۔
زینت:(دامن سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے)جہاں پناہ!
(کریم کی آمد)
کریم:(ادب سے سلام کرکے)شہزادی!حکیم صاحب تشریف لائے ہیں۔
زینت:(تیزی سے)فوراً انھیں اندر بھیجو،اسی وقت!
کریم:(سلام کرکے)جوحکم(تیزی سے جاتا ہے)۔
زینت:(لرزتی آواز میں آنکھوں میں آنسو بھر کر)کیا جانتی تھی کہ احمد نگر میں یہ سب ہوگا!یا خدا!
(عالمگیر کو چادر اُڑھاتی ہے)
(حکیم صاحب کی آمد!لمبی داڑھی،کالا چونگا،سر پر عمامہ،سفید پاجامہ اور زری کے جوتے۔ساتھ میں دواؤں کا ایک صندوقچہ،بادشاہ کو ادب سے سلام کرنے کے بعد زینت کو سلام کرتا ہے)۔
زینت:(کانپتی آواز میں)عالم پناہ کو ہوش نہیں ہے،حکیم صاحب!(اٹھ کر حکیم کے پاس آتی ہے)
آج رات کو عالم پناہ کی طبیعت بہت ہی خراب رہی۔جانے انھیں کیا ہوگیا!جاگتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں اور چیخ اٹھتے ہیں!ایک لمحہ انھیں قرار نہیں ہے(رنجیدہ آواز میں)اب آپ ہی میرے ناخدا ہیں۔طبیعت گھبراتی ہے۔جہاں پناہ کو اچھا کردیجیے،جلد اچھا کردیجیے۔
حکیم:جہاں پناہ کو ہوش نہیں ہے!(سنجیدہ اور تسلی بخش لہجے میں)گھبرائیے نہیں گھبرائیے نہیں شہزادی!خدا پر یقین رکھیے۔وہ چاہے گا تو انشاءاللہ بادشاہ سلامت بہت جلد اچھے ہوجائیں گے۔دیکھیے میں دوا دیتا ہوں،بادشاہ سلامت ابھی ہوش میں آئے جاتے ہیں۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔
زینت:(بگڑی ہوئی آواز میں)میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔
حکیم:اطمینان کے ساتھ آپ بادشاہ سلامت کو پنکھا جھلیں۔میں انھیں ہوش میں آنے کی دوا دیتا ہوں۔
(حکیم اپنے صندوقچے میں سے ایک ڈبیا نکالتا ہے۔زینت پنکھا جھلتی ہے)
حکیم:(ڈبی کا ڈھکن کھولتے ہوئے)اب بادشاہ سلامت کی کھانسی کیسی ہے؟
زینت:کھانسی میں بہت آرام ہے پہلے تو وہ ہر بات کہنے میں کھانستے تھے۔آپ کی دوا سے ان کی کھانسی بہت کچھ رُک گئی مگر گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے(پنکھا جھلتی ہے)
حکیم:گھبراہٹ بھی دور ہوجائے گی(عالمگیر کی ناک کے قریب بہت آہستہ سے ڈبی لے جاتا

ہے)ابھی جہاں پناہ کو ہوش آتا ہے۔آپ صبر کریں۔

زینت:ان کی بے چینی دیکھ کر تو میں بالکل ہی گھبرا گئی تھی۔میں نے بڑی مشکل سے اپنے کو قابو میں رکھا۔اگر میں بھی گھبرا جاتی تو پھر ادھر تھا ہی کون؟

حکیم:جہاں پناہ کی خدمت کرنا میرا اوّلین فرض ہے۔

زینت:اسی لیے تو میں نے فوراً آپ کے پاس خبر بھیجی۔

حکیم:میں خبر پاتے ہی حاضر ہوا(عالمگیر پر گہری نظر ڈال کر)دیکھیے بادشاہ سلامت کو ہوش آ رہا ہے۔پنکھا ذرا دھیما کریں۔

(عالمگیر کے لبوں میں جنبش ہوتی ہے،جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔پھر ہلکی انگڑائی لے کر آنکھیں کھولتے ہیں۔زینت اور حکیم کے چہرے پر خوشی کی جھلک)

زینت:(خوشی سے)ہوش آ گیا!ہوش آ گیا!!

حکیم:بادشاہ سلامت کو آداب عرض کرتا ہوں(درباری ڈھنگ سے سلام کرتا ہے)۔

عالم:(دھیمی آواز میں)پا...نی...!

(زینت فوراً صراحی سے عرقِ گلاب نکال کر پیش کرتی ہے)

زینت:جہاں پناہ!یہ پانی...

(عالمگیر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔حکیم اسے اٹھنے میں سہارا دیتا ہے۔عالمگیر پانی پینے کے لیے جھکتا ہے مگر دوسرے ہی لمحہ رُک جاتا ہے)

عالم:(سوالیہ لہجے میں)یہ کون سا پانی ہے؟

زینت:(انکساری سے)وہی عرقِ گلاب ہے جو آپ کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا ہے۔

عالم:(اطمینان سے)لاؤ،(ایک گھونٹ پی کر،گھبرا کر)ہماری تسبیح کہاں ہے؟

زینت:(پلنگ سے تسبیح اٹھا کر)یہ ہے جہاں پناہ!

عالم:(لیتے ہوئے)ہمیشہ میری زندگی کے ساتھ رہنے والی...!(پھر ایک گھونٹ پانی پی کر حکیم صاحب کو گھورتے ہوئے)تم کون...ہو؟(ایک لمحہ بعد جیسے یاد کرتے ہوئے)شاید...حکیم ...صاحب...؟

حکیم:(سلام کرتے ہوئے)جی،جہاں پناہ!

عالم:(بے چارگی کے لہجے میں)ہماری حالت بہت خراب ہے حکیم صاحب!اب شاید ہم نہ بچیں گے(ٹھنڈی سانس لیتا ہے)۔

حکیم : ایسا نہ فرمائیں جہاں پناہ! بخار آپ کا اب دور ہو ہی گیا۔صرف کمزوری اور کھانسی ہے۔کھانسی بھی اب اچھی ہو چلی ہے،اور کمزوری بھی انشاءاللہ دور ہو جائے گی۔

عالم: تو زندگی بھی دور ہو جائے گی حکیم صاحب!اس وقت ہمارے لیے کمزوری اور زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں!ایک دور ہوگی تو دوسری بھی دور ہو جائے گی۔اور عالمگیر کمزور ہو کر زندہ نہیں رہیں گے!

حکیم :(ادب سے)عالم پناہ! آپ بجا فرماتے ہیں(یہ بات وہ عادتاً کہہ دیتا ہے مگر اپنی غلطی محسوس کرنے پر گھبراہٹ سے)مگر اسے صحیح نہیں ماننا چاہیے،عالم پناہ!(یہ سوچ کر کہ اسے یہ بھی نہیں کہنا چاہیے،اور گھبرا کر کہتا ہے)...میں کیا عرض کروں...کچھ جواب نہیں دے سکتا (ہاتھ ملتے ہوئے سر جھکا لیتا ہے)۔

عالم: (سنجیدگی سے)زینت،حکیم صاحب سے کہو کہ وہ ہمیں بے ہوشی کی دوا دیں۔

زینت:(بات بدلنے کے خیال سے)انہی کی دوا سے تو آپ ہوش میں آئے ہیں جہاں پناہ!

عالم: (سنجیدہ،رُکتے ہوئے الفاظ میں)مگر زینت،اس ہوش سے ہماری بے ہوشی اچھی ہے گناہوں کی یاد اب برداشت...(ٹھہر کر،چونک کر،اپنی بات پلٹتے ہوئے)حکیم صاحب،کمزوری کی حالت اب برداشت نہیں ہوتی۔ایسی دوا دیجیے کہ بے ہوشی کا عالم رہے۔(رک کر)آپ کے پاس ۔شراب کو چھوڑ کر۔کوئی ایسی دوا ہے؟

حکیم: جہاں پناہ! آپ کی کمزوری بہت جلد رفع ہو جائے گی۔

عالم: (تیز آواز میں)ہمارے سوال کا جواب دیجیے حکیم صاحب! آپ کے پاس شراب کو چھوڑ کر ایسی کوئی دوا ہے؟

حکیم :(گھبرا کر ہکلاتے ہوئے)جی،ایسی دوائیں تو بہت ہیں عالم پناہ!مگر آپ کو۔اپنے جہاں پناہ کو کیسے دے سکتا ہوں؟ یہ دوائیں آپ کے لیے نہیں ہیں عالم پناہ!

عالم: (آنکھیں پھاڑ کر)عالم پناہ کے لیے نہیں ہیں؟ کون سی دولت ہے جو عالمگیر کے لیے نہیں ہے؟اس وقت بے ہوش ہو جانے کی دوا ہمارے لیے سب سے بڑی دولت ہے!حکیم صاحب،ہم اس وقت وہی چاہتے ہیں!

زینت :(ابروؤں کے اشارے کے ساتھ)حکیم صاحب! آپ کے پاس ایک ایسی دوا بھی تو ہے جس میں ذرا دیر کی بے ہوشی کے بعد تمام کمزوری دور ہو کر طبیعت میں تازگی آتی ہے! (گھور کر دیکھتی ہے)۔

حکیم :(سنبھل کر)ہاں،ہاں،ایک ایسی دوا میرے پاس ہے۔میرے والد صاحب نے مجھے ایک نسخہ دے کر کہا تھا کہ جب سب دوائیں بے کار ثابت ہوں تب اس کا استعمال کیا جائے۔ (ہچکتے ہوئے)میں ابھی اس کا استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

زینت :(عالمگیر سے)اور جہاں پناہ،اس وقت وہ دوا نہ کھائی جائے تو بہتر ہوگا،صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے اور اذان کا وقت نزدیک ہے۔آپ خدا کی عبادت نہ کر سکیں گے۔ابھی وہ دوا رہنے دیں۔

عالم: یہ بات ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی!اچھا ابھی وہ دوا رہنے دیجیے،حکیم صاحب!آپ اذان ہونے کے وقت تک دوسری دوا دے سکتے ہیں۔

حکیم :بہ سروچشم (شہزادی سے)شہزادی آپ مجھے ایک پیالہ عنایت فرمائیں میں کمزوری دور کرنے کی دوا ابھی پیش کروں۔

زینت:(پیالہ اٹھا کر)یہ لیجیے۔

حکیم :(اپنے صندوقچے میں سے ایک دوا نکالتے ہوئے)خدا چاہے گا تو آپ کو فوراً آرام ہوگا۔ستاروں کی نحوست دفعہ ہوگی (پیالہ میں دوا ڈالتے ہوئے)عالم پناہ حمید الدین خان نے تو ستاروں کی نحوست دور کرنے کے لیے چار ہزار روپے کا ایک ہاتھی عالم پناہ پر صدقہ کر دیا ہوگا؟

عالم: (سنجیدہ آواز میں)نہیں جمعرات کو حمید الدین خاں نے نجومیوں کے کہنے کے مطابق صدقہ کرنے کے متعلق ایک درخواست ضرور پیش کی تھی،مگر ہم نے اس درخواست میں یہ بڑھا دیا کہ یہ تو نجوم پرستوں کا رواج ہے۔اس کے بجائے چار ہزار روپے قاضی کو غریب غرباء میں تقسیم کرنے کے لیے دے دیا جائے۔

حکیم: (جوش سے آنکھیں چمکا کر)عالم پناہ نے کیا بات کہی ہے!اب تو ستاروں کی نحوست دور ہونے میں کوئی اندیشہ بھی نہیں رہ گیا اور مجھے بھی یہ کامل یقین ہے کہ یہ عرق آپ کو ایسی طاقت دے گا کہ آپ تندرست ہو کر اپنی رعایا کے درد وغم کو دور کرتے ہوئے سو سال سلامت رہیں گے۔

عالم: (سوچتے ہوئے)سو سال تک!یعنی گیارہ برس اور۔مگر حکیم صاحب ہم گیارہ دن بھی زندہ نہیں رہیں گے۔بیٹوں کو بھی تو بادشاہت کرنے کا موقع ملے۔ہمارے بیٹے!(سوچتا ہوا)معظم... اعظم...کام بخش...

حکیم :(دوا کا پیالہ سامنے کرتے ہوئے)یہ صحیح ہے عالم پناہ مگر مجھے بھی اپنی خدمت کرنے کا

موقع دیں۔ میں نے اپنی حکمت کی بہترین دوا عالم پناہ کے روبرو پیش کی ہے۔

عالم: (زینت سے) اچھا زینت، یہ دوا رکھ لو، اسے ہم نماز کے بعد پئیں گے۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

(زینت دوا کا پیالہ لے لیتی ہے)

حکیم: (سر جھکا کر) جو جہاں پناہ کا حکم۔ مگر ایک گزارش ہے.....

عالم: کیا؟

حکیم: (دست بستہ ہو کر) عالم پناہ کچھ نہ سوچیں، کوئی گفتگو نہ کریں۔ اس وقت آرام کرنا خود ایک مفید دوا ہوگی۔ صبح ہوتے ہی عالم پناہ کی طبیعت اچھی معلوم ہوگی۔

عالم: اچھی بات ہے۔ ہم کچھ نہ سوچیں گے۔ کوئی گفتگو نہ کریں گے۔ مگر ہم اپنے بیٹوں کو خط تو لکھوا سکتے ہیں؟...(سوچ کر) وہی کریں گے حکیم صاحب! اب آپ تشریف لے جائیے۔ ہمیں اپنے بیٹوں کی یاد آ رہی ہے۔

حکیم: جو حکم (ادب کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہوتا ہے)۔

عالم: (سوچتے ہوئے) حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہ سوچیں، کوئی گفتگو نہ کریں۔ صبح ہوتے ہی طبیعت اچھی معلوم ہوگی...مگر زینت، ہم جانتے ہیں کہ ہماری طبیعت اچھی نہیں ہوگی۔ ہم نے اپنی کشتی سمندر میں چھوڑ دی ہے۔ اب ساحل دور ہوتا جا رہا ہے۔

زینت: طبیعت میں بے چینی کے سبب سے عالم پناہ ایسا فرما رہے ہیں۔ اب آپ کی طبیعت اچھی ہونے جا رہی ہے، حکیم صاحب کی دوا بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ دیکھیے آپ کی کھانسی کو کتنا فائدہ پہنچا ہے۔

عالم: (زور دے کر) تم نہیں سمجھیں زینت! جس طرح صبح ہونے سے پہلے رات اور بھی سنسان اور خاموش ہو جاتی ہے، اسی طرح موت سے پہلے ہماری تمام شکایتوں کا شور خاموش ہو گیا ہے، اب ہمارا آخری وقت قریب ہے۔

زینت: (آنکھوں میں اشک بھر کے) ایسا نہ کہیں عالم پناہ!

عالم: (گہری سانس لے کر) اور زینت، ہماری بیٹی! آج اس آخری وقت میں ہمارے نزدیک ہمارا ایک بھی بیٹا نہیں ہے۔ ایسے باپ کو تم کیا کہو گی جس نے بادشاہت میں خلل پڑنے کے وہم سے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سزا دے کر قید خانے میں رکھا؟ اپنے نزدیک بھی نہیں آنے دیا (سوچتے ہوئے) ہمارے قیدی بچوں، تم بدقسمت ہو کہ عالمگیر تمہارا باپ ہے۔ تم نے

اور کوئی گناہ نہیں کیا۔تم لوگوں کا صرف یہی گناہ ہے کہ تم اورنگ زیب کے بیٹے ہو۔آج تمہارا باپ موت کے دروازے پر پہنچ کر تمھیں یاد کر رہا ہے!معظم...اعظم...کام بخش...!

زینت: (جذباتی ہوکر) جہاں پناہ، میں ان لوگوں تک آپ کے یہ محبت بھرے الفاظ ضرور پہنچا دوں گی۔

عالم: (اطمینان پاکر) ہم اپنی قبر سے بھی تمھیں دعائیں دیں گے، بیٹی، ہم خود اپنے بچوں کو خط لکھانا چاہتے ہیں۔اس آخری وقت میں ہماری خواہش پوری ہونے دو۔کاتب کو بلاؤ۔

(ٹھنڈی سانس لیتا ہے)

زینت: آپ کا حکم پورا ہوگا ابا جان! (پکار کر) کریم! (کریم حاضر ہوتا ہے اور سلام بجالاتا ہے)

زینت: شاہی کاتب کو اسی وقت حاضر کیا جائے!۔

کریم: جو حکم (سلام کر کے تیزی سے جاتا ہے)

عالم: (دھیمی آواز میں) ہم خوش ہوئے بیٹی۔ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔آج تک ہم نے شاید کسی کی خواہش پوری نہیں کی، ہمیں کوئی حق نہیں کہ کسی سے بھی اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے کہیں مگر تم نے ہماری خواہش پوری کی۔بہت دنوں تک جیو۔

زینت: جہاں پناہ! شہزادی جہاں آرا نے اپنے ابا جان کی قید میں سات برس تک خدمت کی تو کیا میں آپ کی خدمت کچھ دنوں تک بھی نہ کروں؟

عالم: ہمیں بھی قید میں سمجھو بیٹی! ہمارے گناہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ضمیر کی زنجیروں نے بھی ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ لیے ہیں! ہم اب اس دنیا کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔جس سلطنت کو خون سے سینچ سینچ کر ہم نے اتنا بڑا کیا ہے، اسے اگر اب اشکوں سے بھی سینچنا چاہیں تو ہمیں ایک پوری زندگی چاہیے۔وہ ہمارے پاس کہاں ہے؟

(گلا سوکھ جاتا ہے۔ٹھہر کر) بیٹی، پانی... پانی...گلا سوکھ رہا ہے۔

(زینت پیالہ میں عرقِ گلاب لے کر پلاتی ہے)

زینت: آپ تھک گئے ہیں جہاں پناہ۔ساری رات آپ کو بہت بے چینی رہی۔

عالم: اس بے چینی کے ختم ہونے کا وقت بھی آرہا ہے (کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھو یہ تارے ڈھل رہے ہیں۔رات بھر انھوں نے روشنی کی اور اب وہ اپنی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ہم بھی گن رہے ہیں مگر ہم نے عمر بھر اندھیرا ہی پھیلایا۔اجالے کی کوئی کرن نہیں رہی۔ہم موت کو ہی اجالا دے سکے تو اپنے کو خوش قسمت سمجھیں گے۔(خاموشی۔یک

بارگی چونک کر) صبح ہوگئی کیا؟ (کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے)۔

زینت: (اسی طرف دیکھتی ہوئی) ہاں جہاں پناہ! آسمان پر سفیدی چھانے لگی ہے۔

عالم: (گہری سانس لے کر) خدا کی عبادت کا وقت آرہا ہے۔ (تسبیح پھیرتا ہے) زینت ہم نے زندگی بھر عبادت کا ڈھنڈھورا پیٹا، مگر خدا کے پاس تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر پہنچ پاتے تو چلتے وقت اتنے گناہوں کا بوجھ ہمارے سر پر نہ ہوتا۔ چلنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آج جمعہ ہے۔ ہم نے زندگی بھر عبادت کر کے یہی خواہش کی کہ جمعہ ہمارا آخری دن ہو (بیقرار ہوکر) کاتب ابھی نہیں آیا؟

زینت: آرہا ہوگا جہاں پناہ! کریم بخش اسے فوراً ہی لے کر حاضر ہوگا۔

عالم: (سرد آہ بھر کر) زینت، جب ہم پیدا ہوئے تھے ہمارے چاروں طرف ہزاروں لوگ تھے مگر... اس وقت ہم تنہا جارہے ہیں۔ ہم اس دنیا میں آئے ہی کیوں؟ ہم سے کسی کی بھلائی نہ ہوسکی۔ ہم وطن اور رعیت دونوں کے گناہ اپنے سر پر لیے جارہے ہیں۔

زینت: عالم پناہ! آپ نے تو وطن اور رعیت کی بھلائی کی ہے، اور!

عالم: (بیچ میں ہی روک کر) اس آخری وقت میں ایسی بات مت کہو زینت! یہ باتیں بہت بار سنی ہیں مگر اب ان باتوں سے روح کانپتی ہے۔ دل ڈوبتا ہے۔ کاش یہ باتیں سچ ہوتیں! (گہری سانس بھر کر)۔

زینت: نہیں عالم پناہ! خاندانِ تیمور میں آپ سے بڑھ کر عدل کرنے والا کوئی نہیں ہوا۔

عالم: اور اس عدل میں ہم نے اپنی مراد پوری کی!... مراد (مراد لفظ سے مراد بخش کی یاد آجانے پر) اور ہمارے مراد بخش نے ساموگڑھ کی جنگ میں ہمارے کہنے پر دارا سے لوہا لیا۔ کتنی حیرت انگیز جنگ تھی وہ! (سوچتے ہوئے) راجہ رام سنگھ نے تلوار چلایا کہ ہم مع ہاتھی کے زمین دوز ہوجاتے مگر مراد بخش نے اپنی سپر پر تلوار روک کر، راجہ رام سنگھ پر ایسا وار کیا کہ وہ ہاتھی کے پیروں پر آگرا۔ وہ خون سے لت پت ہوکر زمین پر پھیل گیا، اور بس، اس سب کا بدلا مراد بخش کو کیا ملا! اوہ پا... نی...

(زینت پھر پانی پلاتی ہے)

زینت: حضور عالی! آپ سے دست بستہ عرض ہے کہ اب آپ کچھ نہ فرمائیں ایسی باتیں کر کے آپ اپنی حالت اور خراب کر لیتے ہیں۔

عالم: (عجلت سے) اس وقت ہمیں مت روکو زینت النسا! ہمیں مت روکو۔ ہم کہیں گے ضرور کہیں

گے۔بجھنے سے پہلے شمع کی لَو بھڑک اٹھتی ہے۔ہماری یادداشت بھی تازہ ہورہی ہے۔ایک ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آرہی ہے ہم ہاتھی پر بیٹھ کر سپرگاہ جارہے ہیں۔آگے پیچھے ہندوؤں کا بے شمار مجمع ہے۔وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں عالم پناہ، جزیہ معاف کردیجیے! مگر ہم معاف کیسے کر سکتے ہیں؟ دکن کی جنگوں کا خرچ کہاں سے آئے گا؟ ہم کہتے ہیں ...تم کافر ہو! جزیہ نہیں ہٹے گا! وہ لوگ ہمارے راستے پر لیٹ جاتے ہیں۔ہمارا ہاتھی آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ہم غصے میں آکر پیلوان کو حکم دیتے ہیں۔ان کم بختوں پر ہاتھی چلا دو! ہاتھی آگے بڑھتا ہے اور سیکڑوں چیخیں ہمارے کان میں پڑتی ہیں!...ہم ہنس کر کہتے ہیں۔ کافروں تمہاری یہی سزا ہے! جزیہ معاف نہیں ہوسکتا...نہیں ہوسکتا!...

زینت: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) عالم پناہ!

عالم: (اسی لہجے میں) آج وہ ہاتھی ہمارے سامنے جھوم رہا ہے۔معلوم ہوتا ہے وہ ہمارے کلیجے کو چور چور کرتے ہوئے جارہا ہے۔زینت! ہمارا کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوا جارہا ہے...اس کی دوا تمہارے حکیم صاحب کے پاس نہیں ہے!

زینت: (دردبھری آواز میں) عالم پناہ، آپ یہ دوا پی لیجیے۔اس دوا سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا (دوا کا پیالہ آگے بڑھاتی ہے)۔

عالم: (بھاری سانس لے کر) جس نے ساری زندگی خون کا جام پیا ہے، اسے دوا کا جام کیا فائدہ کرے گا؟ اسے پھینک دو زینت، اس کھڑکی کی راہ پھینک دو!

زینت: عالم پناہ! یہ دوا...(ہچکتی ہے)۔

عالم: (تیز آواز میں) زینت! ہم اب بھی ہندستان کے بادشاہ ہیں۔ہمارے حکم کی شمشیر اب بھی تیز ہے۔پھینکو وہ دوا!

(زینت کھڑکی کی راہ سے وہ دوا پھینک دیتی ہے)۔

عالم: (اطمینان سے) ہم خوش ہوئے (ٹھہر کر) سوچو جو دوا حکیم نے نہیں چکھی وہ دوا ہمارے کام کی نہیں ہے۔احمد نگر کا حکیم آگرے اور دہلی کا حکیم نہیں ہے!

زینت: تو جہاں پناہ! وہ دوا میں چکھ لیتی!

عالم: زینت، زندگی بھر ہم نے اپنے ہی مکان میں آگ لگائی ہے، مرتے وقت اپنی بیٹی کو بھی موت کا جام چکھنے دیں! کیا ہم حکیم کو دوا چکھنے کا حکم نہیں دے سکتے تھے؟ مگر اب دوا پر ہمارا یقین نہیں ہے زینت! دعا پر یقین ہے۔ہمارے لیے دعا کرو...ہمارے لیے دعا کرو!...

زینت: (ہاتھ باندھ کر اوپر دیکھتی ہوئی) جہاں پناہ سلامت رہیں... جہاں پناہ سلامت رہیں... آ... مین... (آنکھیں بند کر لیتی ہے)۔

(کریم کی آمد)

کریم: (سلام کر کے) شہزادی، کاتب حاضر ہے۔

عالم: (چونک کر خوشی کے لہجے میں) کیا کاتب آ گیا؟ آ گیا؟ اسی وقت اسے ہمارے روبرو حاضر کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

کریم: (سلام کر کے) جو حکم۔ (تیزی سے جاتا ہے)

عالم: (اطمینان کی سانس لے کر) کاتب آ گیا بیٹی! کاش، یہ ہماری تمام زندگی کی داستان جلی حروف میں درج کرتا! ہمارے بیٹوں کے لیے یہ بہت بڑی نصیحت ہوتی! عالمگیر کے آخری وقت میں سچی زندگی پیدا ہوتی! (تسبیح پھیر کر کلمہ پڑھتا ہے) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ.....

زینت: (آنکھوں میں اشک بھر کر) ابا جان! (گلا رُندھ جاتا ہے)۔

عالم: رومت بیٹی! ہم خوش ہیں کہ تم ہمارے پاس ہو۔ آخری وقت میں اپنی بیٹی کی آواز سے ہماری قبر میں پھول بچھ جائیں گے۔ اس کے اشکوں کے قطروں سے ہمارے گناہ دھل جائیں گے۔ ہماری بیٹی زینت! (زینت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے)۔

(کاتب کی آمد۔ ڈھیلی ڈھالی عبا، کمر میں کمر بند، سر پر صافہ، سفید پاجامہ، کامدار جوتا، وہ آ کر شاہی سلام کرتا ہے)۔

عالم: (جلدی سے) کاتب، تم آ گئے، ہم اپنے بیٹوں کو خط لکھانا چاہتے ہیں۔ جلد لکھو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ لکھنا شروع کرو۔ (آنکھیں بند کر لیتا ہے)۔

کاتب: (سر جھکا کر) جی، ارشاد!

(کاتب لکھنے کے لیے موافق انداز میں بیٹھتا۔ کچھ دیر تک سناٹا رہتا ہے۔ پھر عالمگیر دھیمے اور رنجیدہ لہجے میں بولتا ہے۔ کاتب لکھتا جا رہا ہے)۔

عالم: (دھیرے۔ دھیرے) سلام علیکم... اعظم، ہمارے بیٹے! ہم جا رہے ہیں... ہم زندگی میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے، اپنے گناہوں کا کارواں لیے جا رہے ہیں۔ تم اخوت، امن واعتماد کا خیال رکھنا... یہ دنیا ہیچ ہے۔ ہماری آنکھوں نے خدا کا نور نہیں دیکھا... جسم سے گرمی نکل گئی ہے اب کوئلے کا ڈھیر باقی ہے... ہاتھ پیر سوکھے درخت کی شاخوں کی طرح سخت ہو رہے ہیں اور دل پر مایوسی کی چٹان رکھی ہوئی ہے... خدا سے دور ہوں... اور دل میں کوئی

سکون نہیں ہے...خدا کی رحمت پر ہمارا پورا یقین ہے۔مگر ہم اپنے گناہوں کا بوجھ کہاں لے جائیں! اب ہم نے سمندر میں اپنی کشتی ڈال دی ہے...خدا...حافظ...!

زینت: (آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے) اباجان!

عالم: (آنکھیں بند کیے ہوئے) کام بخش، ہمارے بیٹے!...

زینت: (کاتب کی طرف اشارہ کرکے) لکھو!۔(کاتب لکھتا ہے)۔

عالم: ہم تنہا جا رہے ہیں...تم بے سہارا ہو، اس کا ہمیں ملال ہے!...مگر اس سے کیا فائدہ؟...جو سزائیں ہم نے دی ہیں...جو گناہ ہم نے کیے ہیں...جو ناانصافیاں ہم نے کی ہیں...ان سب کا انجام ہم اپنے آغوش میں لیے ہیں۔ہم تمھیں خدا پر چھوڑتے ہیں۔اپنی ماں اودے پوری کو تکلیف مت دینا!...میں رخصت ہوتا ہوں۔الوداع...!(کچھ وقت تک خاموشی رہتی ہے)

زینت: (دردبھری آواز میں) اباجان، آپ ایسا خط کیوں لکھوا رہے ہیں؟

عالم: (زینت کی بات کا خیال نہ کرکے) زینت! میری بیٹی! اس زندگی کے چراغ میں اب تیل باقی نہیں رہا!...اس خاک کے پتلے کو کفن اور تابوت کی زیبائش کی ضرورت نہیں ہے!...اس بدنصیب کو یوں ہی زمین میں دفن کر دینا...اس پشت خاص کو پہلی ہی منزل پر سپردِ خاک کر دیا جائے...ہمیں خوشی ہوگی اگر ہماری قبر پر قدرتی سبز ململ کی چادر بچھی ہوگی۔(کچھ دیر ٹھہر کر) آں جہانی! ہمارے گناہوں کو بخش دیجیے!...دارا!...شجاع!...مراد...!

(اسی وقت باہر اللہ اکبر کی اذان ہوتی ہے۔عالمگیر غور سے سنتا ہے۔اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوتی ہے۔پھر جھٹکے کے ساتھ سر اٹھا کر اذان کی سمت اسٹیج کے پردے کی طرف دیکھتا ہے)۔

عالم: (تسبیح پھیرتے ہوئے پردے کی طرف دیکھ کر رکتے ہوئے لیکن واضح الفاظ میں) اللہ...او...اک...

(اکبر کا آخری حصہ 'بر' ہونٹوں میں ہی رہ جاتا ہے اور تکیے پر عالمگیر کا سر جھٹکے سے گر پڑتا ہے)

زینت: (تیزی سے عالمگیر کے سر کے قریب جا کر غمگین آواز میں) عالم پناہ!...اباجان...!

(کوئی جواب نہیں ملتا۔باہر اذان ہوتی رہتی ہے۔زینت اپنے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی عالمگیر کا چہرہ سرہانے پڑے ہوئے ریشمی کپڑے سے ڈھانپ دیتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

چودھری لیاقت علی

قافلہ ساتھ اور سفر تنہا

(سید محمد اشرف کے تازہ شاہکار ''آخری سواریاں'' کا ایک جائزہ)

کچھ سفر بے حد عجیب ہوتے ہیں اپنی ذات کی گہرائیوں میں ہی کہیں شروع ہوتے ہیں اور وہیں کسی گرداب میں مسلسل جاری رہتے ہیں۔ بہت لوگ ملتے ہیں، ہم سفر بھی ملتے ہیں قافلے بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر یہ سفر انسان تنہا ہی طے کرتا ہے۔ اب پتا نہیں یہ سفر خود کی تلاش کا ہے، آگہی کا، ادراک کا، کسی بہت پرانی یاد کا۔ نہ جانے کس کس چیز کا سفر ہے جو طے کرتے ہوئے پاؤں تو کیا روح بھی چھلنی ہو جاتی ہے۔ سفر کے نشان صرف تلوؤں پر نہیں بلکہ روح پر محسوس ہوتے ہیں کچھ سفر ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا ہی سفر کچھ دن قبل ہی طے کیا گیا ہے۔

بہت عرصہ ہوا یقین اور بے یقینی کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے ایک مہربان دوست عزیز نبیل نے سید محمد اشرف صاحب کی ایک تحریر سے متعارف کروایا۔ اشرف صاحب کا مضمون تھا عرفان صدیقی صاحب کی حیات اور شعری خدمات پر۔ مضمون نے گویا اپنے بازو پھیلائے اور مجھے کچھ اس طرح گرفت میں لیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ گرفت ایک حصار میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ نمبردار کا نیلا پڑھنے کے بعد تو سید محمد اشرف صاحب سے گویا ایک عقیدت سی ہوگئی۔ یہ تحریر پڑھنے کے بعد بڑے بڑے نامی چراغ بجھے بجھے سے لگنے لگے۔ اور پھر مکرمی عزیز نبیل کے توسط سے ہی سید محمد اشرف صاحب کا تازہ ترین شاہکار ''آخری سواریاں'' پڑھنے کو ملا۔

ناول پڑھ کر جہاں سید محمد اشرف کے قلم کی قوت کا احساس ہوا وہیں دل سے بہت دعائیں نکلیں عزیز نبیل کے لیے جنھوں نے ایسی کتاب سے متعارف کروادیا جو شاید میں اگر نہ پڑھتا تو زندگی میں بے یقینی مزید بڑھ جاتی۔ محسن نقوی کا ایک قطعہ یاد آیا کہ:

کتنا چپ چاپ ہے ماحول میری بستی کا
ماتمی خانہ بدوشوں کے بسیروں جیسا
کیا کہیں اب کے عجیب عشق ہوا ہے محسن
سرد شاموں کی طرح گرم سویروں جیسا

تو ایسی ہی ایک گرم سویر میں ''آخری سواریاں'' مجھ تک پہنچی اور میں وقت ضائع کیے بغیر کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ پہلے تو اُس کے ننھیالی شہر چلا گیا۔ پھر اُس کے ساتھ ٹرین میں سفر کر کے اُس کے آبائی علاقے میں آ گیا۔ پھر اُس کے ساتھ سمے بِتاتے میں نے ایک ناتمام روز نامچہ پڑھا بلکہ محسوس کی اُسی شدت کے ساتھ جو ہیرو خود محسوس کرتا ہوا عطر مجموعہ کی خوشبو اپنے ارد گرد محسوس کی۔ ایک وداع ہوتی ہوئی دلہن کا سفر دیکھا۔ نمازِ استسقاء کا مجمع دیکھا۔ تیمور کے مقبرے کو دیکھنے کے لیے وسطی ایشیائی ریاستوں کا سفر کیا۔ تیمور سے بہ نفسِ نفیس ملاقات کی۔ بہادر شاہ ظفر کا رنگون کا سفر دیکھا۔ اُس کے دسترخوان کے لذیذ کھانے چکھے۔ پھر ہیرو کے ساتھ ایک سفید دھند میں گم ہوتی ایک ثقافت دیکھی جو آخری سواریاں بن کر ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ آپ کو برسوں سے اپنی من پسند رہائش گاہوں سے نکال کر اپنے ساتھ بہالے جانا کہ آپ بھی اُمراؤ جان ادا کی طرح آوارگی میں زمانوں کی سیر کریں۔ یہ ہے اختصاص سید محمد اشرف کے طویل بیانیے کا جو ابتدا سے ہی آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور لکھے گئے الفاظ مجھے گارشیا مارکیز کے ایک واقعے کی یاد دلاتے ہیں۔ گارشیا مارکیز جب بارہ برس کا تھا تو سڑک پر بے خبر جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ایک سائیکل سوار اُس پر چڑھ جائے، پاس کھڑا پادری چلایا Watch Out وہ سائیکل سوار زمین پر گر گیا

Did you see the power of the World?

مارکیز کے بقول اُس دن میں نے لفظ کی قوت کے بارے میں جان لیا۔ سید محمد اشرف نے بھی اِس قوت سے کام لے کر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں جو اِسی طرح بہت سے سائیکل سواروں کو اپنی سواری سے گرا دیتی ہیں۔

ناول ایک بے حد مشکل صنف ہے۔ شروع سے آخر تک قاری کو مشغول رکھنا ایک بے حد

مشکل کام ہے۔افسانہ چوں کہ کم پھیلاؤ رکھتا ہے؛اس میں قاری کی دل چسپی برقرار رکھنا نسبتاً آسان ہے مگر ناول ایک طویل بیانیہ ہے، کم کم لوگ ہی اس آزمائش پر پورے اُترتے ہیں۔سید محمد اشرف چابکدستی سے ابتدا سے اخیر تک قاری کی توجہ کسی اور طرف ہٹنے نہیں دیتے۔آخر کیوں نہ ہو اُن کی تحریر میں اثر۔اُن کا تعلق ایک ایسے مردم خیز علاقے سے ہے جس نے برصغیر کو بہت اہم ادیب اور شاعر دیے۔مارہرہ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے جناب محمد اشرف کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے ہے کہ علم وادب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔اُن کے جد امجد سید آل عبا قادری جو حضرت آوارہ کے قلمی نام سے لکھتے تھے؛ کی تحریریں اپنے وقت کے کئی اہم رسائل میں شامل ہوتی تھیں۔زیرِ نظر کتاب ''آخری سواریاں'' انہی حضرت آوارہ کے نام معنون ہے۔سید محمد اشرف کے پھوپھا جنھیں دنیا عرفان صدیقی کے نام سے جانتی ہے میری رائے میں بھارت کے وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے غزل میں روایت اور جدت کو اس خوبی سے پرویا ہے کہ اُن جیسا شاعر مجھے کم از کم بھارت میں تو نظر نہیں آتا۔سید محمد اشرف کو عرفان صاحب کا قرب بھی حاصل رہا جس سے گویا اُن کی صلاحیتوں کو مزید مہمیز ملی۔

سب سے پہلے کتاب کا ظاہری حسن، سادہ مگر پُر وقار سرورق، خوب صورت طباعت اور کتاب کے سرورق کا عکس لیے ایک چھوٹا سا کارڈ جو کتاب میں بطور نشانی (Book Mark) رکھنے کے کام آتا ہے، کتاب کے ظاہری حسن کو پُر کشش بناتے ہیں۔ایسے دور میں جب ہر چیز کمپیوٹر کے گرد گھومتی ہے، اپنی کتاب میں خطاطی کا استعمال مصنف کے ذوقِ سلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بقول سعود عثمانی کمپیوٹر سب کچھ کر سکتا ہے مگر تحریر میں جذبات نہیں ڈال سکتا کہ جس طرح ایک خطاط الفاظ میں جان ڈال دیتا ہے۔کتاب کے بالکل آغاز میں درج میر کے شعر سے جس کیفیت کا آغاز ہوتا ہے وہ آخری سطر تک ایک گونہ اُنسیت میں بدل جاتی ہے۔شعر اس قدر خوب صورت ہے کہ بن لکھے بہ بنے:

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ اُدھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غُبار میں

'آخری سواریاں' کسی روز نامچے، کسی داستان گو کے قصے، مختلف افسانوں کے مجموعے، کسی آپ بیتی کے بین بین ایک ایسی تحریر ہے جو کسی بھی موڑ پر قاری کی دل چسپی کم نہیں ہونے دیتی۔ میں اسے ناول کہوں، ایک روداد کہوں، ایک نوحہ کہوں، شہرِ آشوب کہوں، ایک دفن شدہ تہذیب کی بازیافت کہوں، ایک تاریخی دستاویز کہوں، کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ایک سفر کے روز نامچے اور بٹوے کے

ذکر سے شروع ہونے والی داستان بیسویں صدی کے آغاز پر ختم ہونے والی تہذیب وثقافت کا شہرِ آشوب بن جاتی ہے۔ یہ مکمل داستان بہت سی کہانیوں میں منقسم ہے جو سب کی سب ایک دوسرے سے منسلک نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا اَن دیکھا ربط بناتی ہیں جس میں قاری ایک صفحے کے اختتام پر فوراً اگلا صفحہ شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ناول ایک بے حد مشکل صنف ہے۔ اس طویل بیانیے میں بہت سی کہانیوں کو اس طرح پرونا کہ سب مل کر ایک ہی اکائی تشکیل دیں جناب سید اشرف کا ہی خاصہ ہے۔

ناول کی پہلی کہانی ایک بے حد منفرد تعلق کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ انتہائی چھوٹی عمر یعنی صرف سات برس کی عمر میں مرکزی کردار کا اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننھیالی شہر جانا اور پھر پڑوس میں رہنے والی تین لڑکیاں، ایک کنواں، ایک مینا اور ایسی کتنی ہی جزئیات اپنی متعلقہ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ غیر محسوس طور پر قاری کی توجہ حاصل کرتی ہیں۔ خاص طور پر ایک ایسا واقعہ جس میں وہ بچہ ایک مینا کو پکڑ کر اسے رنگ دیتا ہے۔ پھر متذکرہ بالا تین پڑوسی بچیوں میں سے سب سے بڑی لڑکی اُن کے ہاں بطور ملازمہ آ جاتی ہے۔ شہر والے گھر کا نقشہ ہو یا اُس بچے کے والدین کی آپس کی بات چیت ہر بیان اتنا دل چسپ ہے کہ بارہا ہونٹوں پر ایک دبی دبی سی مسکان آ جاتی ہے، خصوصاً جب کوئی اہم بات کرتے ہوئے اُسے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ رشتہ بڑا عجیب ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ شاید اِسے محبت ہوگئی تھی مگر ذہن اِسے تسلیم نہیں کرتا کہ لڑکے کی عمر صرف دس برس تھی۔ تو پھر یقیناً یہ ایک اُنسیت کا رشتہ تھا جو آپ ایک طویل عرصہ اپنے ساتھ رہنے والوں سے محسوس کرتے ہیں۔ جب آپ کے پیارے آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں تو بہت دکھ محسوس ہوتا ہے۔ اِسی دکھ کا بیان سید اشرف کے قلم سے سیدھا دل میں جا اُترتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسی تحریریں پسند ہیں جس میں اپنی مٹی سے جڑے مناظر پیش کیے گئے ہوں۔ آخری سواریاں میں اپنی مٹی اور اپنی تہذیب سے محبت جس طرح سامنے آئی وہ ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہے۔ ناول میں شامل بہت سی کہانیوں میں ایک کہانی ایک نماز کی بھی ہے۔ جی ہاں نمازِ استسقاء جس میں کیا مسلمان، کیا ہندو کیا جانور سب کے سب شریک ہوتے تھے۔ بہت دور سے آنے والے پرندے بھی سب مل کر بارش کی دعا کرتے ہیں کہ بارش ہو اور خشک سالی کا خاتمہ ہو۔ ایک کہانی میں عطر مجموعہ میں شامل خوشبوؤں کا بیان ہے تو ایک کہانی ہمیں ایک ایسے بوڑھے سے ملواتی ہے جو ہمیں دانش مندوں اور دانشوروں میں فرق بتلاتی ہے۔ ایک بوڑھا شخص کمالِ دانش مندی سے ایک چوری کا سراغ لگاتا ہے۔ آج ہمارے پاس دانش ور تو بہت ہیں مگر دانش مند جانے کہاں چلے گئے۔

تین کہانیاں بے حد اہم ہیں۔ان کی طرف مصنف نے ابتدا ہی میں اِشارہ کر دیا ہے۔پہلی اہم داستان مرکزی کردار کے ایک بزرگ کا سفر ہے جوانہوں نے وسطی ایشیائی ریاستوں میں تیمور کے مزار پر حاضری کے لیے کیا۔یہ کہانی ایک مکمل سفرنامہ ہے جو کہیں الگ بھی چھپ جائے تو بے انتہا دل چسپ ہو۔اِن ریاستوں کا احوال اور پھر افسانوی انداز میں تیمور کا اپنے مقبرے پر بزرگ سے گفتگو کرنا اور اپنی نیام کا ایک ٹکڑا وہاں دانستہ یا نا دانستہ طور پر چھوڑ جانا۔اِسی سفر میں سفید ریچھوں کے دیس میں گھری ایک خاتون کا بیان کہ جو اِن بزرگ سے اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے درخواست کرتی ہے مگر معاشرتی دباؤ اور مجبوریوں کے شکار کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی۔اگلی کہانی دل کو بہت دکھی کر دیتی ہے۔یہ داستان ہے آخری تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے سفر کی جس کی روداد سینہ بہ سینہ مصنف تک پہنچی۔یہ صرف بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے سفر کی منظر کشی نہیں بلکہ ایک ثقافت اور ایک تہذیب کے خاتمے کا سفر تھا جو ہمارے ذہنوں میں بہت جلد مٹ گیا اور ساتھ ہی یہ تہذیب بھی قصۂ پارینہ بن گئی۔تیسری اور آخری داستان اِسی تاجدار کے دسترخوان کی منظر نگاری ہے۔مگر ساتھ ہی ایک اور منظر کہ بادشاہ انگریزوں کے سامنے پیش ہے اور اُس کے ہاتھوں کے اشارے اُس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے پا رہے۔کتاب کا آخری حصہ پوری کتاب کو سمیٹتا ہے۔اوراس طرح تمام منقسم ہوتی کہانیاں سب مل کر ایک ہی دفعہ مکمل ہو جاتی ہیں۔اب وہ مقام آ چکا ہے جہاں پر کتاب سے اقتباس لیے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔یہ اقتباس ہیرو اور اس کی بیوی کے درمیان ایک مکالمے سے لیا گیا ہے جس میں وہ نہایت تلخ طریقے سے آج کی نسل کا المیہ بیان کرتی ہیں:

> ''ہوا کا ایک جھونکا آیا اور سڑک پر اخباروں کے ٹکڑے اُڑنے لگے۔ہم دونوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔بالکل قریب اُڑتے اخباروں کو بہت غور سے دیکھا۔اُف!
>
> ہمارے بچے ہم سے کس زبان میں باتیں کرتے ہیں کیا آپ کے والد اور امّاں زندہ ہوتے تو سمجھ پاتے۔
>
> یہ ملٹی پل چوائس کیا ہوتا ہے؟ وہ ہذیانی انداز میں بولیں:
>
> میں جانتی ہوں کہ آپ اس کا جواب بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب زندگی کا کارواں آگے بڑھتا ہے تو بہت سی فرسودہ چیزیں پیچھے چھوٹ جاتی ہیں اور بہت ساری مفید اور ضروری چیزیں زندگی میں شامل

ہو جاتی ہیں لیکن یہ لفظ آپ کو آپ کے والدین اور بچوں سے بیک وقت نہیں جوڑ سکتا۔ آپ اسیر بھی ہیں اور دولخت بھی۔ ہمارا وجود کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ ہماری پیڑھی کے لوگ اپنے والدین سے بھی ڈرتے ہیں اور اپنے بچوں سے بھی۔ ہم اوپر اور نیچے دونوں طرف سے کٹ گئے ہیں اور بدن لہولہان ہیں۔ ایسا صرف ہماری پیڑھی کے ساتھ ہوا ہے۔ آپ کبھی اس پر بھی غور کرتے۔ کیا اس سے پہلے ایسا ہوا ہے''۔

معلوم نہیں ہر ادبی شاہکار کا افسردگی کے ساتھ کیوں اتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ گارشیا کی تحاریر ہوں، دوستوسکی ہو، ڈوما ہو یا کوہیلو، شمس الرحمٰن فاروقی ہوں یا منشا یاد۔ قرۃ العین حیدر ہوں یا عبداللہ حسین، ہر ادیب اداس کر دیتا ہے۔ آخری سواریاں بھی ایک بے حد اُداس کر دینے والا ناول ہے مگر اِس اداسی میں کوئی نا امیدی نہیں چھپی بلکہ ایک نوحہ ہے انیسویں صدی کے اواخر میں مٹتی تہذیب کا، اُس بادشاہ کے غیر آرام دہ سفر کا جس کے قلعے میں جا کر سب آسودہ ہو جایا کرتے تھے۔ اُسی تاجدار کے دسترخوان کا احوال جس پر گئی گزری حالت میں بھی ان گنت کھانے ہوتے تھے اور پھر ایسی حالت کا بیان کہ جب بھوک کے مارے اُس بادشاہ کے ہاتھ اُس کے الفاظ کا ساتھ نہ دے پا رہے ہوں۔ ایک ایسے سفر کی روداد جس میں تیمور خود آ کر اپنی داستان بیان کرتا ہے اور اپنی نیام کے چمڑے کا ایک ٹکڑا بطور نشانی چھوڑ جاتا ہے۔ ایک نامکمل روزنامچہ اور ایک چمڑے کا ٹکڑا۔ بہت سی نسلوں کی اداسی اس کتاب میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں ایک جگہ ایک انتہائی عام سا جملہ اپنے اندر اتنی گہرائی رکھتا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اسے الفاظ میں کیسے ناپوں۔ ایک خط میں وہ بچی جو سات برس کے لڑکے کے ساتھ آئی تھی لکھتی ہے کہ ''پوتے روانی سے اردو لکھنا نہیں سیکھ پائے''۔ یہ ایک فقرہ نہیں ایک تازیانہ ہے ہماری موجودہ تہذیب پر کہ ہم وہ زبان نہیں سیکھ پائے جو صدیوں پرانی مگر ثقافت اور روایات سے بھرپور ماضی اور اس کی تہذیب کی بنیادی اساس تھی۔ یہ اور ایسے بہت سے جملے موتیوں کی طرح پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار اپنے خاندان میں شاید واحد فرد ہے جو متذکرہ بالا واقعات، کردار اور بہت سی ان کہی داستانوں کا دکھ اِن کی پوری شدت سے محسوس کرتا ہے۔ پتا نہیں کن کن چیزوں کی اداسی محسوس کرواتے ہیں جناب سید محمد اشرف۔

کتاب کا اختتام ایک گہری دھند کی تصویر کشی پر ہوتا ہے۔ کہانی کا ہیرو تو خود اس دھند میں اپنے دل کا احوال بیان کر دیتا ہے آخر کار اُس کا سفر کسی حد تک تمام ہو جاتا ہے تاہم کتاب ختم

ہونے کے بعد یہ دھند قاری کو اپنی لپٹ میں لے لیتی ہے۔ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہانی کے ہیرو کے ساتھ ساتھ قاری نے بھی ایک سفر کیا ہے۔ ہیرو کی کہانی قاری کو اپنی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ ہیرو کے سفر میں جتنے موڑ آئے وہ قاری نے بھی طے کیے ہیں۔سید محمد اشرف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں یہ نہیں دکھاتے کہ زندگی کیسے بسر ہونی چاہیے۔وہ ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ جیسے زندگی بسر ہوئی۔تبھی تو آخری سواریوں کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں بھی ایسے ایک سفر پر ساتھ لے جاتے ہیں کہ جس سفر میں خود پر آگہی کے بہت سے دروا ہوتے ہیں۔بہت سی اداسیاں بال کھولے استقبال کرتی ہیں۔ایک دفن شدہ تہذیب کا جی ہاں دفن شدہ کہ ہم سب اسے فراموش کر چکے ہیں، کا نوحہ۔ بہت عجیب ہیں یہ سفر جو پتا نہیں کن کن مقامات کی سیر کروا دیتے ہیں جہاں جانے کا ہم حوصلہ نہیں رکھتے۔

آیئے حُزن کی گہری دھند میں ان دیکھی سواریوں کو دیکھتے ہوئے کہانی کا مرکزی کردار اپنے دل کے اندیشے اپنی بیوی کو بتاتے ہوئے کچھ یوں اس داستان کو سمیٹتا ہے:

''بیوی نے اپنے آنچل سے میرے آنسو خشک کیے جو مسلسل بہہ رہے تھے۔
''آپ کس بات سے ڈر جاتے ہیں۔آج مجھے سچ سچ بتا دیں۔آپ کو میرے سر کی قسم''
اپنی بہتی ہوئی آنکھیں بیوی کے شانے پر رکھ کر میں نے ہچکیوں کے درمیان کمزور آواز میں بتایا۔
میں رخصت ہونے والی سواریوں سے ڈر جاتا ہوں۔بچپن سے اب تک جتنی سواریاں رخصت ہوئیں۔پھر واپس نہیں آئیں۔کیا یہ سواریاں بھی لوٹ کر واپس نہیں آئیں گی؟''
بیوی نے یہ سن کر اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے میرے آنکھوں سے بہتے گرم آنسو خشک کیے۔
پچھاریہ ہوا کے کانٹوں جیسے نکیلے پنجوں سے اپنے بدن اُدھڑواتے، کہرے سے بنی مختلف شکلوں کے ہیولوں کو دیکھتے، جاتی ہوئی سواریوں کے دور ہوتے مدھم شور کو سنتے ہمیں اس تکلیف دہ وقت میں راہ بھرو ہیں بیٹھنا ہے، یہ دیکھنے کے لیے کہ سڑک کے موڑ کی طرف دھیرے دھیرے جاتی اور نظروں سے غائب ہوتی سواریاں کسی دوسرے موڑ سے واپس آتی ہیں کہ نہیں''

لیجیے معاملات افسردگی کی طرف مائل ہونے لگے۔لیکن یہ حُزن اور یہ افسردگی تو تمام بڑے ادب کا خاصہ ہے اور ''آخری سواریاں'' بلاشبہ ایک بڑا ناول ہے۔ ❑❑

انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی کتاب

مجموعۂ خیال

صدیق الرحمٰن قدوائی

- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی عہدِ حاضر کے ممتاز استاد اور دانش ور ہیں۔ یہ کتاب اُن کے مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں اپنے عہد کی اُن نامور علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں قدوائی صاحب نے اپنے خیالات اور تاثرات قلم بند کیے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے حلقوں میں انفرادی حیثیت و شناخت قائم کی۔ جن شخصیتوں کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے اُن کے اسمائے گرامی ہیں: شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، شفیع الدین نیّر صاحب، پروفیسر محمد مجیب، رشید حسن خاں صاحب، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر کلیم عاجز، مخدوم محی الدین صاحب، پروفیسر شہریار، فضیل جعفری صاحب اور مجتبیٰ حسین صاحب — وغیرہ۔
- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے انتہائی سہل، سلیس اور رواں دواں زبان کا استعمال کیا ہے جس سے اُن کی تحریر میں جاذبیت اور دل چسپی پیدا ہوگئی ہے۔

ضخامت: 168 صفحات —— قیمت: 200 روپے

خصوصی گوشہ

ڈاکٹر نریش

میرا عشقِ دراز۔ ۳

جواہر لعل نہرو کی ''مقدّر سے وعدۂ ملاقات'' والی تقریر کے باوجود میں اُن سے خوش نہیں تھا۔ تقسیمِ وطن کی حقیقت اور اس سے بھی بڑھ کر اس کے لیے ان کی رضامندی میرے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ سمجھوتے کر چکے تھے۔ کیا ہمارے بھگت سنگھ، بی. کے. دت اور جتن داس جیسے شہیدوں نے درجۂ حاکمیت کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں؟ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل ہونا تھا۔ کیوں؟ پاکستان نے کم از کم جنّاح کا انتخاب تو کیا تھا۔ کیا ہمارے جواہر لعل نہرو کو ماؤنٹ بیٹنوں کے ساتھ اپنی دوستی کا مظاہرہ کرنا تھا؟ کوئی صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا دِکھائی نہیں دیا۔ سردار پٹیل، مولانا آزاد، پنڈت گوبند ولبھ پنت، کسی نے ان کو صحیح راستہ نہیں دِکھایا۔ کسی نے ان کو ان کی تقریروں کی یاد نہیں دِلائی، لوگوں کے ساتھ کیے گئے ان کے وعدوں کی، ان کی قسمتوں کی یاد نہیں دِلائی۔ محسوس ہو رہا تھا (ایسا نظر آ رہا تھا) کہ ان سب کو عہدے اور اقتدار کا مزہ چکھنے کی جلدی تھی۔

یا (ایک اور پریشان کُن خیال) کیا ہم عوام نے اجتماعی قتل و غارت میں شریک ہو کر دامانِ آزادی کو خون کے دھبّوں بلکہ خون کے تالابوں سے داغ دار کر کے اپنے رہنما کے ساتھ دھوکا کیا تھا؟ معلوم پڑ رہا تھا کہ لاکھوں لاکھوں ہندستانیوں میں صرف دو ہی شریف النفس انسان باقی بچے ہیں۔ ایک گاندھی جی جو نواکھالی اور بہار کے دیہات میں ہندوؤں مسلمانوں کو امن کا پیغام دے کر آزادی کی آمد کا جشن منا رہے تھے۔ ان کے لیے کم از کم انسانیت پہلے تھی، آزادی بعد میں۔

دوسرے جواہر لعل جو ہر روز اپنی زندگی کا خطرہ مول لے کر دلّی میں امن وامان بحال کر رہے تھے۔ کیا انھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنے جا رہے لوگوں کے ہاتھوں سے ننگی تلوار نہیں چھین لی تھی؟ کتنے دن، کتنی راتیں وہ خود جیپ چلا کر، محافظ ڈرائیور کو بغل میں بٹھا کر جائے فساد پر جاتے رہے تھے۔ کیا وہ اس وقت دوڑ کر اوکھلا کی جامعہ ملّیہ اسلامیہ نہیں جا پہنچے تھے جب ان کو معلوم پڑا تھا کہ وہاں پر اردو کُتب کا عظیم ذخیرہ نذرِ آتش کر دیا گیا ہے؟ معنی خیز اور علامتی بات یہ ہے کہ ان میں گاندھی کی اپنی سوانح عمری ''ایکسپریمنٹس وِدٹروتھ'' بھی شامل تھی۔ کیا ان کے دوست ذاکر حسین کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ جب جواہر لعل نہرو نے ان سے نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے کہا تو ذاکر صاحب کے یہ کہنے پر کہ آج ہم ایک لاکھ روپے کی کتابیں بچا گئے ہیں، تو ان کے اس خصوصی بیان پر متوحّش، الجھن میں پڑے جواہر لعل نے کہا تھا۔ ''میں نے سُنا تھا کہ اس آگ میں آپ نے لاکھوں روپے کی کتابیں کھو دی ہیں۔''

فلسفے کے فراخ دل ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''آگ لگنے کی خبر سُنتے ہی میں نے پانچ لاکھ کی کتابیں خارج کر دیں۔ اگر ہم نے ایک لاکھ کی کتابیں بچالی ہیں تو یہ ہمارے لیے خالص منافع ہے۔ یہ بھی کسی چیز کو دیکھنے کا اپنا انداز ہے۔ آپ کی سوچ یا منفی ہو سکتی ہے یا مثبت۔ میں چیزوں کا روشن پہلو دیکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔''

آخر کار ذہنی تناؤ، بوجھ، غصّے اور شرمندگی کے باوجود نہرو کو سکون کا احساس ہوا۔ وہ مُسکرائے اور چلتے بنے۔

اس بھلے بُرے شخص کو میں محبت بھی کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نفرت بھی کرتا تھا۔ ان ہیبت ناک دنوں میں جب میرے اپنے کنبے کی زندگیاں اور ان کا وقار داؤ پر لگا ہوا تھا تو میں نے بہ وقتِ ضرورت ان کی طرف رُجوع کیا۔ پانی پت کے مسلمانوں کی ذہنی کوفت سے متعارف کرانے کی غرض سے میں نے ان کو ایک طویل تار بھیجا کہ وہاں پر مسلمانوں کی اکثریت ہندستان میں رہنے کی خواہاں ہے لیکن پاکستان سے آنے والے مہاجرین کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت ان کو یہاں سے چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرے کنبے نے بمبئی آنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جہاں پر میں ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ ان کے لیے اتنا تو کر دیا جائے کہ وہ بہ حفاظت دلّی کے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے میں ان کا بذریعۂ ہوائی جہاز بمبئی پہنچنے کا انتظام کر سکوں۔ میں نے تار بھیج دیا اور انتظار کرنے لگا۔ ریڈ کلف لکیر کے دونوں طرف لاکھوں لوگ یہی تو کر رہے تھے۔ دریں اثنا میرے دوست منموہن کو مہینوں کی خاموشی اور شش و پنج کے بعد اپنے

والد کا تحریر کردہ خط موصول ہوا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، آنکھیں اشکبار تھیں اور خط اس سے کھولا نہیں جا رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس خط میں اس کے لیے کیا پیغام لکھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے والد نے اسے یہ اطلاع دینے کے لیے یہ خط لکھا ہو کہ پاکستان سے ہندستان آتے وقت اس کی والدہ اور ہمشیرہ جاں بحق ہوگئیں۔ آخر خط کو میں نے کھولا اور اس کو یہ خوش خبری سُنائی کہ اس کے والدین اور بہنوں کی جان ان کے پڑوسی مسلمانوں نے بچا کر ہندستان آنے میں ان کی مدد کی ہے۔ اب وہ پناہ گیر کیمپ میں رہ رہے ہیں۔

ہفتہ بھر انتظار کرنے کے بعد مجھے اپنی والدہ کا خط ملا کہ وہ لوگ بہ حفاظت دلّی پہنچ گئے ہیں اور ''بڑا دواخانہ'' کی پہلی منزل پر مقیم ہیں۔ اس یونانی دواخانے کی بنیاد میرے والد نے رکھی تھی، جب وہ لال کنواں میں رہا کرتے تھے۔ ان کو کئی جوکھموں (خوشگوار ناخوشگوار دونوں) اُٹھانے پڑے لیکن شکر ہے کہ وہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی مشفق دست اندازی کے باوصف بہ حفاظت دلّی پہنچ گئے ہیں اور اب وہ منتظر ہیں کہ میں ان کے بذریعۂ ہوائی جہاز بمبئی پہنچنے کا انتظام کروں چوں کہ سنتے ہیں کہ ابھی بھی ریل میں سفر کرنا محفوظ نہیں ہے۔

جن جوکھموں کا ذکر میری والدہ نے اپنے خط میں کیا تھا وہ پردے کی اوٹ میں رہنے والی خواتین کے لیے انتہائی ہولناک تھے۔ میری والدہ اور میری بہنوں نے بعد میں جو واقعات بیان کیے، ان کو یکجا کرنے پر مندرجۂ ذیل داستان سامنے آتی ہے۔

پانی پت میں کسی کو بھی نہ پاکستان کی اصل نوعیت کا علم تھا نہ اس کی پیچیدگیوں کا۔ سفید کالر والے چند سرکاری ملازمین نے اس امید میں پاکستان کا انتخاب کیا تھا کہ اسلامی ملک میں ان کو جلدی جلدی ترقیاں مل جائیں گی لیکن انھوں نے کبھی پاکستان کے کراچی، لاہور، منٹگمری جیسے غیر مانوس دور دراز شہروں میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا کوئی اقدام نہیں کیا تھا۔ (پانی پت والوں کا حجم وہاں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ان گھروں میں آباد ہوگیا تھا جن کو وہ لوگ ہندستان منتقل ہوتے وقت چھوڑ گئے تھے اور کسی دوسری جگہ پر نہیں، پانی پت میں جا بسے تھے۔) پانی پت کے مسلمان پانی پت میں اور منٹگمری کے ہندو منٹگمری میں کیوں نہ رہ سکے؟

میری دو چچازاد بہنوں کے پاس پانی پت ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک کشادہ جدید طرز کی کوٹھی تھی جس کے ساتھ وسیع باغات ملحق تھے۔ جون جولائی میں ان کو گھر اور باغات کے لیے مقامی لالہ لوگوں سے بہت دل کش اور نفع بخش پیش کشیں ملیں مگر انھوں نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ کوٹھی ان کے والد نے بنوائی تھی اور ان کو اس سے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔

خریدنے کے امیدواروں نے دلیل دی کہ خواجہ صاحب، آخر آپ تو پاکستان جارہے ہیں۔ جب جائیداد کے بڑھیا دام مل رہے ہیں تو آپ بیچ کیوں نہیں دیتے؟

میری بہن نے خریدار پر خفا ہوکر جواب دیا۔ ''اَبے پاگل ہوا ہے؟ اور جب نوکری چھوڑ کے، پنشن لے کے آئیں گے تو ہم کہاں رہیں گے؟'' سول سکریٹریٹ کے اکثر مسلمان ملازمین کا یہی سادہ لوحی کا وتیرہ تھا۔

مسلمانوں کے نزدیک پاکستان ایک نیا صوبہ تھا جہاں پر ان کو مفید ملازمتیں حاصل ہوسکتی تھیں۔ ایک ایسا صوبہ جہاں وہ جاسکتے تھے اور سبک دوش ہونے کے بعد لوٹ کر ہندستان آسکتے تھے۔

جہاں تک محنت کش مسلمانوں کا تعلق تھا ان میں زیادہ تر پانی پت کے بُن کر تھے۔ وہ نہ پاکستان کا مطلب سمجھتے تھے، نہ اس کی تصدیق کرتے تھے۔ ان کو پاکستان سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ پاکستان کو ایک مقامِ دور دراز سمجھتے تھے جہاں مسلمان اسی طرح سے جاسکتے تھے، جیسے وہ زیارت کے لیے کہیں جاتے تھے۔

جیسے ہی ریل گاڑیاں پنجابی مسلمانوں کے ہاتھوں زدوکوب ہوئے ہندوؤں اور سکھ مہاجروں کو لے کر پاکستان سے آنے لگیں، ظاہرہ طور پر مسلمانوں کی حفاظت کے لیے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا، لیکن تھانے کا انچارج پولیس انسپکٹر ایک مہاجر تھا جو لاہور یا راولپنڈی کے مسلمانوں کے ہاتھوں مار کھا کر آیا تھا اور پانی پت کے مسلمانوں سے اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ کرفیو میں گھنٹے دو گھنٹے ہی کی ڈھیل دیتا تھا تاکہ مسلمان ضروری خریداری کرلیں۔ مگر اب وہاں پر گوشت دستیاب نہیں تھا چوں کہ بھیڑ بکریاں دیہات سے آتی تھیں۔ ہمارے کنبے نے مہینے بھر سے اوپر کا وقت اُبلی ہوئی دال اور چپاتیاں کھا کر ہی گزارا۔ میری والدہ عادتاً پان کھاتی تھیں اور پان اب نایاب سامانِ عیش ہوگیا تھا۔ پان کی قیمت ایک پیسے کے چار سے بڑھ کر ایک روپے کے ایک تک پہنچ گئی تھی۔ میری والدہ ایک پتّے کے دس ٹکڑے کر کے کھا رہی تھیں۔ گھر میں سوائے چھوٹے بچوں کے مرد کوئی نہیں تھا اور بچّے خوراک کی کمی کا شکار ہورہے تھے۔ چوں کہ دودھ کسی طرح بھی دستیاب نہ تھا۔

گھیرابندی کے اسی عالم میں ایک روز دیر شام پولیس نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔

''آپ کے لیے دہلی سے ایک فوجی لاری آئی ہے۔ آپ کو تیار ہونے کے لیے آدھے گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، اُٹھا لیجیے۔ سامان بھجوانے کا دوسرا کوئی

راستہ نہیں ہے۔ لاری تحصیل کے نزدیک کھڑی ہوئی ہے۔'' تحصیل ہمارے گھر سے کوئی دو میل کی دوری پر تھی۔ لہٰذا ہمارے گھر کی عورتوں اور بچوں نے چھوٹے سوٹ کیسوں میں سامان بھرا، ڈھونے لائق بنڈل بنائے اور سروں پر اُٹھا کر چل دیے۔ زندگی میں پہلی بار عورتوں کو بغیر برقعے کے گھر سے نکلنا پڑا۔ (پردہ ترک کرنے سے متعلق تاریخی مجبوریوں کے بارے میں میں پہلے ہی سے لکھتا بولتا رہا ہوں لیکن مجھے اُن حالات کے بارے میں سُن کر بہت افسوس ہوا جن میں اپنی زندگیاں بچانے کے لیے میری والدہ اور بہنوں کو برقعہ ترک کرنا پڑا تھا۔) گھر چھوڑنے سے پہلے میری والدہ نے دروازے پر پہلے ہی تیار کروا رکھی دو تختیاں ٹانگ دی تھیں۔ ان تختیوں پر لکھا تھا کہ یہ مکان خواجہ احمد عبّاس کا ہے اور ان کی والدہ اور بہنیں پاکستان نہیں، اس کے پاس بمبئی جا رہی ہیں۔ ان کا ارادہ ہر طرح سے پانی پت لوٹنے کا ہے۔ تختیوں پر یہ سب اردو، ہندی اور پنجابی میں لکھا ہوا تھا۔

تختیاں لٹکا کر انھوں نے دروازوں پر تالے ڈالے اور تاروں کی چھاؤں میں چل پڑیں۔ گلیوں کوچوں کے پتھریلے راستوں پر سے ان کے قدموں کی پُراسرار آوازیں آ رہی تھیں۔ ابھی وہ بہت دور نہیں گئی تھیں کہ ان کو لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سُنائی دی۔ میری والدہ نے یہ باور کرنا پسند ہی نہیں کیا کہ ان کے گھر کے تالے بھی توڑے جا سکتے ہیں مگر تالے توڑے جا چکے تھے۔

پھر جب وہ لاری میں سوار ہونے لگیں تو دکنی ہند کے فوجی ڈرائیور اور گارڈوں نے ان کو سیلوٹ کیا۔ راستے میں انھوں نے استفسار کیا کہ وہ کون تھیں جن کے لیے وزیرِ اعظم اس قدر پریشان ہو رہے تھے۔ انھوں نے خود ان کو ہدایت دی تھی کہ اس کنبے کو بہ حفاظت دلّی لایا جائے۔ میری والدہ نے ان کو میرے بارے میں بتایا کہ میری پنڈت نہرو سے شناسائی ہے اور میں نے ان کو تار دیا تھا۔

''تو آپ پاکستان نہیں جا رہی ہیں؟''

''خدا نہ کرے۔'' میری والدہ نے فخر کے ساتھ کہا۔ ''میرا بیٹا قوم پرست ہے۔''

وہ پندرہ دن دلّی میں رہیں۔ اس دوران میں ہوائی جہاز کے ذریعے ان کو بمبئی لانے کے لیے اُدھار مانگتا رہا۔ میرے تمام دوست نادار تھے مگر جس سے جو بن پڑا اس نے دیا۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ ایک سو بارہ (=/112) روپے کا ہوتا تھا۔ جو رقم جمع ہوئی، ان کے آنے بھر کے لیے کافی تھی۔ مجھے ریل سے جانا ہوگا۔ ٹھیک اسی روز خبر شائع ہوئی کہ راجستھان کی ریاستوں میں سے گزرتے وقت فرنٹیر میل میں سے نکال کر مسلمانوں کو مارا جا رہا تھا۔ میرے

بارے میں مشہور تھا کہ میں غیر مسلم ہونے کا بہانہ کرسکتا تھا لیکن اپنی شناخت کو چھپانے کو لے کر میرے اندر خودداری بھی تھی اور حسِ معقولیت بھی۔ یہاں پر پھر میری مدد کو میرا دوست منموہن آگے آیا۔ اس نے میری جگہ پر خود جانے کی پیش کش کی کہ وہ سامان ریل سے لے آئے گا اور خواتین کو ہوائی جہاز سے روانہ کردے گا۔

بامبے سینٹرل پر جب میں نے اس کو رخصت کیا تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ بھرت پور اسٹیشن پر اسی کے ڈبّے میں سے کھینچ کر مسلمانوں کو باہر نکالا جائے گا اور اسٹیشن کی حدود کے عین باہر لے جا کر قتل کردیا جائے گا۔ جو وحشت ناک نظارہ اور صدمہ میرا مقدّر رہ سکتا تھا، اس نے منموہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جب وہ دلّی پہنچا تو وہ تیز بخار میں مبتلا تھا۔

جس روز میری والدہ اور کنبے کے دیگر افراد آئے اُس روز میں اور میری اہلیہ ہوائی اڈّے پر موجود تھے۔ ہم بچوں کی، بالخصوص میرے چھ برس کے بھتیجے انور عبّاس کی، لاغر حالت دیکھ کر دھچکا کھا گئے۔ انور اب ایئر انڈیا میں عامل ہے لیکن اس کی جسمانی کمزوری، مختلف امراض کے تئیں اس کی سجدہ ریزی اور جہاز کی اُڑان کے دوران اس کی حیران کُن گھبراہٹ کا سیدھا تعلق ان دنوں میں حاصل ہوئی غذائیت سے تہی خوراک میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ میری والدہ پہلے ہی سے کمزور تھیں مگر ان کا حوصلہ بلند تھا۔ میرا خیال تھا کہ پانی پت چھوڑنے کو لے کر، بے پردہ نکلنے کی مجبوری پر اور ان تمام صعوبتوں پر جو اُن کو جھیلنا پڑی تھیں ان کی آنکھیں اشک بار ہوں گی لیکن ان کی زبان سے کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ شاید وہ اُداس تھیں مگر پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی کے ساتھ مجھ کو سینے سے لگا کر انھوں نے کہا۔ ''مجھے ہوائی جہاز کا یہ سفر اچھا لگا۔ میں ہمیشہ ہوائی جہاز ہی میں سفر کیا کروں گی۔ جہاز میں اُڑتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خدا کے زیادہ قریب ہوگئے ہوں۔''

دو دن کے بعد میں نے جواہر لعل نہرو کو ایک طویل خط لکھ کر اپنے کنبے کی طرف سے ان کی مہربانی اور خیال داری کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ سب بھی بتایا جو منموہن نے بھرت پور ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ یہ واحد ایسا خط تھا جس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ شاید مجھے ان کو اپنے کنبے کے حوالے ہی سے خط لکھنا چاہیے تھا، جن کی زندگیاں انھوں نے بچا دی تھیں۔ بھرت پور میں مارے گئے ان مسلمانوں کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے تھا جن کی زندگیاں وہ نہیں بچا سکے تھے۔ جواہر لعل ایک تھے اور ہندو پاک میں متعدد تلواریں تھیں جو اُن کا تعاقب کر رہی تھیں۔

مجھے پاکستان یا پاکستانیوں کے خلاف کسی قسم کی نفرت کا احساس نہیں ہوا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا

جب کہ اُن میں میرے وہ رشتہ دار، وہ احباب شامل تھے جن کا میں معترف تھا، جن سے مجھے محبت تھی۔ میں پاکستان کی بنیاد بنے ''ایک مذہب ایک ملک'' کے نظریے کو لے کر افسردہ تھا۔ میں فطری طور پر اس نظریے کے خلاف تھا۔ قسمت کے لکھے کے حق میں کتنی ہی دلیلیں کیوں نہ پیش کی جائیں، میں اس نظریے کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ مجھ کو معلوم ہے کہ یہاں پر دھوتیوں میں پاکستانیوں کا آر ایس ایس ہے، جن سنگھی ہیں، ڈی ایم کے ہے جو دکنی ہند میں تملیوں کا پاکستان بنانے کا خواہاں ہوگا۔ میں پاکستانیوں کے حق میں دعا گو ہوں کہ وہ اپنا ملک تعمیر کریں مگر میرے دل میں پوشیدہ یہ حسرت ہے کہ میں کوشش کروں اور ان عالموں فاضلوں میں سے کچھ کو واپس لے آؤں جو ہندستان کی پیداوار ہیں لیکن جن کو خانگی تقاضوں یا سیاسی مجبوریوں کے باعث جانا پڑا ہے۔

۱۹۴۸ میں میں نے ساحرؔ لدھیانوی کے نام ایک ''کھلا خط'' لکھا تھا جواب بند ہو چکے ''انڈیا ویکلی'' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں میں نے اس نوجوان ہندستانی شاعر سے اپیل کی تھی کہ وہ بھارت واپس آجائے۔ میں نے اس کو یاد دلایا تھا کہ جب تک وہ اپنا نام نہیں بدلے گا یا جب تک پاکستان حملہ کر کے لدھیانہ فتح نہیں کرلے گا، تب تک وہاں پر اُسے ہمیشہ ہندستانی شاعر ہی تصوّر کیا جائے گا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس اخبار کی کچھ کاپیاں لاہور جا پہنچیں جہاں ساحرؔ نے یہ خط پڑھ لیا اور مجھے حیران اور مسرور کرتے ہوئے وہ اپنی والدہ (جو اَب اس دنیا میں نہیں ہیں) کو ساتھ لے کر ہندستان لوٹ آیا۔ چند ابتدائی مشکلات کے بعد اس نے اپنی ترقی پسند خیال پرستی کو برقرار رکھتے ہوئے فلموں کو ادبی تاثیر دے کر سرفراز کیا۔

اسی طرح میں سجاد ظہیر کو واپس بلانے کے لیے بھی متفکّر تھا مگر اس کو کمیونسٹ پارٹی کی ہدایت تھی کہ وہ وہیں پر بنا رہے۔ جب اس کو اس کے دوست شاعر فیض احمد فیضؔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں بے میعادی مدّت کے لیے قید کر دیا گیا تو میں نے سوچا کہ اس کی ممکنہ واپسی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ مگر سالوں بعد جب اسے جیل سے رہا کیا گیا تو مجھے پھر فکر ہوئی کہ یہ سب کا پیارا نرم گفتار کمیونسٹ واپس آجائے۔ کمیونسٹ لوگ بھی اُسے واپس بُلانا چاہتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ نہرو حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات ویسے نہ تھے جیسے بعد میں ہو گئے تھے۔ اس کو ویزا کون دے گا؟ اس کو یہاں کی وطنیت کون دے گا؟ ایک ہی شخص تھا جو یہ کر سکتا تھا— جواہر لعل نہرو۔ اور میں نے اس سلسلے میں اُن سے بات کرنے کا ذمہ لے لیا۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ سجاد ظہیر کو جانتے ہیں؟

انھوں نے کہا۔ ''بے شک جانتا ہوں۔ تب سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھا۔ جب میں

پہلی بار صدر منتخب ہوا تھا تو وہ اے آئی سی سی کے دفتر میں ہوتا تھا۔''

میں نے کہا۔''وہ پاکستان میں ہے، بیمار ہے۔ اسے توجہ اور خاطر داری کی ضرورت ہے جو یقیناً اسے اپنے بیوی بچوں کے پاس رہ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔''

انھوں نے قدرے تلخی سے پوچھا۔''اُسے پاکستان جانے کے لیے کہا کس نے تھا؟''

''میرا خیال ہے اس کو اس کی پارٹی نے پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی ترتیب دینے کے لیے بھیجا تھا۔''

انھوں نے بغض سے نہیں، شفقت سے کہا۔''وہ اور اس کی پارٹی۔سب بے وقوف جمع ہو رہے ہیں۔ سید سجاد ظہیر، ہمارے بنّے میاں، لکھنؤ کا اشرافی شاعر پنجابیوں، بلوچوں اور سندھیوں کو کمیونزم سکھائے گا؟'' ان کے نزدیک ایسا سوچنا بھی حماقت تھی، لغویت تھی۔ پھر انھوں نے یک لخت پوچھا۔''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

میں نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہندستان واپس آئے، ایک بار پھر سے ہندستانی کہلائے، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہے، وطن کی خدمت کرے۔''

''ہوں۔'' انھوں نے پُرفکر ہو کر کہا۔''تو آپ ایسا سمجھتے ہیں۔''

حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سوال نہیں تھا، تب بھی میں نے کہا۔''جی پنڈت جی۔''

''میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے پنڈت جی مت کہا کریں۔ اس پر نہ میرا اعتقاد ہے، نہ آپ کا۔''

اور میری ملاقات اِختتام پذیر ہو گئی۔

میں نے اس موضوع پر پھر کبھی دوبارہ بات نہیں کی۔ تاہم چند ماہ ہی میں سجاد ظہیر کو ہندستان آنے کا ویزا دے دیا گیا اور ایک سال کے اندر اندر ہی وہ پھر سے ہندستان کا شہری بن گیا۔ اس نے ہندستان میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا یادگار تاریخی دستاویز ''روشنی'' شائع کیا، ہندستان میں ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو پھر سے زندہ کیا، افریقہ ایشیا یکجہتی کمیٹی قائم کی اور گو ابھی تک وہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا رُکن تھا، اس نے اپنی نفاست سے، اپنی علمیت سے حتیٰ کہ اپنی شاعری سے تمام سیاسی پارٹیوں سے اور غیر جماعتی علما میں سے بہت سے لوگوں کو اپنا دوست بنایا جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ 1973 میں تاشقند میں افریقہ ایشیا یکجہتی کمیٹی کی ایک میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے اس کو دل کا دورہ پڑا اور اس نے داعیِ اجل کو لبّیک کہہ دیا۔

لیکن میں تو متوقع واقعات کا اندازہ کرتا رہا ہوں اور ان کو سَن وار آگے بڑھاتا رہا ہوں۔

درحقیقت اس وقت ہم 1948 کے ابتدائی دور میں ہیں اور ابھی ابھی گاندھی جی کو ہلاک کیا گیا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو یہ خدشہ تھا کہ گاندھی یا جواہر لعل نہرو کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ یہ گاندھی جی کے ساتھ ہوا۔ شہادت ایک سنت ہی کو زیب دیتی تھی۔ یہ بھی مناسب ہی تھا کہ گاندھی جی ایک ہندو کے ہاتھوں جاں بحق ہوں۔ ناتھورام گوڑسے ہندو مذہب کے بدترین پہلو کی نمائندگی کرتا تھا۔

اس شام میں پیریسین ڈیری میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب میں نے سُنا کہ گاندھی جی پر تین جان لیوا گولیاں داغی گئی ہیں۔ قاتل کی شناخت فوری طور پر ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ جب ظاہر کی گئی، میں نے راحت کی سانس لی۔ خدا کا شکر ہے کہ کارنامہ کسی سر پھرے مسلمان نے انجام نہیں دیا تھا۔ گو میں 'بامبے کرونیکل' سے دست بردار ہو چکا تھا اور اپنا ''لاسٹ پیج'' بھی 'بلٹز' کو منتقل کر چکا تھا لیکن مجھے اس کے بعد اخبار کے دفتر ہی میں سکون نصیب ہوا۔ تاہم اس قسم کے بحران کے وقت اگر میں کسی روزانہ اخبار کے بارے میں سوچ سکتا تھا تو وہ ''بامبے کرونیکل'' ہی تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے تین برس قبل اس وقت گاندھی کے اعلانِ وفات کی مکمل موٹی فائل تیار کر لی تھی جس وقت وہ بھوک ہڑتال پر تھے اور ان کی موت یقینی دِکھائی دے رہی تھی۔ گاندھی جی اس بھوک ہڑتال سے زندہ اُبھر آئے۔ انھوں نے نواکھالی، بنگال اور بہار کا دورہ کر کے ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جان بچائی۔ امن قائم کرنے کے لیے انھوں نے ایک اور مرن ورت رکھا مگر اس میں بھی زندہ رہے اور آخر کار بے حد قریب سے داغی گئی قاتل کی گولیوں سے جامِ شہادت پی گئے۔

میں ''بامبے کرونیکل'' کے اس گروپ میں شامل ہو گیا جو پورے جوش کے ساتھ گاندھی جی کی رحلت سے متعلق تازہ ترین خبریں جمع کر رہا تھا۔ ایک شخص سفری ریڈیو لے کر آیا تھا اور اس پر میں نے جواہر لعل نہرو کی اشک آلودہ تقریر سُنی۔ ''دوستو! اور ساتھیو! ہماری زندگیوں میں سے روشنی رخصت ہو گئی ہے اور ہمارے لیے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں پڑ رہا ہے کہ میں آپ کو کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ ہمارے محبوب رہنما جن کو ہم باپو کہتے تھے جو ہمارے راشٹر پِتا تھے، اب اس دنیا میں نہیں ہیں...''

میں پوری رات کام کرتا رہا۔ کام نے گاندھی جی کی رحلت سے ہوئے غم واندوہ کو قدرے ہلکا کر دیا۔ مسلمانوں (ہندستانی اور پاکستانی بھی) کے لیے ان کی موت پر ماتم کرنے کی خاص وجہ تھی کہ انھوں نے ان کے لیے اپنی جان دی تھی۔ اگلے روز میں نے دیکھا کہ وہ رات میری والدہ نے مہاتما گاندھی کی روح کے لیے دعا مانگتے ہوئے جائے نماز پر بسر کی تھی۔

جب وادیِ کشمیر کا عظیم ڈرامہ چل رہا تھا تب گاندھی جی ابھی حیات تھے۔ مہاراجہ ہندستان میں شامل ہونے سے صاف انکار کر رہا تھا۔ وہ پاکستان اور ہندستان دونوں کے ساتھ اِلحاق کی ابتدائی مفید شرطوں پر سودے بازی کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی پاکستان کے ساتھ توقف کے عہدنامے پر دستخط کر چکا تھا اور ہندستان کی سرکار اُسے آلۂ الحاق پر دستخط کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ یہ ایک ایسی قانونی اور آئینی ضرورت تھی، جس کے بغیر حکومتِ ہندستان مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ شیخ عبداللہ ''کشمیر چھوڑو'' تحریک کے اس زمانے ہی سے جیل میں بند تھے جب مہاراجہ کی پولیس نے عارضی حکومت کے سربراہ جواہر لعل نہرو کو کوہالہ میں گرفتار کیا تھا۔ ''کشمیر چھوڑو'' تحریک کے بارے میں میری کچھ ذاتی معلومات تھیں چوں کہ میں شیخ صاحب کی گرفتاری اور نہرو کی بے دخلی کے فوراً بعد وہاں گیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے علی محمد طارق نام کے ایک نوجوان کارکن نے مجھے مہاراجہ ہری سنگھ کی پولیس کے مظالم کا شکار ہوئے وہ لوگ دِکھائے تھے جو ہسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ اسی اے.ایم. طارق نے بعد میں پارلیمنٹ کے اندر نہرو کے مددگار کے طور پر نام پیدا کیا اور جواہر لعل کے انتقال کے بعد براستہ انڈین موشن پکچرز ایکسپورٹ کارپوریشن تنزل نصیب ہوا، جس کا وہ پانچ برس تک مابہ النزاع صدر رہا۔

جواہر لعل نہرو کے ایما پر مہاراجہ نے ستمبر کے مہینے میں شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا۔ مہاراجہ ابھی لیت ولعل ہی کر رہا تھا کہ اکتوبر میں پاکستانی حملہ آوروں نے غالباً سی آئی اے کے رسل ہیٹ کی قیادت میں کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ راتوں رات مہاراجہ اپنی جان بچا کر اپنی رانیوں اور خزانے کے ساتھ جموں کے محفوظ مقام پر چلا گیا اور وادی کو حملہ آوروں اور خدا کے بھروسے چھوڑ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب حملہ آور اڑی اور بارہ مولہ میں آگ زنی اور لوٹ مار کی واردات انجام دے رہے تھے۔ جواہر لعل نہرو، شیخ عبداللہ اور باقاعدہ مہاراجہ ہری سنگھ کے درمیان سہ گانہ گفت وشنید ہوئی۔

کشمیر کے بے تاج بادشاہ شیخ عبداللہ کو ہنگامی نظم ونسق کا مکھیا بنا کر ان کے ہمراہ قید سے آزاد ہوئے ساتھیوں اور نیشنل کانفرنس کے جواں سال عناصر پر مشتمل عارضی حکومت کی سربراہی سونپ دی گئی۔ یہ وہ پس منظر تھا جو ایک روز مجھے جواہر لعل نہرو کے دفتر لے گیا۔

''اب آپ کیا چاہتے ہیں؟'' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''میں کشمیر جانا چاہتا ہوں۔''

لمحہ بھر انھوں نے سوچا اور کہا۔ ''آپ کو معلوم نہیں کہ وہاں پر جنگ جاری ہے؟ وہاں جانا پُر خطر ہوسکتا ہے۔'' میں نے ان کو یاد دلایا کہ کئی ترقی پسند ادیب اور فنکار پہلے ہی کشمیر پہنچ چکے ہیں

اورکوئی وجہ نہیں ہے کہ میں وہاں پر اُن کا ساتھ نہ دوں۔

وہ پھر خاموش ہوگئے۔ اپنی میز پر پڑے کاغذات کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ پھر کاغذات کو ایک طرف کر کے انھوں نے مجھ سے ایک غیر متوقع سوال کیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ آج کشمیر میں سب سے مقبول نعرہ کون سا ہے؟'' میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔ ''شیرِ کشمیر زندہ باد۔''

''آپ احمق ہیں عبّاس میاں۔ مجھے آپ سے بہتر جواب کی امید تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اخبار دھیان سے نہیں پڑھتے ہیں۔ آج کشمیر میں سب سے مقبول نعرہ ہے۔ حملہ آور خبر دار۔ ہم کشمیری ہیں تیار۔''

''شکریہ حضور۔ لیکن کیا میں کشمیر جا سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے خصوصی اجازت درکار ہے۔''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ آپ جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو جا کر رفیع صاحب سے ملنا ہوگا۔ وہ آپ کو آٹے کی بوریوں کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔''

لہٰذا میں رفیع احمد قدوائی کے پاس گیا۔

میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا، کانگریس کی اسٹیج پر ان کو دیکھ بھی رکھا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں ان کے رو بہ رو تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کو وزیرِ اعظم کا فون آ چکا تھا کیوں کہ انھوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کشمیر کیوں جانا چاہتا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا پوچھا کہ کیا میں کل صبح چھ بجے کے جہاز پر جا سکوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو آدھی رات کو جانے کے لیے بھی تیار ہوں۔

عین اس وقت جب وہ کاغذ کے ایک پُرزے پر دستخط کر رہے تھے، قریب چالیس برس کی ایک خوب صورت لاغر خاتون کمرے میں داخل ہوئی اور رفیع صاحب تعظیم کے لیے اپنی کرسی پر سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس خاتون میں کچھ تعظیم طلب بات ضرور تھی۔ وہ کھادی کی سادہ سی ساڑی میں ملبوس تھی اور اس کے کاندھے پر کھادی کا تھیلا لٹک رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئی تو رفیع صاحب نے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتی ہیں بھابی؟''

اس نے کہا کہ اس کو مہاجرین کے لیے آٹے کی چار بوریاں درکار ہیں۔

اس کی آنکھوں سے اور اس کی عمومی شخصیت سے اُداسی جھلک رہی تھی۔ میں نے سوچا یہ رفیع صاحب کے کسی دوست کی بیوہ ہوگی جو کسی مہاجر کیمپ کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ میں نے سوچا وہ

یقیناً لاہور، راولپنڈی یا لائل پور سے ہوگی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ سری نگر میں آٹے کی ضرورت ہے اور ہم سے جتنا انتظام ہوسکتا ہے، ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بھجوا رہے ہیں۔'' رفیع صاحب نے معذرت کے ساتھ کہا۔''اگر آپ کو ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بوریاں درکار ہوں...''

خاتون نے اثبات میں کہا۔''ٹھیک ہے۔ آج میں دو بوریاں لے لیتی ہوں مگر کل میں پھر یہاں حاضر ہوں گی۔''

رفیع صاحب نے ایک چٹ اس کو دی اور وہ ''آداب عرض'' کہہ کر رخصت ہوگئی۔ میں حیران تھا کہ وہ کون تھی جو مہاجرین کے لیے آٹا جمع کر رہی تھی، جس کو رفیع صاحب بھابی کہہ رہے تھے اور جس نے وقتِ رخصت آداب عرض کہا تھا؟

اس کے چلے جانے کے بعد رفیع صاحب نے ایک چٹ مجھے دی جس پر صرف یہ درج تھا۔''خواجہ احمد عبّاس۔ سری نگر کے لیے ایک سیٹ۔'' اور اگلے روز کی تاریخ ڈالی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے پُرانے دوست انور سے استفسار کیا کہ یہ پُراسرار خاتون کون تھی تو اس نے بتایا کہ''اس میں پُراسرار کچھ نہیں ہے۔ وہ انیس آپا ہیں۔ رفیع صاحب کی بھابی۔ ان کے شوہر مسوری کے فرقہ وارانہ فسادات میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ یہ خاتون سکون کی تلاش میں گاندھی جی کے پاس چلی گئیں۔ انھوں نے ان سے کہا کہ جا کر مہاجرین کی خدمت کریں۔''

''لال قلعہ میں موجود مسلمان مہاجرین کی؟''

''نہیں، ہندو مہاجرین کی۔ مہاتما نے ان سے کہا کہ پاکستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ مہاجرین کی خدمت کرنے میں آپ کو اصل سکون حاصل ہوگا۔ وہاں پر ایک ہندو عورت بھی موجود تھی جس کے شوہر کو جنونی مسلمانوں نے مار ڈالا تھا۔ گاندھی جی نے اس سے مسلمان مہاجرین کی خدمت کرنے کے لیے کہا۔''

یہ تھے مہاتما جی ہمہ نگاریں۔ ضمیر اور روح کے زخموں پر مرہم لگانے کا ان کا اپنا ہی طریقہ تھا۔ وہ پہلے بھی ایک ہندو بیوہ کو مسلمان مہاجرین کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھیج چکے تھے۔

اگلے روز ابھی اندھیرا ابھی نہیں چھٹا تھا کہ میں صفدر جنگ ہوائی اڈّے پر جا پہنچا۔

کئی ڈکوٹا جہاز وہاں پر کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے صبح چھ بجے سے پہلے ڈکوٹا میں جگہ دے دی گئی۔ ابھی پَو نہیں پھٹی تھی۔

میں جہاز میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پر بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہ تھی۔ درمیانی

راستے کے دونوں طرف آٹے، دال، چاول کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک دُبلا سا فوجی افسر کھڑا ہوا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں نے سوچا یہ کوئی بڑا افسر ہوگا جو اس جہاز پر جا رہا تھا۔ حفاظتی پٹیاں باندھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بوریوں کے ڈھیر پر ایک طرف وہ بیٹھ گیا اور دوسری طرف میں۔ ہم نے اپنے تقریباً ایک جیسے وزن سے توازن پیدا کر دیا اور بوریوں پر بندھی رسّیاں پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بینہال روڈ (اس تیکھے موڑوں والی سڑک سے میں واقف تھا، کئی بار اس پر سے جا چکا تھا) برف باری کی وجہ سے بند تھی۔ کشمیر کو رسد پہنچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ ریاست کا ایک حصّہ یعنی مظفر آباد ضلع پاکستان کے ہاتھوں میں جا پڑا تھا لیکن اصل وادی اور جمّوں کو کشمیری عوام نے خود اپنی مدد کر کے اور ہندستانی فوج کی بروقت فیصلہ کُن نیابت سے بچا لیا تھا۔

''صبح بخیر جناب۔''

''صبح بخیر میرے بچّے۔'' اس کا لہجہ سینڈ ہاسٹ والا تھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے ذرا سی کوشش کی مجھے پہچاننے کی۔ ''آپ ضرور ایک ادیب ہوں گے۔ میں نے آپ کا نام کہیں نہ کہیں دیکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے دیکھا ہو۔''

اب میں نے پوچھا۔ ''آپ کا اسمِ شریف؟''

اس نے پھر اسی سینڈ ہاسٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''کریپّا۔''

کریپّا! حالت کو روشن کرتی ہوئی ایک چمک سی لہرا گئی۔

''حضور کہیں جنرل کریپّا تو نہیں ہیں؟''

''ہاں میں جنرل کریپّا ہی ہوں لیکن اس وقت میں آٹے چاول کی ان بوریوں پر بیٹھا ہوا آپ کا ہم سفر ہوں۔ کشمیری عوام کے لیے ان بوریوں کا مطلب ہے زندگی اور موت۔''

''حضور آپ کا مطلب ہے...'' میں ذرا سا ہکلا گیا۔ ''آپ جیسے بڑے فوجی افسر کے لیے وہ ایک جہاز بھی مہیا نہیں کرا سکتے؟''

''چاول اور آٹا پہلے آتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''تمام جہاز سامان ڈھونے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں سرحد کا معائنہ کرنے کے لیے ٹّمی کے ساتھ امرتسر جا رہا ہوں۔ واپسی میں یہی جہاز مجھے دلّی واپس لے جائے گا۔''

امرتسر ہوائی اڈّے پر مجھے معلوم پڑا کہ ٹّمی کا مطلب جنرل تھمیّا تھا۔ وہ اس وقت بریگیڈیر

تھے۔ جنرل وہ بعد میں بنے۔ کشمیر میں میری ان سے شناسائی ہوئی کہ وہ فنونِ لطیفہ کے دِلدادہ تھے اور اپنی اہلیہ کے بھرت ناٹم رقص کے شوق کے تئیں وقف تھے۔ انھیں سے مجھے ہندستان کے حیرت کُن مبہم ادنا سے حصّے کورگ کے بارے میں پتا چلا جو ہندستانی فوج کو اعلا افسر مہیا کراتا تھا۔

تقریباً دوپہر کے وقت ہمارا چھوٹا سا جہاز سری نگر کی ہوائی پٹّی پر اُترا۔ ہمیں فوج کے کئی ٹرک اور ایک جیپ دِکھائی دی۔ غالباً وہ میرے لیے بھیجی گئی تھی۔ جیپ کا ڈرایور ایک خوب رو کشمیری نوجوان تھا۔ اس نے گرم خاکی پینٹ، موٹے موٹے بوٹ، بند بٹنوں والا جے پوری کوٹ، بال دار ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور گلے پر مفلر لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے کاندھے پر بندوق بھی لٹک رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں ڈی. پی. ہوں۔'' اس وقت میرے لیے اس بات کا کوئی مطلب نہ تھا مگر سری نگر تک کے راستے میں اس نے اپنا مکمل تعارف دیا کہ وہ ڈی. پی. دھر تھا، شیخ عبداللہ کے نوجوانوں میں سے ایک۔ غالباً اس کو درجنوں کام کرنا ہوتے تھے۔ وہ کشمیری ملّاحوں اور کسانوں کو فوجی سکھلائی دیتا تھا جو ان گھُس پیٹھیوں کو تلاش کر سکیں جو ابھی بھی وادی میں گھوم رہے تھے۔ یہی نہیں اس کو ان عالموں کی خاطر داری بھی کرنا ہوتی تھی جو ہر روز وادی میں آ رہے تھے۔ ''تین نمبر گیسٹ ہاؤس پہلے ہی سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں پر تقریباً بیس عالم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مگر کوئی بات نہیں۔ ہم آپ اور آپ کے بعد آنے والوں کے لیے دوسرا شاہی گیسٹ ہاؤس کھلوا دیں گے۔''

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ کا پڑھا ہوا تھا (مطلب ہلکا سا کشمیری لہجہ) اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا رُکن تھا اور سردار جعفری کا دوست تھا۔ سردار کے بارے میں اس نے خواستگاری سے بہت کچھ پوچھا۔

آخرش اس نے افشا کیا کہ وہ شیخ عبداللہ کی کابینہ میں نائب وزیرِ داخلہ تھا۔ مجھے پھر ایک بار اسپین یاد آ گیا جہاں پر فسطائیت کے خلاف دلیرانہ (مگر افسوس مایوسانہ) جدوجہد کے دوران ذی فہم نوجوانوں کو وزارتی عہدوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور وہ بندوقیں لے کر گھومتے تھے۔

گیسٹ ہاؤس نمبر ایک، شاہی محل جیسا تھا۔ جس کمرے میں مجھ کو ٹھہرایا گیا، وہاں مجھ سے پہلے (اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے) مہاراجہ پٹیالہ ٹھہرے تھے۔

شام کو ڈی. پی. جیپ میں سوار ہو کر آیا تو یہ کچھ غیر متوقع سا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ انقلاب کا وقت ہے۔ مہاراجہ فرار ہو گیا ہے اور حکومت عوام نے سنبھال لی ہے۔ چلیے میں آپ کو دوسرے گیسٹ ہاؤس لے چلتا ہوں۔ وہاں پر آپ کے دوسرے ادیب دوست قیام پذیر ہیں۔ پھر میں اپنے کام پر نکلوں گا۔''

میں نادانی میں پوچھ بیٹھا۔ ''کس کام پر؟''

''شکار پر۔'' اس نے اپنی بندوق تھپتھپاتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ''بخشی صاحب کے ساتھ نکلوں گا۔ ہم نے سُنا ہے کہ حملہ آور ہوائی اڈّے کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔''

ابھی برف باری شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے جیپ میں بٹھا کر شبنم آلودہ زمین پر سے دوسرے گیسٹ ہاؤس لے گیا۔ وہاں پر درجن بھر یا شاید اس سے بھی زیادہ ادیب آتش دان کے گرد جمع تھے۔ رامانند ساگر (جو اَب کامیاب فلم پروڈیوسر بن چکے ہیں) تھے، جو ان دنوں تقسیم سے متعلق اپنا ناول ''اور انسان مر گیا'' مکمل کر رہے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی تھے، جو اپنی رزمیہ کہانی ''نمک'' اور کشمیر کی زندگی میں اس کی اہمیت پر مواد جمع کر رہے تھے۔ مسز چندرا کرن سونریکسا تھیں، جو ایک افسانہ نگار تھیں مگر اب ناول لکھ رہی تھیں۔ پنجابی کے افسانہ نگار اور مشہور پنجابی ادیب گوربخش سنگھ پریت لڑی کے فرزند نوتیج سنگھ تھے۔ شیر سنگھ (یا غالباً شیر جنگ) تھے جو جنگجو بھی تھے اور ادیب بھی۔ وہ فساد زدہ دلّی میں جیپ لے کر نکلتے تھے اور دیکھتے ہی کسی بھی آتش زن کو، فسادی کو یا قتلِ عام پر آمادہ کسی بھی شخص کو گولی مار دیتے تھے۔ سسرال کی طرف سے بلراج ساہنی کے بھتیجے راج ہنس کھنّہ تھے، جو ذی فہم بھی تھے اور بائیں بازو کے حامی بھی۔ وہ کشمیری نیشنل ملیشیا کے صدر تھے اور اپنی فوج کی ذمہ داریوں سے رخصت لے کر ایک شام ادیبوں کے ساتھ گزارنے کے لیے آئے تھے۔

یہاں کا ماحول اسپین اور انٹرنیشنل بریگیڈ کی یاد دلا رہا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ادیب اپنی کتابیں جینے آئے ہیں اور شاعر اپنی شاعری کے لیے مرنے آئے ہیں۔ ان ادیبوں کی خالقیت میں چھوت کی تاثیر تھی اور میں نے جلد بازی میں وعدہ کر لیا کہ کل شام کو اپنی کہانی سُناؤں گا۔ جب میں پیدل اپنے گیسٹ ہاؤس لوٹ رہا تھا تو موسم کی اوّلین برف باری ستاروں کی جگمگاتی روشنی میں زمین پر بچھا ہوا سفید قالین دِکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت میں نے طے کیا کہ میں چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت میں اپنی کہانی مکمل کر لوں گا اور کل اپنے ادیب دوستوں کو سُناؤں گا۔ کہانی کا عنوان ''سردار جی'' تھا۔ اس کہانی نے ایک غلط فہمی کی بنا پر مجھے مقدمے بازی اور دیگر کئی جوکھموں میں ڈال دیا۔ لیکن اس وقت یہ واقعات بہت دور تھے، مستقبل کے پردے میں تھے۔ اگلی رات تک کہانی مکمل کر کے اور قدر افزا دوستوں کے گروپ کو سُنا کر مجھے بڑا تخلیقی سکون حاصل ہوا۔ ان سب نے، خاص طور پر راجندر سنگھ بیدی، نوتیج سنگھ اور فوٹو گرافر گورمیت سنگھ جیسے سکھ دوستوں نے، اسے خوب پسند کیا۔ نشست کے اختتام پر ایک نوجوان فوجی افسر نے مجھ سے کہا۔ ''کہانی بہت اچھی ہے۔

انسانیت کا پیغام دینے کے لیے بہت پُر تاثیر ہے لیکن اگر آپ کی جگہ یہ کہانی میں نے لکھی ہوتی تو میں کئی برسوں تک اسے شائع نہ کرتا۔'' کاش! میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا ہوتا۔

ڈی. پی. اور نیشنل کانفرنس کے ایک گاندربلی کارکُن کی خوش خُلقی کی بدولت خوش قسمتی سے مجھے اُڑی محاذ پر جانے کا موقع مل گیا۔ یہ محاذ پاکستان کی اگلی صفوں سے تقریباً ایک میل کے اندر اندر تھا۔ سفر کے دوران ہم بارہ مولا سے بھی گزرے۔ یہ شہر کبھی ایک اقبال مند شہر ہوتا تھا مگر ہم کو اس کے کھنڈرات ہی دیکھنے کو ملے (مع اس خانہ گرجا کے جو اَب شکستہ حال تھا)۔ ہمیں وہ جگہ بھی دِکھائی گئی جہاں پر نیشنل کانفرنس کے شیر دل نوجوان مقبول شیروانی کو اذیت پر اذیت دے کر گولی ماردی گئی تھی۔

اس وقت دائرۂ اُڑی انتہائی پُر تپاک اور مساعد افسر بریگیڈیر (ازاں بعد جنرل) سین کے ماتحت تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ہمیں کچھ فوجی جوانوں کے ساتھ وہ جگہ دیکھنے کے لیے بھی بھیجا جہاں گذشتہ شب فوجوں کی جھڑپ ہوئی تھی۔ کچھ پاکستانی حملہ آوروں کی لاشیں ابھی بھی وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں تین لاشیں صوبہ سرحد کے ان تین بے خبر قبائلیوں کی تھیں جن کو غوغائے جہاد مرنے کے لیے یہاں لے آیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہندستانی سپاہی ان کو پاکستانی نہ کہہ کر ''مُسلے'' کہہ رہے تھے۔ اس لفظ کے صحیح معنوں سے وہ قطعاً بے بہرہ تھے۔ آخر یہ جنگ ان کشمیری عوام کی امداد واعانت سے لڑی جارہی تھی جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور جو اپنے زبردست رہنما شیخ عبداللہ کے طفیل پاکستان مخالف تھے۔ یہ وہ جنگ تھی جس میں یہاں سے چند میل کی دوری پر مقبول شیروانی نام کے ایک مسلمان نے اپنا سیکولر اور ہندستان حامی وتیرہ ترک کرنے پر موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے بریگیڈیر سین سے اس معاملے پر بات کی۔ اس نے اپنی معذوری کا اظہار کردیا۔ اصل میں اس کا کہنا تھا کہ ''سیکولرزم کے بنیادی اصولوں سے نابلد اُن فوجیوں کی ذہنیت تبدیل کرنا آسان نہیں ہے۔'' میرا جی چاہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ پھر یہ جنگ کس لیے ہورہی ہے؟ میں ایک ''مُسلا'' یہاں پر کیا کررہا ہوں؟ لیکن میں نے اپنا منہ بند رکھنا ہی بہتر سمجھا اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا کہ جب بھی کبھی اس سلسلے میں جواہر لعل نہرو سے بات کرنے کا موقع ملے گا، یہ سب میں ان کے گوش گذار کروں گا۔

ہم نے دوپہر کا کھانا ایک میوہ باغ میں بیٹھ کر کھایا۔ وہاں پر سیبوں کی ڈالیاں اس قدر زمین پر جھکی ہوئی تھیں گویا سیب توڑنے کی دعوت دے رہی ہوں۔ شاید عین اسی وقت ہم کو پاکستانیوں

نے اپنی دوربینوں کے ذریعے سے دیکھ لیا تھا اور دو مورٹار گولے خطرناک حد تک ہمارے نزدیک آ کر گرے۔ یہ حقیقی جنگ تھی اور ہم سب اسی طرح جاں بحق ہو سکتے تھے جس طرح ایک دوسرے دائرے میں بریگیڈیر عثمان کو جاں بحق ہونا پڑا تھا۔ عثمان ایک انتہائی اہم مسلمان تھا، جس نے سیکولرزم اور کشمیر کے لیے اپنی جان قربان کی تھی۔ بہرحال اس وقت مجھے موت کا ڈر نہیں تھا۔ یہ اس وقت کی صحبت کا اثر تھا— مرگِ انبوہ جشن نہ دارد— یا مجھے بہادری کی چھوت لگ گئی تھی؟ بہرحال جب ہم سانپ کی طرح بل کھاتی تیکھے موڑوں والی سڑک پر سے ہو کر سری نگر پہنچے تو ہم نے جنگ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہماری جیپ کے کسی کھڈ میں گر جانے کا خطرہ پاکستانی مورٹار گولے سے پیدا ہونے والے خوف سے کہیں زیادہ فی الفور تھا۔

اس رات کو، اور بعد کی کئی راتوں کو بھی، میں اور ڈی. پی. اس پر تبادلۂ خیال کرتے رہے کہ اگر رائے شماری کا موقع آتا ہے تو اس میں کامیابی کے کتنے امکانات ہیں۔ ڈی. پی. نے مجھ سے پوچھا کے میرے خیال میں کتنے امکانات ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت یقیناً سری نگر کا ماحول پاکستان کے خلاف ہے۔ میں کشمیری دست کاروں، ملاّحوں، چاول کی کھیتی کرنے والے کسانوں اور بوجھا ڈھونے والوں سے بات کر چکا تھا۔ وہ سب تقریباً مسلمان تھے اور حملہ آوروں کے تعلق سے ان سب کے تجربات ناخوشگوار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حملہ آوروں کو کچھ معلوم نہیں ہے، وہ بدہیئت واہمہ میں غلطاں ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس کی تصدیق کر سکتا تھا چوں کہ میں سری نگر جیل میں ایک حملہ آور سے مل چکا تھا۔ اسے نہ لکھنا آتا تھا، نہ پڑھنا۔ وہ صرف اتنا بتا رہا تھا کہ اسے کشمیری مسلمانوں کو مہاراجہ کے مظالم سے بچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ اب یہاں پر کوئی مہاراجہ نہیں ہے اور سری نگر میں اب کوئی بڑا آدمی ہے تو وہ شیخ عبداللہ ہے تو وہ افسردہ ہو کر خاموش رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے شیخ صاحب کا نام تک نہیں سُنا تھا۔

''اگر رائے شماری ہونی ہے اور اگر میں جیسا دیکھ رہا ہوں کہ پنڈت جی بین الاقوامی رائے کے سامنے اس کی یقین دہانی کر چکے ہیں تو ہندستان کو ایک ماہ کے اندر اندر رائے شماری کرا دینی چاہیے۔'' یہ میری ذاتی رائے تھی جس کا اظہار میں دوستوں کے درمیان کر سکتا تھا۔ ''ہندستان کو جلد کوئی تاریخ طے کر کے پاکستان کو آخری تنبیہ کر دینی چاہیے کہ وہ مقبوضہ علاقے سے دست بردار ہو جائے اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو نتیجے اسی کو بھگتنے ہوں گے۔ فیصلہ جو بھی ہو، رائے شماری ہندستان کرائے گا اور ساری دنیا کو اس کا نتیجہ بتا دے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ہم خطا کھائیں گے۔ بس شرط یہ ہے کہ ہم پھرتی سے کام کریں اور ''اسلام خطرے میں'' کا نعرہ بلند نہ ہونے دیں۔''

ڈی. پی. نے غور وفکر کے بعد کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اسی طرز پر سوچ رہے ہیں۔ کیا شیخ صاحب سے بات کریں گے؟ اور اگر وہ متفق ہوں تو کیا آپ دلّی جا کر پنڈت جی کو یہ تجویز پیش کریں گے؟''

مجھے پنڈت جی سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ تاہم میں اوکھلی میں سر دینے کو تیار تھا۔

ڈی. پی. نے اگلے روز ہی شیخ صاحب کے ساتھ ملاقات طے کر دی۔

شیخ عبداللہ ایک بڑے سے دربار میں گھرے ہوئے تھے جس میں کسان، ملّاح، مچھوارے، دستکار موجود تھے۔ ان کے گھر میں ہر کوئی بلا تکلّف چلا آتا تھا۔ وہ لوگوں کو اس زمانے سے جانتے تھے جب وہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ لوگ بھی ان کو جانتے تھے اور ان کے درمیان ایک جمہوری رابطہ قائم تھا۔ وہ پنج وقتی نمازی تھے اور اسی سے ان کی قیادت کو ایک مضبوط بنیاد ملی ہوئی تھی۔ کشمیری مسلمان بنیادی طور پر مذہب پرست ہیں۔ یہ ایک کرشمہ ہی تھا کہ شیخ عبداللہ نے ان کو باور کرا دیا تھا کہ ان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنے ہندو ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور اس طرح سے انھوں نے اپنی جبلی مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر کے ان کو سیکولرزم کی طرف راغب کر دیا تھا۔

نمازِ جمعہ کے بعد وہ اپنے خطبے میں ایک سوال کیا کرتے تھے۔ ''وقتِ ضرورت مہاراجہ کی طاقت سے بے پرواہ ہو کر ہماری مدد کو کون آیا تھا؟''

لوگ ایک ساتھ جواب دیتے تھے۔ ''جواہر لعل نہرو۔''

شیخ عبداللہ یہ کہہ کر اپنی بات ان کے ذہن نشیں کرا دیتے تھے۔ ''جنّاح صاحب نہیں آئے تھے۔ وہ مہاراجوں اور نوابوں کے ساتھ یاری بڑھانے میں انتہائی مصروف تھے۔''

شیخ صاحب سیدھے سادے آدمی تھے۔ کشمیریوں کے اوپری متوسط طبقے کا لباس پہنتے تھے۔ لوگوں سے ان کی اپنی زبان یعنی کشمیری زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لوگ ان سے محبت کرتے تھے، ان کی قدر کرتے تھے۔

جب میں داخل ہوا تو وہ لوگوں سے معذرت کر کے اُٹھے اور مجھے برامدے میں لے گئے جہاں پر سردیوں کی دھوپ کھلی ہوئی تھی۔

انھوں نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے خواجہ صاحب کہ آپ دوبارہ تشریف لائے ہیں۔'' ان کا اشارہ میرے اس دورے کی طرف تھا جب وہ جیل میں تھے۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہم آپ کی

خاطر داری ذرا بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔''

ڈی. پی. کو خدشہ ہوا کہ ہماری پُر تکلّف گفتگو کہیں طول نہ پکڑ لے، اس لیے اس نے کہا۔''رائے شماری کے تعلق سے خواجہ صاحب کے پاس کوئی تجویز ہے۔''

''اچھا۔'' شیخ صاحب نے مجھے اذنِ تکلّم دے دیا۔ انھوں نے تحمّل کے ساتھ میری بات سُنی اور میں نے بلا تاخیر رائے شماری کی اپنی تجویز پیش کی۔ میں نے کہا کہ رائے شماری کرانے کا یہی وقت ہے جب کہ وادی ''حملہ آور خبردار۔ ہم کشمیری ہیں تیار'' کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ اسے ملتوی نہیں کیا جانا چاہیے۔''

''میں نہ ہاں کہوں گا، نہ نہ کہوں گا۔ رائے شماری میں تاخیر کو لے کر پنڈت جی کے پاس کچھ اپنی وجوہات ہوں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے ان سے بات کی جائے۔ اگر چہ آپ نے بہت معقول بات کہی ہے لیکن میں ویسا ہی کروں گا جیسا میرا لیڈر مجھ سے کرنے کے لیے کہے گا۔''

جب مجھے اندر بھیجا گیا اس وقت پنڈت جی کھڑکی کے پاس اپنی میز پر کچھ کاغذات باندھ رہے تھے۔ باہر پہلے ہی اندھیرا ہو چکا تھا اور روشنیاں جگ چکی تھیں۔

''ہاں عبّاس، سری نگر سے کیا خبر لائے ہیں آپ؟ شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی؟''

میں نے کہا۔''جی ہاں، ہوئی۔''

''کیسے لگے وہ؟'' انھوں نے مزید پوچھا۔

میں نے مختصراً اپنے لوگوں کے رہنما کے طور پر شیخ صاحب کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کر دیا۔

رائے شماری کے موضوع پر گفتگو کرنے میں مجھے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی، اس لیے میں نے ان کو بتایا کہ ہندستانی سپاہی پاکستانیوں کو ''مُسلے'' کہہ رہے تھے۔

''ان کو فرق ہی معلوم نہیں ہے۔'' میں نے ذرا سی تلخی کے ساتھ کہا۔''ہم ان کو ایک طرح کی سیاسی تعلیم کیوں نہیں دیتے؟ ہر رجمنٹ کے ساتھ ایک سیاسی افسر ہونا چاہیے....''

''آپ کا مطلب ہے۔'' مجھے بیچ ہی میں ٹوک کر وہ بولے۔''ایک سیاسی ناظر، جیسا سوویت یونین میں ہوتا ہے؟''

''بالکل ویسا تو نہیں، لیکن... ہڑبڑاہٹ میں میری زبان لڑکھڑا گئی مگر انھوں نے مجھے تسکین دی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں عبّاس صاحب۔ لیکن ہمارے افسروں کی تربیت برطانوی طرز پر ہوئی ہے، وہ اسے پسند نہیں کریں گے۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی بار جب مجھے موقع

ملے گا تو میں فوجی جوانوں سے سیکولرزم کی بات کروں گا اور ان کو بتاؤں گا کہ کشمیر کے لیے جدوجہد میں اس کے کیا معنی ہیں۔ اس خاص سیاسی ناظر کی بات پر فوجی افسران احتجاج نہیں کریں گے۔''

اس میں مجھے وہ بات کرنے کا اشارہ مل گیا جو میں کرنے آیا تھا۔ ''آپ کو رائے شماری کے بارے میں جلد کوئی فیصلہ لینا ہوگا۔''

''کس رائے شماری کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

اب میری زبان نے الفاظ کی جھڑی لگا دی۔ میں نے ان کو بتایا کہ اب صورتِ حال موافق ہے۔ وادی کے لوگوں کو حملہ آوروں کے مظالم کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان کو یاد ہے کہ مقبول شیروانی کے ساتھ کیا کیا گیا ہے۔ وہ پاکستان کی طرف سے بھیجے گئے حملہ آوروں سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر رائے شماری جلد ہو جائے تو مٹھی بھر متعصّب مسلم لیگیوں کے علاوہ کوئی پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دے گا۔ ہندستان کے حق میں زبردست ووٹ پڑیں گے۔

جواہر لعل نے خاموشی سے میری بات سُنی۔ اس دوران وہ اپنے اسکریچ پیڈ پر پنسل چلاتے رہے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو بولے۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ میں مجلسِ وضعِ قوانیں میں واضح کر چکا ہوں کہ جیسے ہی کشمیر میں نظم ونسق بحال ہوگا اور سرزمینِ کشمیر حملہ آوروں سے پاک ہوگی، ریاست کے الحاق کا معاملہ وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جائے گا۔ ہم نے کہا ہے کہ اگر پاکستان سرکار مخلص ہے تو وہ حملہ آوروں کو کشمیر میں داخل ہونے سے روکے۔ جیسے ہی نظم وامن بحال ہوتا ہے، کشمیریوں کو فیصلہ کرنے دیجیے۔ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں میں اپنی زبان سے پھر جاؤں؟''

میں نے دلیل پیش کرنے کی کوشش کی کہ اب سوال حملہ آوروں کا نہیں ہے، مقبوضہ علاقے پاکستانی فوج کے قبضے میں ہیں۔

''وہ ہمیں معلوم ہے۔'' انھوں نے قدرے تولتے ہوئے کہا۔ ''یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ تجویز رکھی ہے کہ جب ریاست میں امن بحال ہو جائے، عوام کو موقع دیا جانا چاہیے کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں اور یہ اقوامِ متحدہ کے زیرِ نگرانی ہونا چاہیے۔''

میں نے کہنے کی کوشش کی کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کو اقوامِ متحدہ پر زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔

''تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟'' انھوں نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ پاکستان کو آخری تنبیہ کر دیں کہ آپ فلاں تاریخ کو رائے شماری کرا رہے ہیں اور اس تاریخ تک وہ تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا بوریا بستر باندھیں گے اور چل دیں گے؟''

''جی نہیں حضور۔ مگر نکتہ یہ ہے کہ آپ دنیا بھر کے سامنے اس کو ایک موقع تو دے دیں گے۔ اس کے بعد آپ جہاں پر بھی رائے شماری کرا سکتے ہیں، کرالیں۔''

''اور دنیا کو یہ کہنے کا موقع دے دیا جائے کہ ہندستان جھوٹا ہے، کہ نہرو اپنی بات سے پلٹ گیا ہے؟ نہیں عبّاس۔ رائے شماری کے لیے امن اور سکون کا ہونا ضروری ہے تاکہ لوگ سکون کے ساتھ ٹھنڈے دل سے دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکیں۔''

''معافی چاہتا ہوں جنابِ والا۔ میری سوچ یہ ہے کہ رائے شماری کی ضرورت وہیں پر ہوتی ہے جہاں پر امن وامان کا فُقدان ہوتا ہے۔''

میں نے سوچا میں نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ابھی گھنٹی بجائی جائے گی، پٹّی والے کو طلب کیا جائے گا کہ مجھے دھکّے دے کر باہر نکال دیا جائے۔ گھنٹی بے شک بجی۔ پٹّے والا حاضر ہوا۔ میں حکم جاری ہونے کا منتظر تھا کہ اسے اُٹھا کر باہر پھینک دو۔

مگر انھوں نے اپنے ملازم سے کہا۔ ''ہمارے لیے کچھ چائے وائے لاؤ میاں۔''

پھر انھوں نے میری تشفّی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''جانے سے پہلے ایک کپ چائے لے لیجیے۔ مجھے نوجوانوں کے اندر جوش کا ہونا اچھا لگتا ہے لیکن میں اپنی زبان سے نہیں پھر سکتا۔ اگر میں پھروں گا تو لوگ کہیں گے کہ ہندستان کا وزیرِ اعظم یقین کرنے کے لائق نہیں ہے۔ وہ شریف آدمی نہیں ہے۔''

اس موضوع پر میں نے مزید کچھ نہ کہا۔ میں نے افسردہ خاموشی کے ساتھ چائے ختم کی، جب کہ جواہر لعل نے کہا کہ ''کشمیر میں شیخ صاحب اور دوسرے لوگوں سے میرا سلام کہنا۔'' آخر میں نے ان سے اجازت مانگی۔ انھوں نے قدرے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔

جیسے ہی میں موسمِ سرما کی ٹھنڈی ہوا میں باہر آیا، میں اس خیال سے کانپ اُٹھا کہ مکّار لوگوں کی اُس دنیا میں یہ ایک اکیلا شریف آدمی ہے، جس میں شریف آدمی ہونا پُرخطر ہے۔

میں آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس وقت رائے شماری کرا دی گئی ہوتی تو ہندستان کئی مصیبتوں سے بچ گیا ہوتا۔ تاہم میں اس شخص سے محبت کرنے اور اس کی تعریف کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا جس نے شریف آدمی بننا ہی بہتر سمجھا تھا۔

❑❑❑

(الف/ب) جاوید احمد خورشید
(ج) صبا کرام
(د) احمد علی جوہر

کتاب اور صاحبِ کتاب

دو تبصرے: ایک مبصر

(الف) **امیر اللّغات** (جلد سوم)، مولّف: امیر احمد امیر مینائی،
مدوّن: ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ، مبصّر: جاوید احمد خورشید

مخطوطات یا قلمی نسخوں کی تدوین کوئی آسان کام نہیں۔ یہی کام تدوینِ لغت کی صورت میں مشکل تر ہو جاتا ہے یعنی لغت کے مدوّن سے مطالبات کسی بھی قلمی نسخے کی بابت ہوش رُبا ہیں۔ تدوینِ لغت کا کام وہ افراد بہ سہولت انجام دے سکتے ہیں جن کو اس دائرۂ علم سے طبعی مناسبت ہے۔ اس مختصر سے تعارف میں 'امیر اللغات' (جلد سوم) مولفہ امیر احمد امیر مینائی کی تدوینی خوبیوں کی جانب اشارہ مقصود ہے۔

لغتِ مذکور کے فاضل مدوّن ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ ہیں جن کی تدوین ان اہم چیزوں سے عبارت ہے: املائی تغیرات کی نشان دہی، معنی میں در آنے والی تبدیلیوں کی صراحت، متن میں موجود نامانوس الفاظ کی صراحت، الفاظ، محاوروں، روزمرہ، کہاوتوں کے مابین باریک باریک فروق کی نشان دہی، ترتیبِ الفاظ کے ڈھب کی نشان دہی، مولف کے تسامحات کی نشان دہی، مولف کے بیانات یا حواشی کی تنقیح، قاموسی لغت اور عام لغت کی حدود کا تعین، مولف کی فراہم کردہ شعری اور نثری اسناد کی تصحیح، دیگر معتبر لغات سے تقابل اور اختلافات کی صراحت، وزن، بحر اور دیگر

عروضی تسامحات کی نشان دہی، قواعدی صراحتیں، درست صیغوں کی نشان دہی، مولف کی ترمیمات اور تصحیحات پر قیاسی رائے اور مولف کے حوالے سے دیگر مضامین نگاروں کے بیانات کا محاکمہ۔

ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ نے امیر اللغات (جلد سوم) کو جس دقتِ نظر سے مدوّن کیا ہے اس کے بعد اس کام کو تدوینِ لغت کے موضوع پر راہ نما کتاب (manual) کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے یعنی جس کے مطالعے کے بعد اب اردو میں تدوینِ لغت کے کام زیادہ سلیقے اور جدید تقاضوں کے مطابق انجام پاسکتے ہیں گویا تدوینِ مذکور کو نشانِ منزل کی اہمیت حاصل ہے۔ اردو متون کی تدوین میں اب اس نوع کی عرق ریزی کم یاب ہے۔

فاضل مدوّن کے تحریر کردہ پاورقی حاشیے ان کی لغت اور تدوینِ لغت جیسے اہم موضوعات سے قریب کی نسبت کا مظہر ہیں۔ ان پاورقی حاشیوں کی نوعیتیں رنگا رنگ ہیں جنھیں اس تعارف میں علاحدہ علاحدہ اختصار سے پیش کیا جائے گا۔ تقریباً ہر صفحے پر مدون نے اہم حاشیے رقم کیے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ امیر اللغات کا مقدمہ از مدوّن صحیح معنوں میں نہ صرف امیر مینائی بہ حیثیت لغت نویس کے احاطہ کرتا ہے بلکہ یہ مقدمہ لغت کی حدود اور دیگر اہم موضوعات پر بھی تلاش و تفحص کا مظہر ہے۔ امیر مینائی کے اس کام کو جس سلیقے سے مدوّن کیا گیا ہے اس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں لغت کے موضوع پر ایک ایسے کام کی دستاویز سامنے آسکی ہے جسے اس موضوع پر اہم اضافے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اردو کا دائرۂ نظم و نثر اس کے بعد لازمی طور پر متمول ہوا ہے۔ تحریر کردہ حواشی کے مطالعے سے بار بار احساس ہوتا ہے کہ فاضل مدوّن کو لغت سے کس قدر قریب کی مزاجی نسبت ہے۔

'امیر اللغات' کی تیسری جلد کے مسودے کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ 'فصل بائے موحدہ' کی سرخی کے بعد 'فصل بائے موحدہ مع الف' کی سرخی ہے۔ اس کے بعد اندراجات ہیں۔ پہلا اندراج 'باایں ہمہ' کا ہے اور آخری اندراج 'بیہڑ' کا ہے۔ امیر نے کہیں کہیں وضاحتی حاشیے بھی لکھے ہیں جو من و عن شامل ہیں اور ان کے آخر میں قوسین میں 'امیر' لکھا ہے تاکہ مدوّن کے حواشی سے ممیّز رہیں۔ مدوّن کے حواشی کے بعد قوسین میں 'مرتب' لکھا گیا ہے۔

323 صفحات پر مشتمل امیر اللغات کی جلد سوم کو شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور نے 2010 میں شائع کیا ہے۔ لغتِ مذکور کا انتساب نبیرۂ امیر مینائی جناب اسرائیل احمد مینائی کو معنون ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: 'جناب اسرائیل احمد مینائی صاحب کے نام جن کے تعاون کے بغیر اس کتاب کی تدوین و اشاعت ناممکن تھی'۔ 'پیشِ گفتار' کے عنوان سے ڈاکٹر تحسین

فراقی صاحب کی تحریر موجود ہے۔لغت کے آخر میں دو نادر خط شامل ہیں۔ایک خط (30 اگست 1888) شبلی نعمانی کا ہے جو انھوں نے امیر اللغات کے نمونے کی اشاعت کے بعد امیر کو لکھا تھا۔ دوسرا خط (3 مارچ 1895) خود امیر کا ہے جو مدیر 'اودھ پنچ' (لکھنؤ) منشی محمد سجاد حسین لکھنوی کے نام ہے اور اس میں 'امیر اللغات' میں بعض الفاظ و محاورات کو شامل کرنے سے قبل امیر نے کچھ استفسار کیے تھے۔ان خطوط کے بعد 'فصل بائے موحدہ مع الف' کے دو صفحات کا عکس شامل ہے۔اس کے بعد شبلی نعمانی کے خط کا عکس اور منشی سجاد حسین کو موسوم امیر کے خط کا عکس موجود ہے۔

پاریکھ صاحب نے امیر کی جلد سوم کی تدوین میں جن امور کا خاص خیال رکھا ہے انھیں درج ذیل سرخیوں کے تحت رقم کیا جاتا ہے۔سرخیوں کی صراحت میں لغتِ مذکور سے اقتباسات مع صفحہ نمبر درج کیے گئے جو مدوّن کی عرق ریزی کا ثمر ہیں۔

املائی تغیرات کی نشان دھی:

اس ضمن میں لفظ 'بابرنگ' کے حوالے سے مدون لکھتے ہیں کہ اس لفظ میں دوسری 'ب' مکسور اور 'ر' مفتوح ہے نیز اس کا املا/ تلفظ باوبڑنگ، باوبڑنگ، باوبرنگ اور بائے بڑنگ بھی کیا جاتا ہے۔(ص24) مدون نے ایک اور جگہ املے میں تغیر کو موضوع بنایا ہے۔لفظ 'کوتاہ' بالعموم اسی طرح لکھا جاتا ہے۔مدون نے اس لفظ کے ایک املا 'کوتہ' کی جانب بھی راہ نمائی کی ہے (ص33)۔ درج ذیل شعر میں لفظ 'کوتاہ' کے املا میں اختلاف پر حاشیہ لکھا ہے:

کوتہ ہوا تھا قصہ خط آنے سے یار کے
کھلوا کے ہم نے زلف کو ناحق بڑھائی بات (سوداؔ)

ایک اور جگہ املائی تغیر کی صراحت کو اس طرح درج کیا ہے: املا 'باڑھ' کے بجائے 'باڑ' دیا ہے۔ قافیے کی مجبوری سے قطع نظر 'باڑھ' کا ایک املا 'باڑ' بھی ہے اور 'نور اللغات' کے مطابق دہلی میں 'باڑ' اور لکھنو میں 'باڑھ' بولتے ہیں جیسا کہ امیر نے بھی اس لفظ کے معنی اور اسناد کے اختتام پر وضاحت کی ہے (ص62)۔ بائب کا ایک املا بایب بھی ہے۔ ملاحظہ ہو 'اردو لغت تاریخی اصول پر' (ص92)۔بائب 1۔گوشۂ شمال و غرب کا نام ہے۔2۔بے ٹھکانے، راہِ مقصود سے الگ۔

بچکانا کا ایک املا بچکانہ بھی ہے۔(ص111) 'کلنک' اور 'کلنگ' دونوں املا لغات اور اسناد میں ملتے ہیں (ص126)۔امیر نے 'بدنامی کا ٹیکا لگنا/بدنامی کا طوق گلے میں پڑنا' کی صراحت میں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے: ہمیشہ کے لیے رسوائی ہونا، کلنگ کا ٹیکا لگنا۔

قفلیاں: اصل میں قفل سے قفلی ہی تھا جو بگڑ کر قلفی ہو گیا اور اب قلفی ہی درست سمجھا جاتا ہے

لیکن [اس] نسخے مین قفلیاں ہی ہے۔(ص144)

معنی میں در آنے والی تبدیلیوں کی صراحت:

امیر نے لفظ 'بابن' کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے: انگریزی (صحیح بابن) مونث۔ باریک فیتا جو مختلف رنگوں کا ہوتا ہے اکثر شال کے کنارے اور سپاہیوں کے کوٹ میں ٹانکا جاتا ہے۔' اس ضمن میں امیر اللغات کے مدون یہ معلوماتی حاشیہ لکھتے ہیں: یہ انگریزی لفظ bobbin ہے اور اس کے معنی ہیں دھاگہ وغیرہ لپیٹنے کی ریل لیکن اردو میں ان معنوں میں بھی مستعمل تھا جو امیر نے بتائے ہیں۔(ص24)

چکلا/چکلہ اس زمانے [یعنی امیر کے] میں جاگیر، علاقے اور صوبے کے معنوں میں اور چکلہ دار صوبے دار، علاقے دار یا جاگیردار کے معنوں میں بھی رائج تھا۔ چکلہ کے معنی کسبیوں کا محلّہ اور چکلا دار کے معنی کسبیوں کے محلے کا داروغہ یا دیوث بھی تھے۔(ص89)

متن میں موجود نامانوس الفاظ کی صراحت:

امیر نے 'باگ چھوڑنا' کی صراحت کے بعد اس مرکب کو فقرے میں استعمال کر کے دکھایا ہے۔ فقرہ: باگ چھوڑ دی اور سرپٹ پر رکھ لیا۔ 'سرپٹ' کے بارے میں مدون نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''گھوڑے کی چال ہے جو تیز ہوتی ہے''۔(ص72)

امیر نے 'بجالانا' کا ایک مفہوم 'ادا کرنا' بھی درج کیا ہے۔ اس کی سند میں ناسخ کا یہ شعر رقم کیا:

کھڑے ہوتے تھے جلد تعظیم کو بجا لاتے تھے داب تکریم کو

فاضل مدون نے 'داب' کے معنی کی صراحت کو ضروری سمجھا ہے۔ حاشیے میں اس لفظ کے معنی یہ تحریر ہیں: داب بہ معنی انداز، طور، طریق، ڈھنگ (ص104)

امیر نے لفظ بچکانا کا ایک مفہوم 'کم سن لڑکا' اور 'خواجہ سرا یا کھک' درج کیا ہے۔ کم سن لڑکے کی سند میں فقرہ ملاحظہ کیجیے: ایسی بھیڑ میں اس بچکانے کو کہاں ساتھ لے جاؤ گے۔ مدون نے کھک کے بارے میں لکھا ہے کہ 'غالباً کھگ جو ہم جنس کے معنی میں آیا ہے۔(ص111)

امیر نے 'بچھوا' کی صراحت میں لکھا ہے کہ 'ایک زیور کا نام جو ہندنیاں پاؤں کی انگلیوں میں پہنتی ہیں۔ بحرؔ کا یہ شعر اس ضمن میں درج ہے:

پیٹ کے پاؤں نکالے ہیں کچھ اب تو تم نے چھولیا ہم نے جو انوٹ کو تو بچھوا کھینچا

مدون نے درست طور پر امیر اللغات (جلد سوم) کے قاری کی توجہ لفظ 'انوٹ' کے معنی کی جانب دلائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ 'انوٹ: پاؤں کے انگوٹھے میں پہننے کا زیور۔(ص114)

امیر نے 'بچھیرا' کے معنی کی صراحت میں لکھا ہے کہ 'گھوڑے کا نر بچہ'۔ اور مصحفی کا یہ شعر سند میں درج کیا ہے:

دل میں عاشق کے چبھے خار تری مژگاں کے تھا یہ ناکند بچھیرا تہہ مہمیز آیا

مدون نے ناکند کی تصریح اس طرح کی ہے: ''گھوڑے کا بچہ جس کی عمر ایک برس تک ہو'' (ص114)۔ امیر نے 'بدھنا' کی صراحت اس طرح کی ہے: مٹی کا لوٹا۔ اور جان صاحب کا یہ شعر درج کیا ہے:

دلوایا شب برات میں مردوں کا فاتحہ لوٹے گھڑے پہ بدھنے پہ مٹکے مٹھور پر

مدون نے لفظ 'مٹھور' کی صراحت کی ہے: 'مٹکے کی شکل کا مٹی کا برتن جس میں نیچے سے اناج نکالنے کے لیے سوراخ ہوتا ہے۔ شراب کے مٹکے یا تیل وغیرہ رکھنے کے تغار کو بھی کہتے ہیں''۔ (ص129)

مولف کے حوالے سے دیگر لکھنے والوں کے بیانات کا محاکمہ:

اس ضمن میں مدون کا بیان ہے کہ 'جن حضرات نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ امیر اللغات بڑے 'سائنٹفک' انداز میں مرتب کی گئی ہے انھوں نے شاید اس کی دوسری جلد (اور اب تیسری جلد بھی) کے اندراجات کی ترتیب پر غور نہیں فرمایا۔ تعجب ہے کہ امیر اللغات کی پہلی جلد میں تو بالعموم تحتی مرکبات کا خیال رکھا گیا ہے لیکن دوسری جلد میں امیر نے بعض دوستوں کے کہنے پر صحیح ترتیب کو بدل دیا اور تحتی یا ذیلی مرکبات کی ترتیب کو نظر انداز کر کے صرف حروفِ تہجی کو پیشِ نظر رکھا۔ حالانکہ ان کے سامنے 'فرہنگِ آصفیہ' کا نمونہ بھی موجود تھا اور پھر ایک جلد کی اشاعت کے بعد اس طرح کی تبدیلی قطعی نامناسب تھی۔' (ص143)

ایک ہی لفظ کے مختلف معنی کے مابین فرق کی وضاحت جیسے کا واک۔ فارسی میں اس کے معنی کھوکھلا اور اردو میں بے ڈول کے ہیں۔

مولف کے تسامحات کی صراحت:

مدخل (headword) بات کی ایک شق کے تحت امیر نے اس لفظ کے معنی میں 'شیر خوار بچے' رقم کیا ہے جس کے بارے میں مدونِ امیر اللغات لکھتے ہیں کہ انگریزی میں اس کے معنی 'نومولود' کے ہیں نا کہ 'شیر خوار بچہ' کے۔ (ص23)

امیر نے اس محاورے کی صراحت کی ہے: بات دل سے دھوڈالو۔ مدون نے حاشیے میں لکھا ہے کہ 'یہ اندراج 'بات' کے بجائے 'یہ' کے ذیل میں ہونا چاہیے (ص93) یعنی 'یہ بات دل سے دھوڈالو'۔

'امیر اللغات' کی (جلد سوم) میں الفاظ کے استعمال کی اسناد میں اشعار رقم ہیں۔ 'باتوں

باتوں میں' کے لیے وزیر کا جو شعر رقم کیا ہے اس کے بارے میں مدون نے لکھا ہے کہ ''یہ شعر 'باتوں باتوں میں' کی نہیں بل کہ 'باتوں ہی باتوں' کی سند ہے'' (ص47)۔ وزیر کا شعر یہ ہے:

تم جو بولے ہو کیا ثابت دہن باتوں ہی باتوں میں عقدہ کھل گیا

امیر نے بدر کی صراحت میں لکھا ہے کہ 'ایک شہر کا نام ہے۔' اس پر مدون نے تصحیح کی ہے اور لکھا ہے کہ 'صحیح بیدر ہے جو دکن کا شہر ہے'۔ (ص121)

مفرد لفظ اور تحتی مرکبات کو لغت میں شامل کرنے کا ڈھب یعنی ترتیب الفاظ کی صراحت:

مدون لکھتے ہیں کہ 'امیر مینائی نے 'بات' کے سو(100) کے قریب معنی لکھے ہیں لیکن یہ تعداد کم ہوسکتی تھی کیوں کہ معنی کی کئی شقیں ایسی ہیں جو ایک ساتھ آسکتی تھیں۔ (ص26) مدون کا ماننا ہے کہ 'اصولاً 'باتیں' کا اندراج الگ ہیڈ ورڈ کے طور پر ہونا چاہیے اور 'باتیں' کے تحتی اندراجات الگ سے بھی بننے چاہییں۔ (ص39)

'بال سکھلانا یا سکھانا' لکھا ہے یعنی سکھلانا پہلے ہے لیکن ہم [مدون] نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب بدل دی ہے۔ (ص79)

مدون نے نشان دہی کی ہے کہ 'امیر نے ترتیب میں 'بالوشاہی' کو پہلے لیا ہے اور 'بالوساہی' کو بعد میں۔ ہم [مدون] نے بہ اعتبارِ حروفِ تہجی ترتیب قائم کی ہے۔ (ص82)

قاموسی لغت اور عام لغت کی حدود کا تعین:

اس ضمن میں مدون لکھتے ہیں کہ 'بابا فرید' جیسے اندراجات اصولاً انسائیکلو پیڈیائی لغت میں ہونے چاہییں۔ عام لغات میں اس طرح کے اعلام اور ان کی تشریح بالعموم نہیں دی جاتی (ص23)۔ ایک اور جگہ اس حوالے سے مدون نے لکھا ہے کہ 'بخارا' جیسے 'اندراجات لغت میں غیر ضروری خیال کیے جاتے ہیں تاوقت یہ کہ کوئی مجازی یا تلمیحی معنی نہ رکھتے ہوں یا کسی محاورے یا کہاوت میں باندھے گئے ہوں۔ ایسے اندراجات کا صحیح مقام دائرۂ معارف ہے نا کہ لغت۔ (ص116)

اضافہ شدہ الفاظ کو چوکور خطوط وحدانی [ ] میں رقم کرنے کی علت:

کسی قلمی نسخے میں مرتب یا مدون کچھ اہم اضافہ کرتا ہے جن کو چوکور خطوط وحدانی [] میں دیا جاتا ہے۔ امیر اللغات (جلد سوم) کے مدون لکھتے ہیں کہ 'یہ بات رکھ لینا' کی نہیں بل کہ 'بات رکھنا' کی سند ہے، اسی لیے چوکور خطوط وحدانی میں رکھنا کا اضافہ کیا گیا ہے (ص۴۰) یعنی 'بات رکھ لینا[/رکھنا]'

اشعار کے معاملے میں مستند دواوین سے استخراج:

امیر نے مدخل 'بات' کی اٹھارویں شق بہ طور 'نصیحت یا پند' کے حوالے سے سوز کا شعر دیا ہے جس کا مصرع ثانی اس طرح لکھا ہے: لگے ہے بات تری مجھ کو تیرسی دل میں۔ مدوّن نے اس مصرعے کی تصحیح اس طرح کی ہے: لگے ہے بات ترے دل کی تیرسی دل میں (دیوانِ سوز، ص185)۔(ص27)

وزن، بحر اور دیگر عروضی تسامحات کی نشان دھی:

امیر نے لفظ 'بادِ بہاری' کی ایک شق میں اس لفظ کو بہ طور 'بادشاہ کی سواری' کے مفہوم میں بھی لکھا ہے جس کے لیے جو شعری سند استعمال کی ہے اس کے بارے میں مدوّن نے لکھا ہے کہ اس مصرعے میں 'ایک' کے بجائے 'اک' ہونا چاہیے تاکہ مصرع بحر سے خارج نہ ہو۔(ص53) شعر یہ ہے:

عجب لوگ باد بہاری کے ہیں
یہ گل دستے سب ایک [کذا] کیاری کے ہیں (سحر)

ایک اور جگہ مدوّن امیر اللغات (جلد سوم) لکھتے ہیں کہ 'عجیب' کی بجائے 'عجب ہونا' چاہیے۔ موجودہ صورت میں مصرع خارج از بحر ہے۔(ص53) شعر ملاحظہ کیجیے:

بیان باد بہاری کا کیا تجمل ہو
جلوس کی ہے عجب شان کچھ عجیب [کذا] ہے بہار (قلق)

مدوّن نے لکھا ہے کہ 'غالباً حافظے کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ گو وزن پورا ہے لیکن غالب کا مصرع اصل میں یوں ہے: ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں (ص86) امیر نے شعر اس طرح لکھا ہے:

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں (غالبؔ)

قواعد سے آگاہی:

امیر نے 'باندھنوں باندھنا' کی صراحت طوفان جوڑنا، تہمت لگانا کے بہ طور کی ہے اور اسیر کا یہ شعر سند کے طور پر پیش کیا ہے:

گل رعنا کوئی کوئی گل صد برگ کہا ہے ہزاروں باندھنو بندھے ہیں اس دستارِ رنگین پر

اس ضمن میں مدوّن نے لکھا ہے کہ یہ سند 'باندھنوں باندھنا' کی نہیں بلکہ 'باندھنوں بندھنا' کی ہے۔ اصولاً اسے متعدی کے بجائے لازم کے ساتھ آنا چاہیے۔(ص87)

الفاظ کی صراحت میں درست صیغوں کی نشان دھی:

امیر نے لفظ 'برنگا' کی صراحت یوں کی ہے: پتلے اور چھوٹے تختے جس سے چھت پاٹی جاتی

ہے۔اس ضمن میں مدوّن نے یہ حاشیہ لکھا ہے: تشریح میں جمع کے صیغے (تختے) کے بجائے واحد (تختہ) ہونا چاہیے تھا اور جمع لکھی تھی تو 'جس' کے بجائے 'جن' بہتر ہوتا۔ (ص147)

لغات کے باریک باریک اختلافات پر نظر جیسے 'باتوں باتوں میں' اور 'باتوں ہی باتوں میں'۔ اسناد سے ظاہر ہے کہ 'بات پانا' کے علاوہ 'بات کو پانا' اور 'بات کو پا جانا' بھی لغات ہیں۔ (ص35)

ضرب المثل، کہاوتوں، محاوروں اور روزمرہ کے مماثلات کا حوالہ جیسے 'باٹ کی اینٹ چورا ہے کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا' یوں بھی مستعمل ہے: 'کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا'۔

قلمی نسخوں پر مولف اپنی یاددہانی کے لیے کبھی کبھی کچھ الفاظ لکھ لیتا ہے۔ مدوّن ان الفاظ کی نہ صرف حاشیوں میں نشان دہی کرتا ہے بلکہ اپنا قیاس بھی ظاہر کر دیتا ہے جو قاری کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مدوّن لکھتے ہیں کہ 'یہاں امیر مینائی نے پہلے شعر پر 'خ' اور دوسرے پر 'م' لکھا ہے۔ یہ غالباً 'موخر' اور 'مقدم' کی علامت ہے۔ اس کا استعمال امیر نے اور مقامات پر بھی کیا ہے ہم نے امیر کی ترجیح کے مطابق اشعار کو مقدم اور موخر کر دیا ہے۔ (ص27)

حضرت امیر نے یہ معنی [بات کا بتنگڑ کرنا] درج کرنے کے بعد سودا کا وہ شعر یہاں لکھا تھا جو اوپر 'بات کا بتنگڑ بنانا' کی سند میں آیا ہے لیکن پھر اسے یہاں سے قلم زد کر کے اوپر ہی درج کر دیا اور اس قلم زد شعر کی سیدھ میں بائیں ہاتھ کے حاشیے پر بہ طور یادداشت لکھ دیا 'شعر چاہیے' لیکن غالباً اس کا موقع نہ مل سکا۔ (ص41)

مدوّن کا استحقاق:

لغت کے متن کو درست انداز میں پیش کرنے کے لیے لغت کا مدوّن اپنی آرا کو رقم کر سکتا ہے بلکہ متن کی تصحیح پر بھی اسے استحقاق حاصل ہے۔ جہاں تک مولفِ لغت یعنی امیر مینائی کی الفاظ کے استعمال میں صراحتوں یا فقروں کو درج کرنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں درست یا نادرست کی رائے دینا مدوّنِ لغت کے دائرۂ کار سے اس لیے باہر ہے کہ ان فقروں کو صرف اور صرف الفاظ کے استعمال کی بابت رقم کیا جاتا ہے۔ امیر نے لفظ 'بہلاؤ' کی صراحت کے بعد یہ فقرہ درج کیا ہے: عورتیں مردوں کے دل کا بہلاؤ ہیں۔ اس پر مدوّن نے لکھا ہے کہ 'اس طرح کے خیالات ظاہر ہے کہ آج کے دور میں درست معلوم نہیں ہوتے'۔ (ص259)

اس لغت میں متعدد جگہوں پر پروف کی غلطیاں ہیں جنھیں آئندہ کی اشاعتوں میں درست کیے جانے کی امید ہے۔□□

(ب) کلکتہ میں اردو کے نادر ذخائر

مصنّف: معین الدین عقیل، مبصّر: جاوید احمد خورشید

معروف اسکالر پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کی نئی کتاب ''کلکتہ میں اردو کے نادر ذخائر: ایشیاٹک سوسائٹی اور نیشنل لائبریری کے اردو مخطوطات'' ہے جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ ۳۷۰ صفحات پر مشتمل کتاب مذکور کا آغاز 'ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ: مقاصد، قیام اور سرگرمیاں' کے عنوان سے موجود تحقیقی مقالے سے ہوتا ہے۔ اس مقالے کے بعد کتاب مذکور میں اردو مخطوطات کی تین فہرستیں شامل ہیں۔ ان فہرستوں کے مرتبین یہ ہیں: سید جمیل نقوی مرحوم، ایس. ایم. حسن اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ۔ ایس. ایم. حسن کی مرتبہ فہرست کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے جو Journal of the Asiatic Society کے شمارے ا-۴، جلد دہم، ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

سید جمیل نقوی مرحوم کی ۱۵۹ اردو مخطوطات پر مبنی فہرست بہ عنوان 'ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے اردو مخطوطات' کتاب مذکور میں شامل ہے جسے ۱۹۳۹ء میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں دو ضمائم ان عنوانات سے شامل ہیں: 'ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے اردو مخطوطات: ایک وضاحتی فہرست' از ایس ایم حسن اور 'ایشیاٹک سوسائٹی اور نیشنل لائبریری کے اردو مخطوطات' از شانتی رنجن بھٹا چاریہ۔ ایس ایم حسن کی فہرست میں ۳۷ اردو مخطوطات اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی فہرست میں ۱۳۴ + ۸۰ (۲۱۴) اردو مخطوطات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

ان فہرستوں کے توسط سے ایک جانب تو اردو کے کلاسیکی دور کے معروف نثر نگاروں اور شاعروں کے اردو مخطوطات سامنے آتے ہیں اور دوسری جانب فورٹ ولیم کالج اور دیگر مستشرقین کی وہ ادبی، سیاسی اور انتظامی حکمت عملیاں بھی سامنے آتی ہیں جن کے تحت عربی و فارسی متون کو اردو میں منتقل کرانے کی جستجو کی گئی۔ ان فہرستوں میں موجود جہاں اردو نثر و شاعری، تذکرے، فارسی و عربی ادب کے اردو تراجم، تاریخ، مذہب اسلام، مسائل تصوف، مسائل فقہ، کے معروف و کم یاب متون ملتے ہیں وہاں انیسویں صدی کے رنگا رنگ موضوعات پر قلمی نسخوں کا بھی پتا چلتا ہے جو اردو زبان، اس کے مختلف پیرائے اظہار، اصطلاحات اور دیگر

لسانی و تاریخی حوالوں سے اہم ہو سکتے ہیں۔ان رنگا رنگ موضوعات میں کچھ کی صراحت یہ ہے:

۱- 'خوان نعمت' از سید حمید الدین بہادری (مرقومہ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۴ء کے درمیان) ایک فارسی کتاب 'خوان الوان' کا اردو ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر گل کرسٹ کی ایما سے کیا گیا تھا۔اس میں انواع و اقسام کے کھانوں کی تیاری کا طریق کار اور اجزا کی تفصیل ملتی ہے (ص ۲۹)۔فہرست حسن (ص ۱۲۹) اور فہرست بٹھا چاریہ (ص ۱۴۳) میں اس کے مصنف کا نام حمید الدین بہاری درج ہے۔

۲- فہرست نقوی میں 'رسالہ راگ' از سور داس کے عنوان سے ایک اردو مخطوطے کے بارے میں معلومات درج ہیں۔مرتب نے اسے رقم کرنے کے سن کے بارے میں قیاس کیا ہے کہ اسے اٹھارویں صدی کے آخر میں لکھا ہوگا (ص ۷۹)۔فہرست حسن میں یہ عبارت بھی درج ہے: یہ بھاکا زبان میں نامعلوم مصنفین کی راگ اور راگنیوں پر ایک تصنیف ہے (ص ۱۳۸)۔فہرست بٹھا چاریہ میں اس کا اندراج تو موجود ہے لیکن دیگر معلومات نہیں ملتی۔ بٹھا چاریہ نے صرف یہ لکھا ہے کہ 'یہ موسیقی کے سلسلے میں ہے' (ص ۱۴۳)۔فہرست نقوی اور فہرست بٹھا چاریہ میں موسیقی پر 'سور ساگر' از سور داس کے عنوان سے بھی ایک مخطوطہ ملتا ہے۔فہرست نقوی میں سور داس کے بارے میں معلومات بھی ملتی ہیں (ص ۸۰)۔

۳- فہرست حسن میں 'رسالہ در بیان معدنیات' کے عنوان سے ایک اردو مخطوطے کی نشان دہی کی گئی ہے جس کے بارے میں لکھا ہے کہ 'یہ کیمیا پر ایک نوٹ بک ہے جس میں کچھ معدنیات جیسے سونا، چاندی، نانبا اور زنگ کے بارے میں معلومات درج ہیں۔فہرست نقوی میں اس کے مصنف کا نام بابو شب چند درج ہے ۔ اس مخطوطے کو ۲۱ دسمبر ۱۸۴۱ء میں لکھا گیا۔ترقیمے سے ظاہر ہے کہ اصل کتاب اعلیٰ ثانوی جماعت کی درسی کتاب ہے جو ۱۴۲ ابواب پر مشتمل ہے۔انگریزی اصطلاحات کو نستعلیق شکستہ آمیز خط میں لکھا گیا ہے (ص ۸۱)۔فہرست بٹھا چاریہ میں اس کے مصنف کا نام بابو شیب چندرا کرم کار ملتا ہے۔یہ کیمسٹری کے استاد تھے اور انھوں نے یہ طلبا کے لیے لکھا تھا۔اس کا سن فہرست بٹھا چاریہ میں یکم مارچ ۱۸۴۱ء درج ملتا ہے

(ص۱۴۳) جب کہ فہرست نقوی میں ۲۱ دسمبر ۱۸۴۱ء درج ہے۔فہرست حسن میں بھی اس کا سن ۱۸۴۱ء ہی درج ہے(ص۱۲۶)۔

۴- فہرست حسن میں 'فرس نامۂ رنگین' از سعادت یار خان رنگین کے عنوان سے ملتا ہے جس میں گھوڑے پالنے کے بارے معلومات درج ہیں۔اس میں مختلف گھوڑوں کی نسلوں اوران کی خصوصیات وغیرہ سے متعلق معلومات ملتی ہیں(ص۱۲۷)۔فہرست نقوی میں اس کا اندراج نہیں۔فہرست بھٹا چاریہ میں اس کا اندراج موجود ہے اوراس کے شاعر کا نام سعدات (کذا) یار خاں رنگین ملتا ہے۔(ص۱۴۵)

۵۔ فہرست حسن میں 'تاریخ غریبی' کے عنوان سے جو اردو مخطوطہ ملتا ہے وہ شاعری میں موجود دیو مالائی کہانیوں کا ایک انتخاب ہے۔اس کے مصنف کا نام نہیں ملتا ہے۔اس کی تاریخ کتابت ۱۱۱۴ء درج ہے۔اس کی زبان بھاکھا (کذا) ہے (ص۱۲۷)۔ فہرست نقوی میں اس کا اندراج نہیں۔فہرست بھٹا چاریہ میں 'تاریخ غریب' کا صرف عنوان درج ہے(ص۱۴۸)۔

۶- 'ترجمہ مفتاح الصلوٰۃ' از سید امام الدین واعظ (مرقومہ:۱۸۷۴ء) کا عنوان فہرست حسن میں ملتا ہے۔مخطوطے کے مترجم کو فقیر الہند کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ مخطوطہ فتح محمد محدث برہان پوری کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔اس میں مسلم قوانین کو موضوع بنایا گیا ہے۔مترجم نے یہ کام ۷۰ سال کی پختہ عمر میں کیا تھا(ص۱۳۰)۔فہرست بھٹا چاریہ میں 'ترجمہ مفتاح الصلوٰۃ' کے عنوان سے جو مخطوطہ موجود ہے اس کے مصنف کا نام سید ایمان الدین کامل درج ہے اور کیفیت میں یہ سن رقم ہے:۱۱۹۲ء(ص۱۴۲)

۷- فہرست نقوی میں 'ضرب الامثال' کے عنوان سے ایک اردو مخطوطہ ملتا ہے جو عربی و فارسی ضرب الامثال کا مجموعہ مع اردو ترجمہ ہے(ص۸۷)۔فہرست حسن میں اس کے بارے میں قیاس ملتا ہے کہ یہ کام فورٹ ولیم کالج کے لیے کیا گیا تھا(ص۱۳۶)۔ فہرست بھٹا چاریہ میں بھی اس کا اندارج موجود ہے لیکن اس میں بھی مصنف یا اسے رقم کرنے کی تاریخ درج نہیں(ص۱۴۳)۔

۸- عورتوں کے مسائل زندگی پر دکنی زبان میں ایک مختصر رسالہ 'احکام النساء' از غلام محمد ہے۔

اس کا مولف ٹیپو سلطان کے دربار میں قاضی کے عہدے پر فائز تھا (ص ۵۴)۔

سید جمیل نقوی، ایس ایم حسن اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی مرتبہ فہرستوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سید جمیل نقوی صاحب کو مخطوطات کی فہرست سازی سے قریب کی نسبت تھی کیوں کہ نقوی صاحب نے مخطوطات کے بارے میں جو معلومات رقم کی ہیں وہ ان کی دقتِ نظر کا مظہر ہے۔ معین الدین عقیل صاحب نے نقوی مرحوم کی فہرست سے پہلے مختصر تعارف تحریر کیا ہے جو ایس ایم حسن کی فہرست سے تقابل اور نقوی مرحوم کی شخصیت اور دیگر کاموں کے حوالے سے معلوماتی ہے۔ فہرست مذکور کے آخر میں موجود حاشیے اس پر مستزاد ہیں۔

اس تعارف سے پتا چلتا ہے کہ کلکتہ میں موجود ایشیاٹک سوسائٹی میں اردو کے ۲۳۴ مخطوطات موجود ہیں۔ عقیل صاحب تعارف میں لکھتے ہیں کہ 'سید جمیل نقوی متعدد کتابوں کے مصنف اور شاعر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ سے لائبریرین کا امتحان کام یاب کیا اور وہیں یونی ورسٹی لائبریری میں ملازمت شروع کی۔ ۱۹ سال تک وہاں وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس دوران وہ کلکتے چلے گئے جہاں رہ کر ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے سے استفادہ کیا اور اردو مخطوطات کی یہ وضاحتی فہرست ترتیب دی۔ وہاں سے ۱۹۴۵ء میں وہ دہلی چلے گئے جہاں محکمہ تجارت سے وابستہ ہوئے اور پھر قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۷۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۹۹ء کو انتقال کیا۔ ان کی مطبوعات کے نام یہ ہیں: 'کف خاکستر'، 'ارمغانِ جمیل' (نعتیہ کلام)، 'پرچم کا ہلال جگمگایا' (قومی نظمیں)، 'برف کی بجری' (ہائیکو نظمیں)، 'انتخابِ میر' اور 'انتخابِ اصغر' (ص ۵۰)۔

نقوی مرحوم کی اردو مخطوطات کی فہرست اس لیے بھی پُر از معلومات ہے کہ موصوف شعبہ لائبریری سے فارغ التحصیل تھے اور شاعر بھی تھے یعنی نقوی مرحوم کی فہرست کا ایس ایم حسن کی فہرست سے تقابل کیا جائے تو ۳۴ اردو مخطوطات ایسے ہیں جو ایس ایم حسن کی فہرست میں نہیں ملتے۔ فہرستِ نقوی میں ان ۳۴ مخطوطات میں ۲۰ مختلف شاعروں کے دیوان ہیں۔ عقیل صاحب لکھتے ہیں کہ 'جمیل نقوی کی مرتبہ فہرست میں ۵۹ مخطوطات شامل ہیں جب کہ ایس ایم حسن کی فہرست ۳۷ مخطوطات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کے مندرجات

مختلف ہیں لیکن ۲۴ مخطوطات مشترک ہیں' (ص ۴۶)۔

ان دواوین کے بارے فہرست نقوی میں خوب معلومات ملتی ہیں یعنی یہاں نقوی مرحوم نے اپنے میلانِ طبع سے خوب کام لیا ہے۔ان دواوین کے نام یہ ہیں: 'دیوان درد' از خواجہ میر درد دہلوی، 'دیوان ولی' از ولی دکنی (ولی اللہ) (مرقومہ: ۱۴ جمادی الاول ۱۱۴۲ھ)، 'دیوان ولی' از ولی دکنی (مرقومہ: شعبان ۱۵...ھ)، 'دیوان ممنون' از میر نظام الدین ممنون، 'دیوان حسن' از میر حسن، غلام حسن دہلوی، 'دیوان تجلی' از تجلی، 'دیوان رند' از رند دہلوی، 'دیوان واقف' از واقف دہلوی، 'دیوان مخلص' از مخلص مرشد آبادی، 'دیوان انشا' از میر انشاء اللہ خاں، 'دیوان مجرم' از شیخ رحمت اللہ اکبر آبادی مجرم، 'دیوان بقا' از شیخ محمد بقا اللہ بقا، 'دیوان آبرو' از شاہ مبارک آبرو، 'دیوان سودا' از مرزا محمد رفیع سودا، 'دیوان افسوس' از میر شیر علی افسوس (مرقومہ ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۴ء)، 'دیوان افسوس' از میر شیر علی افسوس (مرقومہ یکم جولائی ۱۸۷۱ء)، 'دیوان ولا' از مظہر علی خاں ولا، 'دیوان محبت' از نواب محبت خاں محبت، 'دیوان یقین' از انعام اللہ خاں یقین، 'دیوان قدرت' از شاہ قدرت اللہ دہلوی قدرت، 'دیوان ناجی' از میر محمد شاکر دہلوی ناجی، 'دیوان احسن' از مرزا احسن علی، 'دیوان جہاں' از بنی نرائن جہاں، 'دیوان میر سوز' از سید محمد میر سوز، 'دیوان کبیر' از حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی، 'دیوان میر' از میر تقی میر اور 'دیوان آصف الدولہ' از نواب آصف الدولہ۔

فہرست بھٹا چاریہ اردو مخطوطات کے بارے میں مختصر معلومات کی حامل ہونے کے باوجود تعدادِ مخطوطات کی وجہ سے امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔فہرست مذکور میں حاشیے از ڈاکٹر رفاقت علی شاہد شامل ہیں۔فہرست بھٹا چاریہ میں ۱۲۱۴ اردو مخطوطات ملتے ہیں جب کہ فہرست نقوی میں ۵۹ اور فہرست حسن میں ۳۷ موجود ہیں۔ بھٹا چاریہ نے ان دواوین کے بھی اندراجات فراہم کر دیے ہیں جو دیگر دو فاضل فہرست سازوں سے بہ وجوہ رہ گئے ہیں۔ یہاں ان دواوین وکلیات کے نام تحریر کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں معلومات بھٹا چاریہ نے فراہم کی ہیں: 'دیوان قائم' از قیام الدین قائم (مرقومہ: ۱۲۲۸ء)، 'دیوان پروانہ' از راجا جسونت سنگھ کا کاجی پروانہ (مرقومہ: ۱۲۲۸ء)، 'دیوان فدوی' از سید فضل علی دہلوی (مرقومہ: ۱۲۲۸ء)، 'دیوان شاہ علی گجراتی' از شاہ علی گجراتی (سن ندارد)، 'کلیات جرات' از شیخ قلندر بخش جرات (سن ن)، 'کلیات جعفر زٹلی' از جعفر زٹلی (مرقومہ: ۱۲۰۶ء)، 'دیوان معروف' از نواب

الٰہی بخش خاں (س ن)، 'دیوان برق' از برق لکھنوی (س ن)، 'دیوان مہر' از مہر (س ن)، 'دیوان احمد' از احمد پسر فقیر محمد خان گویا (س ن)، 'دیوان صادق' از صادق (س ن)، 'دیوان نثار' از محمد یار خان نثار (س ن)، 'دیوان راسخ عظیم آبادی' از راسخ (س ن)، 'دیوان حیدر' از حیدر (س ن)، 'دیوان فغاں' از فغاں، 'دیوان قمر' از قمر (س ن)، 'دیوان نصیر' از نصیر (س ن)، 'دیوان شاداں' از شاداں (س ن)۔ فہرست بھٹا چاریہ میں ہندو مذہب کی مقدس کتابوں پر مبنی اردو مخطوطات بھی ملتے ہیں: رامائن اور بھگوت گیتا۔

بھٹا چاریہ کی فہرست میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے مخطوطات کے ساتھ ساتھ نیشنل لائبریری کلکتہ کے اردو مخطوطات کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے اردو مخطوطات دو الگ الگ جگہوں پر موجود ہیں جنھیں سوسائٹی کلکشن اور اردو کلکشن کے نام دیے گئے ہیں۔ سوسائٹی کلکشن میں ۱۳۴ اور اردو کلکشن میں ۸۰ مخطوطات کی اندراجات موجود ہیں۔ بھٹا چاریہ نے اطلاع دی ہے کہ نیشنل لائبریری کے اردو مخطوطات بوہار کلکشن، زکریا کلکشن اور امپیریل کلکشن میں بھی موجود ہیں۔ نیشنل لائبریری میں موجود ان تینوں میں بالترتیب ۵، ۴ اور ۷ مخطوطات کی تفصیل ملتی ہے۔

بوہار کلکشن :اس میں 'دیوان فقیر محمد خان گویا'، 'دیوان جویا'، دیوان فرحت'، کلیات عیشی' اور 'قصہ چہار درویش' کے بارے میں تفصیل ملتی ہے۔ فہرست ساز نے 'دیوان فقیر محمد خان گویا' کی حالت اچھی تحریر کی ہے۔ مخطوطہ خوش خط نستعلیق میں ہے۔ شیخ امام بخش نے تاریخ کہی جو ۱۲۴۱ھ ہے۔ 'دیوان جویا' از کلیات محمد حسین علی خان تخلص جویا کے بارے میں فہرست کا مرتب لکھتا ہے کہ یہ 'نستعلیق میں نہایت صاف اور خوب صورت ہے۔ اس میں حمد، قصیدے، غزلیں، واسوخت، مخمس، رباعیات، ٹھمریاں اور ہولیاں ہیں۔ مخطوطے میں ان رنگوں کے اوراق استعمال ہوئے ہیں: سفید، بادامی، ہلدی مائل، سیاہ اور نیلے آسمانی۔ سیاہ رنگ کے اوراق تقریباً سب پھٹ چکے ہیں۔ 'دیوان فرحت' کے بارے میں مرتب فہرست لکھتا ہے کہ خط شکستہ میں تحریر شدہ یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ 'کلیات عیشی' کے بارے میں رقم ہے کہ یہ طالب علی خان عیشی لکھنوی بن علی بخش کی فارسی اردو کلیات ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۸۲۶ء درج ہے۔ خط شکستہ میں 'قصہ چہار درویش' از میر حسین عطا تخلص تحسین کے بارے میں مرتب فہرست لکھتا ہے کہ اس کے آخر کے چند اوراق کرم خوردہ ہیں اور اس کے

کاتب کا نام نجیب سنگھ ہے۔اسے فروری ۱۸۴۹ء میں رقم کیا گیا تھا۔

زکریا کلکشن :ان اردو مخطوطات کے بارے میں تفصیل فراہم کی گئی ہے:'قصہ رضوان شاہ' از خلیل علی خاں میں عام فہم زبان میں قصے کو قلم بند کیا گیا ہے۔اس کے تعداد صفحات ۲۱۸ درج ہیں۔'قیامت نامہ' کے بارے میں مرتب نے ضروری معلومات اور اس کے آغاز کو بہ طور اقتباس پیش کیا ہے۔'چار گلشن موسوم بہ بہار عشق یعنی قصہ گل وصنوبر' کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ اس مخطوطے کی حالت خراب ہے۔صفحات بیش تر کرم خوردہ ہیں۔'تنبیہہ الغافلین' از بنی نرائن،شاہ رفیع الدین کی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

امپیریل لائبریری :اس میں ان سات اردو مخطوطات کے بارے میں معلومات درج ہیں:'مغل اور اردو' از نواب سید نصیر حسین خاں خیال ولد نواب نوروز حسین خاں عظیم آبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود یہ نسخہ اہم ہے کیوں کہ یہ مصنف کا اصل مسودہ ہے۔نواب خیال نہایت خوش خط تھے اور مسودے کو اشاعت کے لیے صاف کرتے وقت انھوں نے کیا کیا ردو بدل کیا ہے،مسودہ میں موجود ہے۔'ماہ پیکر' کا مخطوطہ کرم خوردہ ہے اس کے کئی صفحات کھل کر الگ الگ ہو گئے ہیں۔ 'طاعون کا پورا دفعیہ' اردو اور انگریزی زبانوں میں ہے۔یہ ۲۸ اردو اور ۴۳ انگریزی صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ تین صفحات پر نقشے ہیں۔ان نقشوں میں بتایا گیا ہے کہ کمروں کو کیسے صاف اور ہوادار رکھا جائے اور روشنی کا انتظام کیا ہو،درج ہے۔'مخزون دستور الہند ویات' از نانک چند خط نستعلیق میں ہے۔مصنف نے اسے کرنل گری کرافٹ صاحب بہادر کمشنر دہلی کو پیش کیا تھا۔'کلیلہ دمنہ' میں مختلف حکایات ہیں۔مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔'ترجمہ الیقین' از جعفر شاہ بن قمر الدین کے صفحات کرم خوردہ ہیں۔فہرست کا مرتب 'تفسیر اردو منظوم' کے عنوان سے موجود مخطوطے کی حالت نہایت خراب اور کرم خوردہ بتاتا ہے۔

☼☼☼

(ج) جنت جہنم اور دوسرے افسانے، مصنّف: اے. خیام، مبصّر: صبا اکرام

اے. خیام کا تعلق برّصغیر میں سن ساٹھ کے بعد جدیدیت کے رجحان کے زیرِ اثر لکھنے والے کہانی کاروں کی اس نسل سے ہے جو بیشتر صورتوں میں 'شب خون' (الٰہ آباد) اور 'اوراق' (سرگودھا) کے پلیٹ فارم سے سامنے آئی تھی۔ آغاز کے دنوں میں تو یہ سرحد کے اُس پار یعنی ہندستان میں تھے مگر جلد ہی جب کراچی آ گئے تو 'اوراق' کے تقریباً ہر شمارے میں ان کی کہانی ضرور شامل ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کپل وستو کا شہزادہ' سامنے آیا تو اس میں بیشتر افسانے ایسے تھے جو 'اوراق' میں شائع ہو چکے تھے۔ دوسرے مجموعے 'خالی ہاتھ' میں بھی اس طرح کے کئی افسانے شامل تھے۔ لہٰذا ان میں سے بیشتر میں علامت، استعارہ اور تکنیک کے تجربے کی آنچ کا بھی احساس ہوتا ہے مگر یہ صورت کرتب بازی والی نہیں، انھوں نے بہت سنجیدگی سے اپنا توازن برقرار رکھا ہے اور کسی گورکھ دھندے کی حدود میں قدم پڑ جانے سے خود کو بچائے رکھا ہے۔

اب ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'جنت جہنم' منظرِ عام پر ہے تو وہ نقوش جو اردو افسانے میں سن اسّی کے بعد تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے نظر آئے تھے زیادہ نکھر گئے ہیں۔ ان کے یہاں اب علامت، استعارہ اور تجرید کی بجائے ہر افسانے میں ایک نیا اشاراتی نظام ہے جو بیانیہ کے نئے زاویوں کو پیش کرتا ہے اور قاری کا ذہن un-said کی گرہیں اس طرح کھولتا کہ اس پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ کسی اُلجھاؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ اس صورت کو بیان کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے:

> ''..... جدیدیوں کو تجربے کا شوق زیادہ تھا اور اس اعتبار سے ابہام کو وہ لوگ بالارادہ بھی اختیار کر لیتے تھے۔ آج کا فن کار تجربے کی طرف اتنا راغب نہیں ہے اور ابہام کو وہ ارادی طور پر اختیار نہیں کرتا۔ اگرچہ ترقی پسندوں جیسی وضاحت اور دو اور دو چار والی منطق کو بھی مسترد وہ کرتا ہے۔''

('جدیدیت آج کے تناظر میں'، شمس الرحمٰن فاروقی، 'شب خون' الٰہ آباد، 1994)

اگر اے. خیام نے بلراج مینرا کے کمپوزیشن سیریز کے انداز میں 'چیستاں' سیریز کے افسانے لکھے تو اس کا جواز بھی موجود تھا۔ ضیاء الحق کی آمریت اور ان کے دورِ حکومت میں اظہارِ رائے پر پابندی کے خلاف آواز اُٹھانے اور قابلِ تعزیر قرار دینے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ اعجاز راہی

اور احمد داؤد جو اس حوالے سے زیادہ vocal تھے، انھوں نے بھی استعاراتی اور اشاراتی طرزِ اظہار اپنے افسانوں میں اپنایا تھا۔ اس ابہام کا جواز صاف نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کے سیریل میں کسی موضوع کو پیش کرنا تکرار کی ایک صورت ہے جو اس کی معنویت ہی کو ختم کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں وہی ہوتا ہے جو بیشتر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں ہوا، یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ موضوع کے طور پر افسانوں میں اس قدر تکرار کا شکار ہوا کہ آخر کار ایک کلیشے (cliche) میں بدل گیا۔ اس کے برعکس جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ہر موضوع کی تکرار کے بعد بھی نئے shades قاری کے ذہن کو منوّر کرتے تھے۔

اے. خیام جب کہانی سنانا چاہتا ہے تو تازگی اور ندرت نہ ہونے کے باوجود موضوع کو اپنے فن، تکنیک اور لفظیات کے سہارے اتنا دل چسپ بنا دیتا ہے کہ قاری کو افسانہ پڑھنے کے بعد ایک طرح کی آسودگی اور سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ خوبی اس کے یہاں 'بے ضرر'، 'دوسری منزل' میں بھی سامنے آئی ہے۔ 'جنت جہنم' مذہبی دہشت گردی کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ میں یہاں چاہوں گا کہ مذہبی دہشت گردی کو بین الاقوامی سطح پر جس طرح پیش کیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو پس پردہ معتوب کرنے کی سازش ہو رہی ہے، اس کی ایک جھلک پیش کر دوں:

> "At the end of the 20th century the world faced a revival of religious fundamentalism as a puzzling development to many who had assumed that the process of secularization was, however uneven, as irreversible one."
>
> "Terrorism", Charles Townshed, Oxford-2011

کینیڈین سیکوریٹی انٹیلی جینس رپورٹ 2000 میں تو صاف صاف اسے "Islamic Religious Extremism" کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔

اے. خیام نے اپنے افسانے میں اس المیے کو اپنی آتما کی گہرائی تک اُتارا ہے اور اسے انجذاب کی کیفیت سے گزارنے کے بعد اتنی ہنرمندی سے کہانی کی بُنت میں شامل کیا ہے کہ بھیڑ چال میں گُم ہو جانے کی بجائے ایک الگ زاویہ سامنے آیا ہے جو تازگی اور اثر آفرینی کو اُجاگر کرتا ہے۔ فرقہ واریت کے نتیجے میں جنم لینے والی دہشت گردی کو بھی اے. حیام نے اپنے افسانے 'غمِ حسین کے سوا' میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اکبر کی کار اُسے نظر نہیں آئی۔ایک ایمبولینس موجود تھی۔اسے غیر متوقع طور پر
کئی قریبی رشتہ دار نظر آئے۔
فاطمہ بے حس وحرکت کھڑی رہی۔
''امی.....'' سکینہ سسک رہی تھی۔
''لو.....اصغر کو سنبھالو.....'' سکینہ کو فاطمہ کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سُنائی
دی۔
''میں نے اپنی باری کر لی.....اب تمھاری باری ہے۔''

(''غمِ حسین کے سوا'')

آزادی کے بعد برّصغیر کے مسلمانوں اور بڑی حد تک سکھوں کو بھی جن جانی مالی نقصانات اور انتہا درجہ ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا اس کی نشانیاں ترقی پسند کہانی کاروں کے افسانوں میں تواتر سے پیش ہوئی ہیں۔تھوڑے عرصے بعد ہی ہندستان میں اقلیتی طبقے یعنی مسلمانوں کو جن مسائل سے گزرنا پڑا وہ تہذیبی ورثے کی زوال پذیری اور خاندانی میراث کی پامالی کا سانحہ تھا۔اے.خیام نے اشاریت کا سہارا لیتے ہوئے اپنی کہانی 'بڑی حویلی' میں اس کی ایک جھلک بہت اثر انگیزی کے ساتھ پیش کی ہے۔افسانہ جوں توں آگے بڑھتا ہے ایک nostalgic فضا شدید ہوتی چلی جاتی ہے۔حویلی کے رکھوالے منشی محبوب الٰہی کا ایک جملہ نقل کر رہا ہوں:

''ملک تو آزاد ہوا شاہد میاں،لیکن میرے گاؤں کو ویران کر گیا۔''

'سگِ زمانہ' فیوڈل کلچر کی عکاسی کرتا ہے جہاں ذاتی مفاد کے لیے عزیز و اقارب کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دینا کوئی غیر اخلاقی عمل نہیں سمجھا جاتا۔معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کے المیے اور مادّی قدروں کے ہمارے معاشرے میں مضبوط ہونے کی جانب ایک پُر اثر اشارہ ہے۔'آشیانہ' اخلاقی اور سماجی قدروں کے بکھراؤ کے نتیجے میں کمزور ہوتے انسانی رشتوں کی کہانی ہے۔موضوع کوئی نیا نہیں۔باپ ماں بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اولڈ پیپلز ہوم پہنچانے والا پُرانا قصّہ ہے مگر خیام نے افسانے کے اختتامیے کو ایک نیا موڑ دے کر اسے کئی گنا اوپر اُٹھا دیا ہے جو قاری کے ذہن پر تادیر قائم رہنے والا ایک نقش چھوڑتا ہے۔

اے.خیام کسی مخصوص نظریے کو اپنے افسانوں میں اُجاگر کرنے کی بجائے نئے تہذیبی مسائل کا شکار جدید عہد کے انسان کی زندگی میں جھانکتا ہے اور تلخ حقائق کو نئے زاویے عطا کرتا ہے۔●●

'بیان میر' اردو کے عظیم غزل گو شاعر میر تقی میر کی شاعری پر منفرد اور اچھوتی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر احمد محفوظ صاحب ہیں جن کا شمار عصرِ حاضر کے معروف ومعتبر میر شناسوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی نگرانی میں میر کے کلیات کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے جسے قومی کونسل نے متعدد مرتبہ شائع کیا ہے۔ ان کے مرتبہ اس کلیاتِ میر کو اہلِ ادب نے معتبر اور مستند مانا ہے۔ اس کلیات کی ترتیب کے دوران پروفیسر احمد محفوظ کو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی نگرانی میں میر کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے، ان کے بارے میں خوب جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالعۂ میر سے ان کا شغف وانہماک گہرا ہوتا گیا۔ اس گہرائی و گیرائی کا مشاہدہ ان کی اس کتاب میں شامل تنقیدی مضامین میں بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ''تذکروں میں محاکمۂ میر''، ''میر کا جہان دیگر''، ''میر تقی میر اور پست وبلند کا مسئلہ''، ''مقدمۂ مزا میر پر ایک نظر''، ''میر کی خیال بندی''، ''میر کے کلام میں عام انسانی صورتِ حال'' اور ''میر کی غزلوں میں ہندستانی تہذیب کے عناصر''۔ ان مضامین کے عنوانات ہی سے اس کی انفرادیت اور اس کے اچھوتے پن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

میر تقی میر کے بارے میں یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک زمانے تک انھیں درد وغم اور یاس وقنوطیت کا شاعر کہا جاتا رہا اور اردو تنقید ان کی شاعری میں درد وخستگی، سوز و گداز، انفعالیت، سلاست وروانی، سادگی وصفائی اور برجستگی جیسی صفات تلاش کرنے تک محدود رہی۔ یہ صفات اور خوبیاں ان کی شاعری میں ضرور موجود ہیں مگر ان کے علاوہ بھی بہت سی دوسری خوبیاں ان کی شاعری میں موجود تھیں جسے اجاگر کرنے سے اردو تنقید قاصر رہی۔ دراصل تذکروں نے جس میر تنقید کی بنیاد ڈالی، آگے کی ساری تنقید کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کی گئی۔ حالاں کہ یہ بات واضح ہے کہ تذکروں میں میر کی شاعری کے حوالے سے معتبر اور اچھے تنقیدی بیانات بھی ملتے ہیں اور گمراہ کن بیانات بھی۔ روایتی میر تنقید میں ان گمراہ کن بیانات کی گونج صاف سُنائی دیتی ہے۔ پہلی مرتبہ اس روش کو مشہور ومعتبر میر شناس شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے توڑا۔ ان کی کتاب ''شعر شور انگیز'' نے مطالعۂ میر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

میر شناسی میں نواب جعفر علی خاں اثر کی کاوش کو بھی قابلِ قدر کہا جا سکتا ہے۔ فاروقی صاحب کے بعد اگر کسی نے میر کے افہام و تفہیم کی سنجیدہ کوشش کی ہے تو وہ پروفیسر احمد محفوظ ہیں۔

ان کی زیرِ تبصرہ کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ میر کی شاعری کے تعلق سے تنقید کی جو پرانی روش ہے یا میر کے تعلق سے رواروی میں جو بات کرنے کا عام رجحان ہے اس سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے میر کی شاعری کے حوالے سے ٹھوس بنیادوں پر گفتگو کی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گہری تنقیدی بصیرت سے میر کی شاعری کے نئے پہلوؤں کو دریافت کیا ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کلامِ میر کی کیفیت و کمیت پر بھی بڑی معنی خیز بحث کی ہے۔ اس کتاب میں شامل پہلے مضمون ''تذکروں میں محاکمۂ میر'' میں پروفیسر احمد محفوظ نے میر کی شاعری کے تعلق سے تذکروں کی تنقیدی نوعیت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے اس حقیقت کو اُجاگر کیا ہے کہ تذکروں میں میر کی شاعری کی کن خوبیوں کی طرف نشان دہی کی گئی ہے اور تذکروں کی میر تنقید سے ہمیں کس حد تک میر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے مضمون ''میر کا جہانِ دیگر'' میں انھوں نے کلیاتِ میر کی دوسری جلد مرتب کرنے کی تفصیلات بتائی ہیں۔ اس جلد میں میر کی غزلوں کے علاوہ ان کے یہاں پائی جانے والی دوسری کلاسیکی اصناف جیسے نعت، منقبت، قصیدہ، مثنوی، ہجویات، سلام، واسوخت، مثلث، مخمس، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ شامل ہیں۔ میر کے ان کلام کو تدوین کرنے میں مرتبِ متن کو کن نسخوں کا سہارا لینا پڑا اور جہاں مختلف نسخوں کی مدد سے بھی متن کی تصحیح کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا تو وہاں انھوں نے کن تحقیقی طریقۂ کار کو اختیار کیا، ان تمام امور کا ذکر انھوں نے تفصیلی انداز میں کیا ہے۔ میر تنقید کا اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ اس نے میر کی غزلوں اور وہ بھی منتخب غزلوں کو موضوعِ بحث تو بنایا مگر ان کے یہاں پائی جانے والی دوسری کلاسیکی اصناف کو یا تو نظر انداز کر دیا یا ان پر توجہ نہیں دی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے بڑی سنجیدگی سے اس جانب ہماری توجہ مبذول کی ہے۔ انھوں نے میر کے اس پہلو پر جس مدلل انداز میں بحث کی ہے اس سے ان کی شاعرانہ عظمت اور پُر زور طریقے سے سامنے آتی ہے۔ تیسرے مضمون ''میر تقی میر اور پست و بلند کا مسئلہ'' میں میر کے تعلق سے ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ تذکروں میں میر کے تعلق سے یہ بات راہ پا گئی کہ ان کا پست کلام حد درجہ پست ہے اور ان کا بلند کلام بے انتہا بلند ہے۔ میر کے تعلق سے

یہ بیان کس نے دیا اور کہاں سے لیا گیا اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں، ان باتوں پر تحقیقی انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے بڑی تلاش وجستجو کے بعد یہ بات بتائی ہے کہ اصل بیان یہ ہے کہ میر کا کچھ کلام تھوڑا پست ہے۔ چوتھے مضمون ''مقدمۂ مزامیر پر ایک نظر'' میں انھوں نے نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے انتخابِ میر ''مزامیر'' کے مقدمہ کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی میر تنقید کا جائزہ لیا ہے۔ جعفر علی خاں اثر اپنے پیش رو ناقدین سے قدرے ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی میر تنقید مکمل طور پر تو قابلِ اطمینان نہیں کہی جاسکتی ہے مگر ماقبل تنقید سے بہتر ضرور ہے۔

اس کتاب میں میر کی شاعری کے تعلق سے ایک بالکل اچھوتے اور نئے انداز کا مضمون بعنوان ''میر کی خیال بندی'' شامل ہے۔ میر کی غزلوں میں خیال بندی کے وصف کی طرف باضابطہ انداز میں سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے نشان دہی کی۔ خیال بندی مضمون آفرینی ہی کے عالم کی چیز ہے مگر یہ اس سے ایک قدم آگے ہے۔ شاعر اپنی قوتِ متخیّلہ کا غیر معمولی استعمال کر کے موجود اور مروّج مضامین میں مزید نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جسے خیال بندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کی غیر معمولی مہارتِ سخن اور بیان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وصف غالب کی غزلوں میں بہت زیادہ ہے۔ میر کے یہاں بھی یہ وصف اعلا صورتوں میں موجود ہے مگر میر تنقید اپنی سہل پسندی کے باعث اس اہم وصف کو اُجاگر کرنے سے قاصر رہی۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے بعد احمد محفوظ نے کلامِ میر کے اس پہلو پر بڑے سلیقے سے مبسوط ومفصل گفتگو کی ہے۔ میر کی شاعری کے حوالے سے یہ انتہائی معنی خیز اور فکر انگیز مضمون ہے۔ اس کتاب میں ایک مضمون ''میر کے کلام میں عام انسانی صورتِ حال'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں مصنف نے کلامِ میر کے انداز وخصوصیات کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ میر اپنی غزلوں میں باتوں کو اکثر وبیشتر ہماری سطح پر لا کر بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام انسان ان کی غزلوں سے قربت وہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ اسی خصوصیت کو ان کے کلام میں عام انسانی صورتِ حال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میر کا خاص انداز تھا جس سے وہ زیادہ سروکار رکھتے تھے اور جسے وہ اکثر بروے کار لاتے تھے۔ یہ خصوصیت، کوئی فنی خصوصیت تو نہیں ہے، ہاں کلامِ میر کی ایک خصوصیت ضرور ہے جسے مصنف نے مثالوں کے ذریعے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون بعنوان ''میر کی غزلوں میں

ہندستانی تہذیب کے عناصر'' ہے۔اس میں مصنف نے اختصار سے میر کی غزلوں میں موجود ہندستانی تہذیب کے عناصر کو دریافت کیا ہے اور تہذیبی سیاق میں ان کی غزلوں کی معنویت کو اُجاگر کیا ہے۔

پروفیسر احمد محفوظ صاحب کی اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کا مطالعہ بڑے شغف وانہماک اور گیرائی سے کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میر پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ ان کی شاعری میں نئے پہلوؤں اور گوشوں کو دریافت کرنے میں کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔میر کی شاعری پر انھوں نے بڑی محنت ولگن سے اور کڑی تلاش اور چھان بین کے بعد لکھا ہے۔میر پر ان کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں میں جو وزن ووقار اور اعتبار واعتماد دکھائی دیتا ہے،اس نے انھیں ممتاز ومستند میر ناقدین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور معروف ومعتبر میر شناسوں کی صف میں نمایاں مقام کا حامل بنا دیا ہے۔ان کی یہ کتاب ''بیان میر'' میر کی شاعری پر مختصر مگر انتہائی جامع ہے۔''شعر شور انگیز'' کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس میں میر کی شاعری کے نئے نئے پہلوؤں اور گوشوں پر بڑے سلیقے سے سیر حاصل اور معنی خیز گفتگو کی گئی ہے۔اس کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب متعدد بار پڑھے جانے کا مطالبہ کرتی ہے اور یونی ورسیٹیوں کے نصاب میں ثانوی ماخذ کے طور پر شامل کیے جانے کی ضرورت کا احساس بھی دلاتی ہے۔یہ کتاب میریات میں ایک اہم اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ، مطالعۂ میر میں ضرور ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔

❑❑❑

اس شمارے کے اہل قلم☆

محترمہ سیما انجم	B-1/602, Punjabi Saudagran Apt. Plot NO.8, Mayur Vihar Phase-1 Ext. Delhi-110091
پروفیسر شمیم حنفی	114-B, Zakir Bagh, Okhla Road, New Delhi-110025
ڈاکٹر اسلم پرویز	191, Mohalla Qabristan, Turkaman Gate, Delhi-110006
جناب مجتبیٰ حسین	502, Maphar Regency, AC Guard, Hyderabad-500004
پروفیسر عتیق اللہ	C-125/1, 1st Floor, Basera Apt. Noor Nagar Ext. Jamia Nagar, New Delhi-110025
جناب رضا علی عابدی	BBC, Bush House, London (UK)
ڈاکٹر فاروق بخشی	Mohan Lal Sukhadia University, Udaipur (Rajasthan)
ڈاکٹر ٹی.آر.رینا	F-237, Lower Hari Singh Nagar, Rehari Colony, Jammu-180005, E-mail: trrainaraina@yahoo.com
ڈاکٹر سرورالہدیٰ	Dept. Of Urdu, Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar New Delhi-110025, E-mail: sarwar103@gmail.com
چودھری شرف الدین	Nematullah Building, Nematullah Road. Lucknow (UP)
جناب محضر رضا	161/21, 1st Floor, Jogabai Main Road, Jamia Nagar New Delhi-110025, E-mail: mahzar@gmail.com
جناب ساجد ذکی فہمی	E-101/A, Hari Kothi lane, Abul Fazal Enclave-1 Jamia Nagar, New Delhi-25, E-mail: sajidzakifahmi@gmail.com
جناب ضیاءاللہ انور	253, Satluj Hostel, JNU, Delhi-110067
ڈاکٹر جاوید رحمانی	401/2-A, Budh Vihar, New Delhi-110067, E-mail: rahmanijnu@gmail.com
جناب ٹوم اولٹر	21, Methodist Centre, 4th Floor, YMCA Road, Bombay Central Bombay-400008, E-mail: kkalsi1@rediffmail.com
پروفیسر ظفر احمد صدیقی	Deptt. of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh
ڈاکٹر شیو یاتر پاٹھی	Department of Urdu, Bareilly Collage, Bareilly, UP
چودھری لیاقت علی	Pakistan
ڈاکٹر نریش	169, Sector 17, Panchkula, Haryana
ڈاکٹر جاوید احمد خورشید	Research Scholar, Islamic Research Academy, Karachi, Pakistan E-mail: jawedahmedkhursheed@gmail.com
جناب صبا اکرام	Plot No. 11/26, Sector 20, Korangi Industrial Area, Karachi, Pakistan, E-mail: sabaekram@hotmail.com
جناب احمد علی جوہر	Room No 236-E, Brahamputra Hostel, J.N.U. New Delhi-110067 E-ahmad2011jnu@gmail.com

☆ موجودہ شمارے میں جس ترتیب سے مضامین شائع ہوئے ہیں اُسی ترتیب سے اہلِ قلم کی یہ فہرست بھی تیار کی گئی ہے۔

دلّی کی
درگاہ شاہِ مرداں

خلیق انجم

- ڈاکٹر خلیق انجم کے علم و مطالعے کا میدان بہت وسیع ہے۔ وہ اردو کے صفِ اوّل کے ادیب، محقق اور متنی نقاد ہیں۔ غالبؔ اور دلّی سے اُن کی دل چسپی غیر معمولی اور اٹوٹ رہی ہے۔
- ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب 'دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں' میں کربلا اور شاہِ مرداں کی مختصر تاریخ بیان کر کے اس کی عمارتوں اور اس میں مدفون بزرگوں اور اُن کی قبروں کے احوال پر بہت ہی جامع روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب درگاہ شاہِ مرداں پر ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔
- اس کتاب کے اب تک تین اڈیشن دہلی اردو اکادمی سے شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب چوں کہ بہت دنوں سے کم یاب تھی، اس لیے، اب اِس کا چوتھا اڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔

ضخامت: ۱۵۰ صفحات ـــــ قیمت: ۲۰۰/روپے

URDU ADAB

Quarterly

Price: 75/-

RNI NO. 13640/57
ISSN: 0042-1057
Vol. 60-61
Combinded Issue: 240-41
Date of Publication:Feb. 2017

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar,212-Rouse Avenue
New Delhi - 110002

October-December2016, January-March 2017

ڈاکٹر خلیق انجم، اپنی اہلیہ پروفیسر موہنی انجم کے ساتھ

Printed and published by Abdul Bari on behalf of the Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002 and printed at Asila Offset Printers
1307-08. Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-110002
Editor: Dr Ather Farouqui, E-mail: farouqui@yahoo.com
E-mail: urduadabquarterly@gmail.com, Ph: 0091-11-23237722, 23237733